ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ
سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء

اسلام میں غلامی کی حقیقت - اسلام کا اقتصادی نظام - قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ -
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام - سوشلزم کی بنیادی حقیقت -

سنہ ۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام - اخلاق و فلسفۂ اخلاق - فہم قرآن - تاریخِ ملت حصہ اول 'نبی عربی صلعم' - صراطِ مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اوّل - وحی الٰہی - جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول -

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال - تاریخِ ملت حصہ دوم 'خلافتِ راشدہ' -

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اوّل - اسلام کا نظامِ حکومت - سلسلہ - تاریخِ ملت حصہ سوم 'خلافتِ بنی امیہ'

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم - لغات القرآن جلد دوم - مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم - قرآن اور تصوف - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کیے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اوّل - خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ - جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو -

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت - مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم - حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ -

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم - تاریخِ ملت حصہ چہارم 'خلافتِ ہسپانیہ' - تاریخِ ملت حصہ پنجم 'خلافتِ عباسیہ اول'

سنہ ۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخِ ملت حصہ ششم 'خلافتِ عباسیہ دوم' بصائر -

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخِ ملت حصہ ہفتم 'تاریخِ مصر و مغربِ اقصیٰ' - تدوینِ قرآن - اسلام کا نظامِ مساجد -
اشاعتِ اسلام، یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا -

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم - عرب اور اسلام - تاریخِ ملت حصہ ہشتم 'خلافتِ عثمانیہ' جارج برنارڈ شا -

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخِ اسلام پر ایک طائرانہ نظر - فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو از سرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے - کتابتِ حدیث -

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخِ مشائخ چشت - قرآن اور تعمیرِ سیرت - مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ -

برہان

شمارہ ۱	صفر ۱۳۹۹ھ مطابق جنوری ۱۹۷۹ء	جلد ۸۲

فہرست مضامین

نظرات

افسوس ہے پچھلے دنوں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کا کم و بیش پچاسی برس کی عمر میں جامعہ نگر نئی دہلی میں انتقال ہوگیا، مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے ساتھ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اون چند اولین معماروں میں سے تھے جنھوں نے اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود باہم عہد کیا تھا وہ گورنمنٹ کی یا کسی اور ادارہ کی بڑی سے بڑی تنخواہ کی نوکری قبول نہیں کرینگے اور ایک قلیل مشاہرہ پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خدمت کرینگے، چنانچہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب جرمنی سے فلسفہ میں پی ایچ۔ ڈی کرنے کے بعد ہندوستان واپس آئے تو ایک بہت قلیل مشاہرہ پر اپنے آپ کو جامعہ کی خدمت کیلئے وقف کردیا، اس زمانہ میں وہ فلسفہ کا درس دیتے اور انتظامی امور میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے دست راست بنے رہے، مرحوم اگرچہ فلسفہ کے ڈاکٹر تھے، لیکن اردو و فارسی شعروادب سیاسیات، تعلیمات و اخلاقیات، ان سب کا مطالعہ نہایت وسیع اور تصنیف تالیف اور ترجمہ کا ذوق اعلیٰ اور پاکیزہ تھا، چنانچہ انھوں نے ہر موضوع پر لکھا اور بہت خوب لکھا، اس حیثیت سے وہ برصغیر کے بلند پایہ مصنف و مترجم تھے، اون کا اسلوب تحریر بڑا شگفتہ اور موثر تھا۔ ادھر گذشتہ چند برس سے انھوں نے اسلام اور عصر جدید سوسائٹی، کے نام سے ایک ادارہ قائم کر رکھا تھا جس کے وہ خود سکریٹری تھے اور اس ادارہ کی طرف سے انگریزی اور اردو میں جو دو سہ ماہی رسالے شائع ہوتے تھے اون کے اڈیٹر تھے، اسلام اور عصر جدید (اردو) میں انھوں نے جو اداریے لکھے سنجیدہ طبقہ میں بہت مقبول ہوئے؛ اور اون کا ایک مجموعہ کتابی شکل میں شائع ہوگیا۔ اخلاق و عادات کے اعتبار سے بڑے پایہ کے بزرگ اور جامعہ کی زندگی کا نمونہ تھے، اون کی فکر متوازن تھی۔ سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔

طبیعت مرنجاں ومرنج تھی، شعر بھی کہتے تھے مگر کم، وہ پرانی نسل کے ارباب قلم کی آبرو اور نئی نسل کے لیے مینارۂ روشنی تھے، دو تین برس سے صحت بہت گر گئی تھی، آئے دن بیمار رہنے لگے تھے آخر وقت موعود آپہونچا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت وبخشش کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔

مسز اندرا گاندھی پارلیمنٹ کے فیصلہ کے مطابق جیل گئیں اور اُن کی کانگریس کے فیصلہ کے مطابق ہزاروں آدمیوں نے اپنے آپ کو جیل کے لئے پیش کیا اور وہ بھی جیل گئے، یہ جیل کیا تھی؟ چند روز کا ایک کھیل اور تفریح تھی۔ اس سلسلہ میں ہم کو یہ دیکھکر سخت افسوس اور ملال ہوا کہ اُن جیل جانیوالوں میں ایک معقول تعداد مسلمانوں کی بھی تھی ابھی کچھ زیادہ دنوں کی بات نہیں ہے، امرجنسی کے دنوں میں ترکمان گیٹ دہلی میں جو ہولناک قیامت گذری تھی وہ مسلمانوں پر ہی گذری تھی۔ پھر دہلی۔ ہریانہ اور مغربی اترپردیش میں تعقیم (Sterlisation) کی نہایت سخت اور تند وتیز باد صرصر چلی تو اوس کا نشانہ بھی زیادہ تر مسلمان ہی تھے، اس کے نتیجہ میں ہزاروں مسلمان عورتیں ہمیشہ کے لئے بانجھ ہو گئیں، شادی شدہ تو درکنار سینکڑوں غیر شادی شدہ نوجوان ناکارہ بن گئے، کتنے ہی لوگ آپریشن کے اثر سے مرگئے، دہانوں کا یہ عالم تھا کہ سن رسیدہ اور بوڑھے لوگوں پر بھی عمل تعقیم کیا گیا، خوف اور دہشت کا حال یہ تھا کہ ہریانہ کے علاقہ میں مسلمانوں نے بس میں سفر کرنا ترک کر دیا تھا اور ہزاروں مسجدیں تھیں جن میں نمازوں کے اندر باضابطہ دعائے قنوت پڑھی جاتی تھی، بعض اشخاص نے ذاتی طور پر اور مختلف جماعتوں کے وفود نے اجتماعی طور پر وزیر اعظم سے ملاقات کر کے اون کو اس صورت حال کی طرف متوجہ کیا لیکن اون پر کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ ناکام ونامراد واپس آگئے۔

مسز اندرا گاندھی نے اپنے دور حکومت میں جو عظیم الشان سیاسی کارنامے انجام دیئے ہیں ہم نے انھیں صفحات میں اون کا برملا اعتراف کیا ہے، ساتھ ہی امرجنسی کے زمانہ میں جو بعض اچھی چیزیں ہوئیں، ہم نے اون کی بھی داد دی ہے، لیکن اس سے انکار نہیں

کیا جا سکتا کہ اس زمانہ میں پریس کی زبان پر پہرے بیٹھا دیئے گئے، تقریر و تحریر کی آزادی سلب کر لی گئی، شہری حقوق پر قدغن ہو گئی، دستور میں نامناسب ترمیمات ہوئیں اور ان سب سے مسز اندرا گاندھی کی جو تصویر ابھر کر سامنے آئی وہ یہ تھی کہ وہ حد درجہ خود سر، بڑی ضدی ہٹ کی پوری، جاہ طلب اور اقتدار پسند ہیں۔ نیز یہ کہ انہیں من مانی کرنے میں کسی ضابطہ، قانون اور دستور کا لحاظ نہیں رہتا، یہ احساس عام اور ملک گیر تھا۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ مارچ ۱۹۷۷ء کے پارلیمنٹ کے انتخاب میں ان کی حکومت کا تختہ الٹ گیا اور ملک میں ایک ایسا انقلاب پیدا ہوا جو اپنی نظیر آپ تھا۔

اسلام کے ایک طالب علم کے لئے یہ سب کچھ کیا تھا؟ قرآن کے قانون مکافات عمل کے مطابق اپنے کئے کی سزا اور اپنے جرائم کی پاداش تھی، عربی کی زبان میں اس کو اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ امرجنسی کے زمانہ کے گناہوں اور بدعنوانیوں کے بدلہ اور انتقام میں قہر و غضب خداوندی اس انقلاب کی شکل میں نمودار ہوا۔ اس بنا پر جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کا فرض تھا کہ وہ اس انقلاب کو قرآن مجید کے قانون مکافات عمل کا ایک مظاہرہ سمجھتے اور ان لوگوں کے ساتھ کسی قسم کی کوئی ہمدردی نہ رکھتے جو اس قانون کے مطابق اسی وقت عذاب الٰہی میں مبتلا ہیں، قرآن مجید میں ارشاد غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کا یہی منشا اور مفاد ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ جن مسلمانوں نے مسز اندرا گاندھی کے ساتھ جیل جا کر ان کے ساتھ ہمدردی اور وفاداری کا مظاہرہ کیا ہے انہوں نے اسلامی حمیت و غیرت، اور ملی خودداری و عزت نفس کا مذاق اڑایا اور اس کی توہین کی ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

خواجہ معین الدین سجزی اجمیریؒ تاریخ کی روشنی میں

از: جناب ڈاکٹر نثار احمد فاروقی - ریڈر شعبۂ عربی دلی یونیورسٹی دہلیؒ

(۲)

سیرالاولیاء نے آپ کے کچھ ملفوظات بھی درج کیے ہیں۔ خواجہ بزرگ نے فرمایا کہ حق کو پہچاننے کی علامت خلق سے کنارہ کشی ہے، اور معرفت میں خاموش رہنا ہے۔ اور فرمایا کہ جب ہم نے عالم ظاہر سے نکل کر نگاہ کی تو عاشق، معشوق وعشق کو ایک ہی پایا یعنی عالم توحید میں وحدت ہی وحدت ہے۔

اور فرمایا کہ حاجی اپنے جسم (قالب) سے خانۂ کعبہ کا طواف کرتے ہیں مگر جو عارف ہیں وہ اپنے دل (قلب) سے عرش اور حجاب عظمت کے گرد طواف کرتے ہیں اور رب کعبہ کی رویت کے طالب ہوتے ہیں۔ اور فرمایا کہ شقاوت کی نشانی یہ ہے کہ گناہ کرے اور پھر بھی مقبولیت کی امید رکھے۔ فرمایا کہ قیامت کے دن خداوند تعالیٰ فرشتوں کو فرمان دے گا کہ دوزخ کو وہاں مار سے باہر نکالیں۔ پھر اُسے ہنکایا جائے گا پھر وہ ایک پھونک مارے گا تو سارا میدانِ حشر دھوئیں سے اٹ جائے گا۔ اُس دن کے عذاب سے جو اپنے تئیں بچانا چاہے اُسے وہ عبادت کرنی چاہیئے جس سے بہتر عبادت اللہ کے نزدیک اور کوئی نہ ہو۔ لوگوں نے پوچھا کہ وہ کیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ وہ عبادت ہے بے کسوں کی فریاد سننا، حاجت مندوں کی

حاجت روائی کرنا اور بھوکے کو کھانا کھلانا۔ اور فرمایا کہ جس میں یہ تین خصلتیں ہوں سمجھ لو کہ وہ بے شک اللہ کا دوست ہے ایک دریا کی سی سخاوت دوسرے آفتاب کی سی شفقت تیسرے زمین کی سی تواضع۔"

سیر الاولیاء کی تالیف فیروز تغلق کے زمانے میں ہوئی ہے اور اس کے آخر میں جو ایک تاریخ درج ہے جس سے فیروز شاہ تغلق کی تاریخ وفات ۷۹۰ھ برآمد ہوتی ہے اس سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ امیر خورد اس وقت تک زندہ تھے اور انھوں نے کتاب کی تالیف سے فارغ ہونے کے بعد بھی ۲۵۔۳۰ برس تک اس پر نظر ثانی و اضافے کا کام جاری رکھا ہے اس پر نگاہ کیجیے تو سیر الاولیاء میں جو کچھ ہے وہ بھی ہم عصر بیان نہیں ہے اور خواجۂ بزرگ کے وصال سے تقریباً سوا سو برس کے بعد لکھا گیا ہے۔

میری تحقیق کے مطابق حضرت خواجۂ معین الدین چشتی علیہ الرحمۃ کے حالات و ملفوظات میں سب سے قدیم اور سب سے زیادہ اہم ماخذ "سرور الصدور و نور البدور" ہے جو آج تک نہیں چھپی ہے اور جس کے قلمی نسخے بھی اب ساری دنیا میں صرف دو تین ہی باقی رہ گئے ہیں۔ حضرت خواجہ بزرگ ؒ سے لاکھوں انسانوں کو فیض پہنچا اور آج بھی اسی طرح جاری ہے اور آپ کی حیاتِ ظاہری کے زمانے میں ہزارہا انسان بیعت ارادت کے شرف سے سعادت اندوز ہوئے مگر آپ کے خلفاء میں صرف تین نام ہی ملتے ہیں۔ خلیفۂ اول حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمۃ ہیں جن کا انتقال اپنے پیر و مرشد کی حیات ہی میں ہو گیا تھا دوسری خلافت خواجۂ بزرگ اور قطب صاحب دونوں نے مل کر حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر علیہ الرحمۃ کو دی تھی، لیکن بابا صاحب کو خلافت اولی حضرت قطب صاحب سے پہنچی تھی، اس لیے آپ ان کے ہی جانشین اور خلیفہ مانے جاتے ہیں۔ تیسری خلافت سلطان التارکین ابو احمد شیخ حمید الدین بن محمد سوالی ناگوری علیہ الرحمۃ کو ملی۔ یہ میدانِ ترک و تجرید کے ایسے یکہ تاز تھے کہ خود خواجۂ بزرگ نے انھیں "سلطان

التارکین" لقب مرحمت فرمایا تھا۔ آپ نے طویل عمر پائی اور ۹۔ ربیع الآخر ۶۷۳ھ میں وصال ہوا مزار مبارک ناگور میں مصدر فیوض و مرجع خلائق ہے۔

شیخ حمید الدین ناگوری فرمایا کرتے تھے کہ "اول مولودے کہ بعد از فتح دہلی در خانہ مسلمانان آمد منم "۔ اور جیسا کہ ہم نے ابتدا میں ذکر کیا دہلی کی فتح قطب الدین ایبک کے ہاتھوں ۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء) میں ہوئی اور یہی شیخ ناگوری کی ولادت کا سنہ ہے اس حساب سے انھوں نے تقریباً ۸۴ سال کی عمر پائی۔ شیخ ناگوری عالم اور صاحب تصانیف بزرگ تھے ان کی کتابیں حضرت نظام الدین اولیاء کے زیر مطالعہ رہتی تھیں اور انھوں نے کتابوں کے بعض اقتباسات اپنے قلم مبارک سے نقل کر رکھے تھے جنھیں مؤلف سیر الاولیاء نے بھی اخذ کیا ہے۔ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے "اخبار الاخیار" میں شیخ ناگوری کی تصانیف کے بعض اقتباسات درج کیے ہیں اور یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء سے اُن کی ملاقات ہوئی ہوگی شیخ ناگوری کے پاس دو طناب زمین تھی جس میں اپنے ہاتھ سے تخم ریزی کرتے تھے اور اُس کی پیداوار سے اپنا اور اپنے کنبے کا پیٹ پالتے تھے۔ ان کے فرزند شیخ عزیز الدین تھے جن کے تین بیٹے ہوئے۔ شیخ وحید الدین ۷۲۴ھ (۱۳۲۴ء) میں انتقال فرما گئے تھے دوسرے شیخ نجیب الدین ابراہیم تھے انھوں نے دہلی جاکر حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں بھی کچھ وقت گذارا تھا اور اُن سے استفادہ کیا تھا۔ کہتے تھے:

"ایک دن میں شیخ نظام الدین رح کی خدمت میں گیا ہوا تھا۔ ایک بوڑھے مولوی صاحب بڑی سی پگڑی باندھے ہوئے آئے اور شیخ کی خدمت میں بیٹھ گئے۔ کہنے لگے حضرت آخر قاضی عالم کو یہ قبولیت کہاں سے نصیب ہوئی ہے۔ ہم یہاں سرائے میں پڑے رہتے ہیں کوئی پوچھتا بھی نہیں اور وہ جیسے ہی آتے ہیں لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور اعزاز و اکرام بھی کرتے ہیں آج ہی

ایسا ہوا کہ فوراً اُنھیں آگے آگے لے گئے خوب نذریں ملیں اور اعزاز واکرام الگ رہا۔

حضرت نظام الدین خاموشی سے مولوی صاحب کی گفتگو سنتے رہے اور کچھ نہیں فرمایا۔ پھر وہ مولوی صاحب خود ہی کہنے لگے میں نے سنا ہے کہ ناگور میں کوئی پیر تھے ان کا نام شیخ حمید الدین تھا یہ قاضی عالم ان کے نظر یافتہ ہیں۔ جب مولوی صاحب نے یہ جملہ کہا تو حضرت نظام الدین نے میری طرف اشارہ کیا کہ یہ صاحب اُنھیں کے پوتے ہیں! مولوی صاحب نے اٹھ کر میرے قدموں میں سر رکھ دیا۔

شیخ عزیز الدین کے سب سے چھوٹے بیٹے شیخ فرید الدین چاک پران بھی حضرت نظام الدین اولیاء کے ہم عصر تھے۔ انھوں نے ایک بار صفر ۷۲۹ھ (دسمبر ۱۳۲۸ء) کی ایک مجلس میں فرمایا کہ میں ۷۷ سال سے وعظ کہہ رہا ہوں اور پہلی بار سات سال کی عمر میں منبر پر قدم رکھا تھا اس حساب سے ۷۲۹ھ میں آپ کی عمر ۸۴ برس کی ہوئی اور ولادت کا سنہ ۶۴۵ھ (۱۲۴۷ء) تسلیم کیا جائے گا۔ اُن کے والد شیخ عزیز الدین کا انتقال ۶۶۲ھ اور ۶۷۷ کے درمیان کسی وقت ہوا۔

شیخ فرید الدین ناگوری دہلی آتے رہتے تھے اور آخر عمر میں یہیں آکر بس گئے تھے۔ اُن کا انتقال ۷۳۴ھ (۱۳۳۳ء) میں حضرت نظام الدین اولیاء کے وصال سے نو سال کے بعد ہوا۔ آپ کی زندگی کے آخری ایام میں ۷۲۹ھ اور ۷۳۴ھ کے مابین آپ کی مجالس اور ملفوظات قلمبند کئے گئے جس میں آپ نے اپنے دادا شیخ حمید الدین ناگوری کے ملفوظات بھی بیان فرمائے ہیں اور اسی کا نام "سرور الصدور و نور البدور" ہے اس کا ایک قلمی نسخہ جھنجھنوں کے حضرت شاہ نجم الدین صوفی کی خانقاہ میں تھا جس کی ایک نقل ۱۳۰۱ھ میں تیار کی گئی اور وہ نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے

جواب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں محفوظ کر دیا گیا یہ ۲۵۹ اوراق کا نسخہ ہے اور اس کا ایک تہائی حصہ "سرور الصدور" پر مشتمل ہے باقی دو تہائی کتاب میں شیخ حمید الدین صوفی، شیخ عزیز الدین اور شیخ فرید الدین ناگوری علیہ الرحمۃ کے مکتوبات اور رسائل وغیرہ ہیں اور ان میں بھی بہت کارآمد مواد موجود ہے۔

ان مکتوبات و رسائل سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ فرید الدین صوفی پہلی بار صفر ۶۸۱ھ (اپریل ۱۲۸۲ء) میں دہلی آئے تھے اور یہاں سے انھوں نے اپنے بھائی شیخ نجیب الدین ابراہیم کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ حضرت نظام الدین شیخ وقت ہیں تم جب بھی مجھے خط لکھو، اپنی اور تمام اعزا کی جانب سے اُن کی خدمت میں سلام ضرور لکھنا اس میں ہرگز کوتاہی نہ ہو۔ "در مکتوبات کہ ازاں طرف بفرستند برائے شیخ الوقت شیخ نظام الملۃ والدین سلام بنویسند واز زبان یاران جملہ بجانب او سلام بنویسند تقصیر نکنند مرد صاحب دولت در بلدہ دہلی جز او را نیافتم اوصل اللّٰہُ بَرَکَاتِ أنفاسہ اِلیٰ کافۃِ المُسْلِمِین"

حضرت نظام الدین اولیاء اُن سے ملاقات کرنے کے لئے دو بار بنفسِ نفیس تشریف لے گئے اور ان کا وعظ سننے کا اشتیاق بھی ظاہر کیا۔ جس حجرے میں یہ ٹھہرے ہوئے تھے اسے دیکھ کر بہت حیرت کا اظہار فرمایا کہ آپ اس تنگ و تاریک حجرے میں رہ کیسے رہے ہیں؛ پھر غیاث پور جاکر اپنے ایک خادم محمد صوفی کو بھیجا کہ وہ شیخ فرید الدین کا سامان لے آئے اور اُن سے کہے کہ میرے حجرے کے اوپر اتنی جگہ ہے کہ آپ وہاں آرام سے ٹھہر سکتے ہیں۔ شہر میں جہاں کہیں حضرت نظام الدین کو بلایا جاتا تھا آپ کہلا بھیجتے تھے کہ شیخ فرید ناگوری بھی میرے ساتھ آئیں گے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

شیخ وقت شیخ نظام الدین سلمہ اللہ	"شیخ وقت شیخ نظام الدین سلمہ اللہ
تعالیٰ وعظ کا بہت تقاضا کرتے ہیں۔	تعالیٰ بسیار تقاضائے تذکیر میکند

وایں ضعیف ہیچ الطاف وکرم او از جملہ
گذشتہ است دفع نمیتوانم گفت۔
ان شاء اللہ تعالیٰ باحسن الاحوال میسر
گردد شیخ نظام الدین فرمودہ بودند
و دو بار بریں ضعیف آمدہ بود در نہایت
تعجب کرد کہ دریں حجرہ چگونہ میباشید؟
بعد ازاں بدست حاجی محمد پیغام کرد کہ
اینجا موضع است بہا لائے حجرۂ من
اگر بیایند کرم کردہ باشند و دعاگوے
چوں ایں جا مسجد جمعہ نزدیک بود
بخدمت مولانا شرف الدین موصی
سلمہ اللہ رفتہ می باشد عذر گفت۔ دریں
مدت بخانہ مراجعت خواہد افتاد و زحمت
دادہ نمی آید معہذا ہر کجا بدعوتے اورا
التطلبند ایں ضعیف را التطلبند و آنچہ
از کرم طبع ایشاں سزد انا کرام دریغ
نداشت حق سبحانہ وتعالیٰ توفیق حق
گذاری الطاف ایشاں کرامت کناد

اور چونکہ ان کا الطاف وکرم سب سے
زیادہ ہے اس لئے یہ ضعیف انکار بھی
نہیں کر سکتا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ بہت
اچھی طرح بسر ہوگا۔ شیخ نظام الدین نے
فرمایا تھا اور دو بار اس ضعیف کے
پاس تشریف بھی لائے تھے۔ بہت تعجب
کیا کہ تم اس کوٹھری میں کس طرح رہ
رہے ہو پھر حاجی محمد کے ہاتھ پیغام
بھیجا کہ یہاں میرے حجرے کے اوپر
ایک جگہ موجود ہے اگر آپ یہاں
آجائیں تو کرم ہوگا۔ مگر اس دعاگو
نے اس لئے معذرت کر لی کہ یہاں سے
جامع مسجد قریب ہے اور مولانا شرف
الدین موصی کی خدمت میں بھی جانا ہوتا
رہتا ہے اس مدت میں گھر کو واپسی
ہوجائے گی اور زحمت دینے کی ضرورت
پیش نہیں آئے گی۔ علاوہ ازیں جہاں
کہیں انہیں دعوت میں بلایا جاتا ہے،
اس ضعیف کو بھی بلا لیتے ہیں اور جو اُن کی
طبیعت کے شایانِ شان ہے عزت اکرام
میں دریغ نہیں کرتے اللہ تعالیٰ ہمیں

اُن کے الطاف و کرم کا حق ادا کرنے کی
توفیق عطا فرمائیے۔"

دوسری بار شیخ فرید صوفی دہلی کب آئے اس کا علم نہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے
اس بار دہلی سے واپس محرم ۵۷۲ھ (فروری ۱۲۸۰ء) میں ہوئی تھی۔ آخری سفر میں زن
و فرزند کے ساتھ دوشنبہ ۲۱۔ رمضان ۷۳۰ھ کو دہلی پہنچے تھے اس وقت دہلی بالکل
اُجڑ چکی تھی، سلطان محمد بن تغلق نے ساری آبادی کو یہاں سے دولت آباد منتقل کر دیا
تھا مگر ۷۲۹ھ میں ملتان میں کچھ شورش ہوئی اُسے دفع کرنے کی نیت سے محمد تغلق دہلی آیا
ہوا تھا اس نے شیخ فریدالدین صوفی کو بھی دولت آباد جانے کا حکم دیا اور یہ ۷۳۱ھ کے
آخر میں وہاں تشریف لے گئے۔ اُس وقت حضرت برہان الدین غریبؒ اور امیر حسن علاء
سجزی دہلویؒ دونوں دولت آباد میں موجود تھے اس لئے یقین ہے کہ ان بزرگوں سے بھی
ملاقات رہی ہوگی۔

ملتان میں غیاث الدین تغلق کے متبنّٰی ملک ابراہیم کی بغاوت کو دبانے کے لئے محمد
بن تغلق کو جو پاپڑ بیلنے پڑے اس سے یہ سبق مزید مل گیا کہ دولت آباد میں بیٹھ کر شمالی
ہندوستان پر حکومت کرنا آسان نہیں ہوگا اس لئے پھر دہلی واپس جانے کا حکم جاری
کر دیا گیا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ فریدالدین ناگوری بھی شعبان ۷۳۲ھ (اپریل
۱۳۳۲ء) میں پھر دہلی واپس تشریف لے آئے۔ دہلی میں بجے منڈل سے مشرق کی جانب اُن کا
مکان تھا اور اب اُسی جگہ مزار مبارک ہے۔ انتقال ہفتہ کے دن یکم جمادی الاولیٰ ۷۴۰ھ
(۸ جنوری ۱۳۴۳ء) کو ہوا تھا۔

"سرور الصدور" میں حضرت شیخ حمیدالدین ناگوری علیہ الرحمۃ کے بارے میں ان کے
فرزند شیخ عزیزالدین کی روایات بھی ہیں اور خود شیخ فریدالدین نے بھی اپنے مشاہدات
ومعلومات درج کئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ حمیدالدین سوالی نے حج بھی

کیا تھا اور وہ حضرت خواجۂ بزرگ خواجۂ معین الدین غریب نواز قدس سرہ کی خانقاہ میں امامت سے مشرف تھے، خواجۂ بزرگ اُن کی اقتدا میں نماز ادا فرماتے تھے کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی شخص کچھ پوچھنے یا وضاحت طلب کرنے کے لئے آجاتا تھا اور خواجۂ بزرگ اُسے شیخ حمید ناگوری کی طرف بھیج دیتے تھے۔ ایک بار خواجۂ بزرگ اجمیر کے قلعے میں تشریف فرما تھے ایک درویش آئے اور اُنھوں نے پوچھا کہ وہ کون سی باتیں ہیں جو ایک تارک دنیا میں پائی جانی چاہییں۔ حضرت خواجۂ خواجگان نے فرمایا کہ "شریعت میں تو صرف یہ ہے کہ جو کچھ خلائے کرنے کا حکم دیا ہے اُسے کرے اور جن باتوں سے باز رہنے کو کہا ہے اُن کے پاس نہ پھٹکے۔ ایسے شخص کو اگر کوئی تارک دنیا کہے تو بیجا نہ ہوگا مگر طریقت میں نو باتیں اور ہیں جب تک وہ پوری نہ ہوں کسی کو تارک نہیں کہا جا سکتا۔ پھر آپ نے حضرت شیخ حمید الدین صوفی ناگوری کی طرف دیکھا اور فرمایا تم ان درویش کو "ترک" کے بارے میں تفصیل بتادو اور لکھ کر بھیج دے دو تاکہ یہ کسی "عالمِ خدا" کو دکھائیں اور پھر بہت سے مسلمانوں کو نفع پہنچائیں۔"

اب ان درویش کو شیخ ناگوری نے بتایا کہ صوفیاے چشت کے نزدیک "ترک" کیا ہے۔ اول یہ کہ کسب نہ کرے، دوسرے قرض نہ مانگے، تیسرے اگر سات روز کا فاقہ ہو تب بھی کسی کے سامنے اپنا راز فاش نہ کرے، اور اُس سے مدد طلب نہ کرے، چوتھے یہ کہ اگر بہت سا کھانا یا روپیہ یا غلہ یا کپڑا اُسے مل جائے تو اگلے روز کے لئے کچھ بچا کر نہ رکھے۔ پانچویں یہ کہ کسی کے حق میں دعاے بد نہ کرے، اگر کوئی بہت ستائے تو بس اتنا کہے کہ یا اللہ اپنے اس بندے کو راہِ راست دکھا دے۔ چھٹے یہ کہ اگر کوئی اچھا کام بن پڑے تو اُسے اپنے پیر کی شفقت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت، اور حق تعالیٰ کی رحمت جانے۔ ساتویں یہ کہ اگر کوئی بُرا فعل سرزد ہو تو اسے اپنے نفس کی شومت سمجھے خود کو بُرے اعمال سے بچائے رکھے اور اللہ سے ڈرتا رہے تاکہ آئندہ وہ خطا پھر سرزد نہ ہو۔ جب اس منزل تک پہنچ جائے تو آٹھواں مرحلہ یہ ہے کہ دن میں روزہ رکھے اور رات کو قیام کرے۔ نویں یہ کہ

خاموش رہے اور صرف اسی وقت کلام کرے جب حاجت اصلی ہو، چنانچہ شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں یہی ہے کہ بولنا حرام ہے، اور خاموش رہنا بھی حرام ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہی بات بولے جس کا مقصد خوشنودی حق تعالیٰ کا حصول ہو۔"

اس مختصر تقریر میں جو نو نکات پر مشتمل ہے شیخ ناگوری نے اپنے پیرو مرشد کی ایماء سے سلوک طریقت کا خلاصہ پیش کر دیا ہے باقی جو کچھ ہے وہ سب اس کی تفسیر ہے یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ "ترک" پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہے؟ اس سلسلے میں یہ ملحوظ رہے کہ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ شریعت میں "ترکِ دنیا" صرف اتنا ہی کافی ہے کہ اوامر و نواہی کا خیال رکھے اور خدا اور اس کے رسول نے جن باتوں کو چھوڑنے کے لئے کہا ہے اُن کے پاس نہ پھٹکے۔ حضرت نصیرالدین چراغ دہلی بھی اپنے مریدوں سے یہی فرمایا کرتے تھے کہ "وصیت ہمیں است کہ انچہ خدا اور رسول خدا منع کردہ است آن نکنی!"

شیخ ناگوری نے فرمایا کہ کل خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تم ہمارے لئے کیا لے کر آئے۔ یہ یہ پوچھے گا کہ بتاؤ ہماری خاطر تم نے کیا چیز ترک کی تھی؟

یہ "الدین یسر" کے مصداق وہ فلسفہ ہے جس کا عام مسلمان کو مکلف کیا گیا ہے اس کے بعد نو مرحلے اپنے شیخ کی نیابت میں حضرت ناگوری نے بیان فرمائے وہ دراصل ایک درویش سے خطاب ہے یعنی ان شرائط کی تکمیل کی توقع اُن خواص سے کی جائے گی۔ جو روحِ شریعت تک پہنچنے کے آرزومند ہوں۔

لبتہ علماء ہی میں نہیں اس وقت صوفیاء میں بھی ایسے بزرگ تھے جنھوں نے دنیا جمع کر رکھی تھی اور اس کی بدولت اُن پر وہ آفتیں آرہی تھیں جو دولت کے ساتھ آنی چاہئیں۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے عالم اسلام میں یہ بحث چھڑی ہوئی تھی کہ غنا افضل ہے یا فقر۔ شیخ سعدی نے بھی گلستاں میں "جدالِ سعدی با مدعی" کے عنوان سے پورا معرکہ فقر و غنا کے موضوع ہی پر لکھا ہے۔ صوفی حمید سوالی نے بھی "فقر و غنا" کے موضوع

پر ایک رسالہ تصنیف کیا تھا۔ اور اس بارے میں وہ دوسرے درویشوں سے مراسلت بھی رکھتے تھے چنانچہ ناگور میں ایک تاجر تھا وہ ہر سال تل لے کر ملتان کی منڈی میں بیچنے جاتا تھا اور وہاں سے روئی لے کر ناگور آتا تھا وہ شیخ حمید سوالی کے خطوط حضرت بہاء الدین ذکریا ملتانی کے نام لے جاتا تھا اور اُن کا جواب لاکر حضرت کو دیا کرتا تھا۔ ان خطوط میں شیخ ناگوری نے حضرت ملتانی کی دولت مندی پر اعتراضات کئے تھے اُنھوں نے جواب میں لکھا کہ خدا نے متاعِ دنیا کو قلیل فرمایا ہے" قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ " اور میرے پاس اس کا اقلِ قلیل ہے۔ اس پر شیخ ناگوری نے پھر کچھ لکھا تو حضرت ملتانی نے جواب نہیں دیا۔

اس کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب شیخ نجم الدین صُغریٰ نے شیخ جلال تبریزی پر اتہام لگایا اور التمش کے دربار میں اُن کے خلاف محضر معتبر ہوا اور اُنھوں نے شیخ بہاء الدین ملتانی کو اپنا گواہ بنا کر پیش کیا تو اس محفل میں صوفی حمید الدین ناگوری بھی موجود تھے اُنھوں نے شیخ ملتانی سے کہا کہ جہاں کہیں مال ہوتا ہے وہاں مار (سانپ) بھی رہتا ہے اس میں کیا حکمت ہے؟ چنانچہ کہاوت بھی ہے کہ "گنج با مار وگل با خار" مال اور مار میں کچھ صُوری مناسبت بھی ہے، مگر معنوی مناسبت کیا ہے یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ شیخ ملتانی نے فرمایا کہ اگرچہ دونوں میں کوئی صُوری مناسبت نہیں ہے البتہ معنوی مناسبت موجود ہے اور وہ یہ کہ اپنے زہر کی وجہ سے مار (سانپ) مُہلک ہے اور مال اکثر لوگوں کو ہلاکت میں ڈال دیتا ہے۔ شیخ ناگوری نے فرمایا اس کا مطلب یہ ہوا کہ مال اور مار ایک ہی قبیل کی چیزیں ہیں تو جو مال جمع کرتا ہے وہ گویا مار، جمع کر رہا ہے۔ شیخ ملتانی سمجھ گئے کہ یہ میری دولت کی طرف اشارہ ہے فرمانے لگے کہ اگر کسی کو سانپ کا منتر یاد ہو تو اُسے سانپ کا زہر کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ شیخ ناگوری نے کہا کہ ایک پلید زہردار اور پُر خار جانور کو پالنا اور پھر اس کا منتر یاد رکھنے کے جھنجھٹ میں پھنسنا کون سی دانائی ہے؟۔ جب شیخ ملتانی نے دیکھا کہ ان کی دلیل قوی ہوتی جاتی ہے تو کہنے لگے کہ یہ الزام تو مجھ پر ہی نہیں میرے پیرو مرشد پر بھی

عائد ہوتا ہے۔ اُسی وقت شیخ شہاب الدین سہروردی کی روح پُر فتوح حاضر ہوئی اور کہا کہ بہاء الدین اِن سے یہ کہہ دو کہ تمہاری درویشی میں ایسا حسن وجمال نہیں ہے جسے نظر لگنے کا اندیشہ ہو اور ہماری درویشی میں اتنا جمال کمال ہے کہ اُسے نظر گذر سے بچانے کے لئے ٹیکا بھی درکار ہے اس لئے ہم نے "وسمۂ سیاہی دنیا" اس کے چہرے پر لگا لیا ہے۔" جب شیخ ملتانی نے حضرت ناگوری سے یہی بات کہی تو انھوں نے فرمایا "سبحان اللہ۔ آپ کی درویشی میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی درویشی سے زیادہ توحُسن وجمال نہیں ہے۔ اُن حضرتؐ نے غنا پر فقر کو ترجیح دی اور فرمایا کہ " اَلفَقرُ فَخری وَالفَقرُ مِنِّی " اس پر شیخ ملتانی نے کچھ جواب نہیں دیا۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ملتانی کے ایک صاحبزادے ناگور تشریف لائے تو انھوں نے دیکھا کہ شیخ حمید الدین ناگوری جمعہ کی نماز میں موجود نہیں تھے اس پر انھوں نے خاصا ہنگامہ کیا اور شیخ ناگوری نے فرمایا کہ "ناگور" "مصر" کے حکم میں نہیں اس لیے یہاں جمعہ کا وجوب بھی نہیں ہے۔ مگر انھوں نے علماء کو ساتھ ملا کر خاصی بحث کی۔ شیخ نے فرمایا کہ تم نے جتنا ہمارے اوقات میں خلل ڈالا ہے آتنی دیر کے لئے " ماترا حبس در دیشاں داریم"۔ شیخ حمید کے انتقال کے بعد حضرت ملتانی کے یہ فرزند کہیں جارہے تھے راستے میں ایک ڈاکو نے انھیں گرفتار کر لیا اور کہا کہ تمہیں اپنے والد ماجد کی چھوڑی ہوئی جایداد سے اتنا مال ملا ہے وہ سب لاؤ جب رہا کروں گا۔ انھوں نے اپنے بھائی شیخ صدرالدین ملتانی کو قید کا ماجرا اور رہائی کی شرط لکھی وہاں سے مال آیا تب انھیں نجات ملی۔

حضرت ملتانی کے پوتے حضرت شیخ رکن الدین ملتانی علیہ الرحمۃ ۲۰ھ میں سلطان قطب الدین مبارک خلجی کی دعوت پر دہلی آئے تھے جس نے انھیں حضرت نظام الدین اولیاء کا اثر و رسوخ ختم کرنے کی نیت سے بلوایا تھا۔ مگر اسی سال خسرو خاں نے سلطان کو قتل کر دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔ حضرت شیخ رکن الدین پھر بھی چار سال تک دہلی میں رہے انھوں نے حضرت نظام الدین

اولیاء کے جنازے کی نماز پڑھائی تھی اور اُس وقت یہ فرمایا تھا کہ "امروز مرا تحقیق شد کہ چہار سال کہ مرا در شہر دہلی داشتند مقصود این بود کہ بہ شرف امامت نماز جنازہ سلطان المشائخ مشرف شوم" (سیر الاولیاء) لیکن دہلی میں اُن کے طویل قیام کا سبب معلوم ہوا کہ حضرت شیخ رکن الدین ملتانی خسرو خاں کے محل کے زینے سے گر پڑے تھے جس سے چہرہ مبارک پر بہت چوٹ لگی تھی اور ران کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی تھی۔ یہ ۷۲۱ھ (۱۳۲۱ء) کا واقعہ ہوگا کیونکہ اسی سال چار ماہ اور چند روز کے لئے برسرِ اقتدار رہ کر غیاث الدین تغلق کے ہاتھوں خسرو خاں مارا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس مجبوری کی وجہ سے آپ کو ایک طویل عرصے تک دہلی میں قیام کرنا پڑا ہوگا۔

شیخ فرید الدین نے فرمایا کہ میں نے اپنے شیخ سے سنا ہے حضرت خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ اکثر یہ اشعار پڑھا کرتے تھے۔

ہاں اے دلِ گرم، بادمِ سرد بساز	با دیدۂ لعل نیا برخ زرد بساز
فریاد رسے چو نیست فریاد مکن	درماں چو نمی بینی، بادرد بساز

اور فرمایا کہ شیخ جیو نے یہ اشعار بھی اکثر "خواجہ جیو" کو پڑھتے سنا ہے۔

اے دل غم آن مخور کہ فردا چہ شود	زیرا کہ ہمہ خوشی دراں پے بشود
حکمے کہ بکرد است خداوند جہاں	دانم چہ شود، واگر ندانم چہ شود؟

۵- جمادی الثانیہ ۷۲۰ھ کی مجلس میں شیخ فرید ناگوری نے فرمایا۔

"شیخ بزرگ قدس اللہ روحہ العزیز امامت خواجہ جیو ہم کردے۔ چوں خواجہ جیو در اجمیر فرود آمد ملکے کہ دراں وقت بود خواجہ جیو را مرید شد و دختر کے بخدمت خواجہ جیو فرستاد و خواجہ جیو دراں وقت معمر شدہ بود می گویند عمر ایشاں بنود سال رسیدہ بود۔ خواجہ جیو را ازاں دخترک دو فرزنداں شدند۔ تا وقتیکہ شیخ بزرگ را گفت: حمید چیست انیکہ ہرگاہ کہ مارا دراں جوانی کہ مجرد بودہ ایم حاجتے بشدے دعا می کردیم و در حال اجابت شدے واین ساعت کہ پیر شدیم و فرزنداں آمدند ہرگاہ کہ حاجتے می شود بسیار می باید دعا ہم کردہ شود

ولیکن بعد از ویرینہ ثمرہ باجابت می رسد وحاجت بر می آید۔ ایں حکمت چیست؟

شیخ بزرگ فرمود گفتم یا شیخ شمارا بہتر روشن است از قصہ مریم۔ دراں وقت کہ مجرد بود بے خواست اومیوہ زمستانی بتابستان می رسید ومیوۂ تابستانی بزمستان می آمد کہ دلش بخدا یکتا بود۔ چوں عیسیٰ علیہ السلام بزاد مریم علیہا السلام منتظر بود کہ ہم چناں خواہد رسید فرمان آمد وھزی الیک بجذع النخلة - چوں دلت با یکتا بود نخواستیم کہ برائے ناں دوولہ مانی۔"

از شیخ خواجہ جیو چوں ایں بشنید پسندید ند۔"

سرورالصدور سے معلوم ہوتا ہے کہ ــــــــــــــــــــــــ

ـــ سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں (۶۳۳ - ۶۰۷ھ) چالیس یاروں کا قافلہ ایک ساتھ دہلی میں آیا تھا ان میں سے ہر ایک کو سلطان نے جائزہ گراں دیا تھا۔ ان میں شیخ نجیب الدین نخشبی بھی تھے انھوں نے اپنا حصہ کچھ حاجت مندوں میں تقسیم کر دیا اور کچھ دوستوں کی ضیافت میں۔ التمش نے انھیں اپنا منھ بولا باپ بنا لیا تھا اور دہلی کی شیخ الاسلامی ان کے تفویض کی۔ اس لئے یہ دہلی میں رہنے لگے۔ دوسرے احباب مختلف شہروں میں جا کر بس گئے حضرت شیخ معین الدین اجمیر میں تشریف لے آئے جب شیخ نجیب الدین دہلی کے شیخ الاسلام تھے خواجہ بزرگ اُن سے ملاقات کے لئے دہلی تشریف لائے تھے اور شیخ حمید الدین ناگوری بھی دہلی آیا کرتے تھے۔ ایک بار کہیں دعوت میں یہ سب بزرگ موجود تھے شیخ نجیب الدین نخشبی، شیخ معین الدین، شیخ جلال الدین تبریزی اور شیخ قطب الدین بختیار اوشی اور شیخ حمید الدین صوفی ناگوری۔ اس وقت موضوع گفتگو یہ تھا کہ اس زمانے میں "شیخ وقت" کون ہو سکتا ہے؟ اور کون ہے۔ سب اپنی اپنی رائے ظاہر کر رہے تھے۔ شیخ حمید الدین ناگوری نے کہا کہ اس زمانے میں "شیخ وقت" جیتل (پیسہ) ہے۔ سب حضرات کہنے لگے کہ شیخ ہم سنجیدگی سے بات کر رہے ہیں اور تم مذاق میں جواب دے رہے ہو۔ شیخ ناگوری نے کہا کہ

میں بھی سنجیدگی سے ہی کہہ رہا ہوں ۔ اس زمانے میں جس کے پاس جیتل زیادہ ہوں وہی "شیخ وقت" مانا جاتا ہے۔ ان کا یہ پُر معنی فقرہ سن کر سب خاموش ہو گئے ۔

شیخ حمید الدین صوفی نے ایک بار ۵ جمادی الاول ۶۶۲ھ فرمایا کہ میرے تین پیر ہیں ایک پیر ارادت حضرت شیخ معین الدین اجمیری دوسرے پیر صحبت ۔ مولانا شمس الدین حلوائی ۔ تیسرے پیر خرقہ ۔ شیخ حمید الدین محمد جوینی ۔

لیکن انھیں حضرت خواجہ بزرگ غریب نواز سے بھی خرقۂ ارادت ملا تھا۔ اور وہ تبرکات ان کے پوتے شیخ فرید الدین صوفی کے پاس محفوظ تھے ۔ جمال الدین کلانی متصرف ناگور کو انھوں نے ایک کلاہ بھیجی اور اس کے ہمراہ خط لکھا تھا ۔

"کلاہے کہ ایں ضعیف را از شیخ رسیدہ است و شیخ را از خدمت اجل شیخ معین الدین سجزی قدس اللہ روحہا رسیدہ است فرستادہ شد باید کہ بحرمت و تعظیم تمام بر سر نہند و دوگانہ بگزارند و مرادے کہ پیش دل آید بخواہد یقین است کہ بیابد بفضل اللہ"

حضرت خواجہ بزرگ کا خرقہ بھی شیخ فرید الدین صوفی تک پہنچا تھا ۔ انھیں بیعت کرتے وقت یہ اقرار لیا تھا کہ "درویشی را دوست دارم و درویشاں را خدمت کنم" ۔ پھر اپنا جبہ اتار کر پہنایا اور کہا: "ایں خرقہ شیخ است کہ بمن رسیدہ بود نرامی پوشانم و ایں ضعیف را بو شانید" غرض یہ کتاب حضرت خواجہ بزرگ اور ان کے ایک جلیل القدر خلیفہ کے حالات و ملفوظات کا سب سے اہم اور قابل قدر ۔۔ ماخذ ہے ۔ اس میں ایک کتاب شرف الانوار کا حوالہ بھی آیا ہے اور ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بھی شیخ حمید الدین ناگوری کے ملفوظات پر مشتمل تھی اور فصل اور نوع کے عنوان سے مختلف فصول و ابواب میں تقسیم کر کے لکھی گئی ۔ یہ اب ناپید ہو چکی ہے اگر کہیں اس کا نسخہ دستیاب ہو جائے تو اس میں بھی حضرت خواجہ اجمیری کے بارے میں بہت قیمتی معلومات ملیں گی اور یہ حضرت کے حالات میں سرور الصدور سے بھی قدیم تر ماخذ ہو گی ۔

اسلام اور سامانِ تعیّش

از: جناب سید جلال الدین صاحب عمری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲)

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ کیجئے برھان ماہِ اگست ۱۹۷۸ء)

مردوں کے لیے ریشم کا استعمال منع ہے

جس طرح اسلام نے مردوں کو سونے چاندی کے استعمال سے منع کیا ہے اسی طرح ریشم کے استعمال سے بھی منع کیا ہے۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

من لبس الحریر فی الدنیا فلن یلبسه فی الاخرة۔[1]　　جس نے دنیا میں ریشم پہنا وہ آخرت میں ہرگز ریشم نہیں پہنے گا۔

حضرت عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

انما یلبس الحریر فی الدنیا مَن لا خلاق له فی الاٰخرة[2]　　دنیا میں ریشم وہ شخص پہنتا ہے جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

یہ اور اس طرح کی بعض دوسری حدیثوں میں ریشم کے استعمال پر بڑی وعید سنائی گئی ہے اور اسے جنت کی نعمتوں سے محرومی کا سبب بتایا گیا ہے اس لیے اس کی حرمت ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ امام شوکانیؒ فرماتے ہیں:-

اذا لم تفد هذه الادلة التحریم فما فی الدنیا محرم[3]　　اگر ان دلائل سے بھی حرمت ثابت نہ ہو تو پھر دنیا میں کوئی چیز حرام نہ ہوگی۔

---

[1] بخاری، کتاب اللباس، باب لبس الحریر للرجال وما یجوز منه۔ مسلم۔ کتاب اللباس والزینة۔
[2] حوالہ سابق۔　[3] نیل الاوطار ۲/۸۳

اس سلسلہ میں ایک رائے یہ بھی رہی ہے کہ ان وعیدوں کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو فخر مباہات کے لیے ریشم پہنتے ہیں۔ اگر یہ جذبہ نہو تو اس کا استعمال عورتیں بھی کر سکتی ہیں اور مرد بھی سب کے لیے وہ مباح ہے۔ [۱]

لیکن یہ رائے اس لیے صحیح نہیں ہے کہ احادیث میں ریشم کے استعمال سے مطلق منع کیا گیا ہے۔ اس میں اس طرح کی کوئی قید نہیں ہے۔

عورتیں ریشم پہن سکتی ہیں

اس کے برخلاف حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی رائے، یہ تھی کہ ریشم کا استعمال مردوں ہی کے لیے نہیں بلکہ عورتوں کے لیے بھی جائز نہیں ہے: چنانچہ وہ اپنے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں۔ اپنی عورتوں کو ہرگز ریشم نہ پہناؤ اس لیے کہ میں نے حضرت عمرؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سُنا ہے کہ جو شخص دنیا میں اسے پہنے گا وہ آخرت میں اسے نہیں پہن پائیگا۔[۲]

یہی رائے صحابہ میں حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت حذیفہؓ اور حضرت ابوموسیٰؓ کی اور تابعین میں حضرت حسن بصریؒ اور ابن سیرینؒ کی بیان کی جاتی ہے۔ [۳]

لیکن یہ رائے بھی صحیح نہیں ہے اس لیے کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ ریشم کی حرمت صرف مردوں کے لیے ہے عورتوں کے لیے نہیں ہے۔ شریعت نے ان کو سونے کے ساتھ ریشم کے استعمال کی بھی اجازت دی ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

حرم لباس الحریر والذھب علی ذکور اُمتی واحل لاناثھم [۴] — ریشم کا لباس اور سونے کا استعمال میری امت کے مردوں پر حرام کر دیا گیا ہے البتہ ان کی عورتوں کیلئے وہ حلال ہے

---

[۱] فتح باری ۱۰/۲۳۹ [۲] مسلم، کتاب اللباس والزینۃ [۳] اس رائے کے کمزور ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جن بزرگوں کی طرف یہ منسوب کی گئی ہے ان میں حضرت علیؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بھی ہیں جن سے صریح روایتیں موجود ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کے لیے ریشم کو حرام اور عورتوں کے لیے حلال ٹھہرایا ہے۔ [۴] ترمذی، کتاب اللباس، باب ماجاء فی الحریر والذھب للرجال۔

یہی روایت ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے :-

أحل الذهب والحرير للاناث من امتي وحرم على ذكورها ۔[1]	سونا اور ریشم میری امت کی عورتوں کے لیے حلال اور اس کے مردوں کے لیے حرام کئے گئے ہیں

حضرت علیؓ کی روایت ہے :-

ان النبي صلى الله عليه وسلم اخذ حريرا فجعله في يمينه واخذ ذهبا فجعله في شماله ثم قال ان هذين حرام على ذكور امتي ۔[2]	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشم لیا اور اسے اپنے دائیں ہاتھ میں رکھا سونا لیا اور اسے اپنے بائیں ہاتھ میں رکھا پھر فرمایا یہ دونوں چیزیں میری امت کے مردوں پر حرام کردی گئی ہیں (اور عورتوں کے لیے حلال ہیں)

قاضی عیاض کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور ان کے ہم خیال لوگوں کے بعد اس بات پر اجماع ہوچکا ہے کہ ریشم مردوں کے لیے حرام اور عورتوں کے لیے حلال ہے ۔[3]

امام نووی فرماتے ہیں عبداللہ بن زبیرؓ کے بعد اس پر اجماع ہے کہ ریشم عورتوں کے لیے مباح ہے ۔جس حدیث سے انھوں نے استدلال کیا ہے ۔ایک تو اس میں خطاب مردوں سے ہے ۔دوسرے یہ کہ امام مسلم (اور دوسرے محدثین) نے جو صحیح حدیثیں روایت کی ہیں ان میں صراحت ہے کہ ریشم عورتوں کے لیے جائز ہے ۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ اور اسامہؓ سے فرمایا تھا کہ وہ ریشم عورتوں کو پہنائیں ۔تیسرے یہ کہ بہت ہی مشہور حدیث (جو ابھی گزر چکی) اس کے خلاف موجود ہے وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سونا اور ریشم مری امت کے مردوں پر حرام ہے عورتوں کے لیے حلال ہے ۔[4]

ایک اور موقع پر اس کی فقہی حیثیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔شوافع اور جمہور کا مسلک یہ ہے کہ کسی بھی قسم کے ریشم کا لباس پہننا مردوں کے لیے حرام ہے البتہ عورتیں ہر طرح کا ریشم کا کپڑا

---

[1] نسائی ، کتاب الزینۃ ، باب تحریم الذهب للرجال [2] ابوداؤد ، کتاب اللباس ، باب الحریر للنساء نسائی کتاب الزینۃ ، باب تحریم الذهب للرجال ۔ [3] فتح الباری ۱۰/۲۳۹ [4] نووی شرح مسلم ۲/۲۴۴-۲۴۵

پہن سکتی ہیں۔ [1]

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے:۔

لایحل للرجال لبس الحریر ویحل للنساء [2] مردوں کے لیے ریشم کا پہننا حلال نہیں ہے عورتوں کے لیے حلال ہے

اسی طرح اب یہ فقہ اسلامی کا متفقہ فیصلہ ہے کہ مردوں کے لیے ریشم کا لباس جائز نہیں ہے۔ عورتیں پہن سکتی ہیں۔

ضرورت کے وقت مرد بھی ریشم استعمال کر سکتے ہیں

وقت ضرورت ریشم کا کپڑا استعمال کرنے کی مردوں کو بھی اجازت ہے حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت زبیرؓ کو خارش یا اور کوئی تکلیف ہوگئی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ریشم کی قمیص استعمال کرنے کی اجازت عطا فرمائی۔ یہ خارش غالباً جوؤں کی وجہ سے تھی۔ اس لیے کہ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک جنگ کے دوران ان کے جسم میں جوئیں ہوگئی تھیں اس لیے آپ نے ان کو ریشم کا کپڑا پہننے کی اجازت دی۔ [3]

امام نووی فرماتے ہیں۔ یہ حدیث صراحتاً ان لوگوں کے حق میں جاتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ خارش میں ریشم کے کپڑے پہنے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح کسی کے جوئیں پڑ جائیں یا اسی قسم کی اور کوئی تکلیف ہو تو ریشم کا استعمال کر سکتا ہے۔ یہی امام شافعی اور ان کے ہم خیال لوگوں کا مسلک ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت زبیرؓ کو ریشم کا لباس پہننے کی اجازت ایک سفر میں دی گئی تھی اس لیے بعض شوافع نے اس اجازت کو سفر کے ساتھ مخصوص مانا ہے۔ لیکن شوافع کی اکثریت نے قطعیت کے ساتھ کہا ہے کہ خارش وغیرہ کے لیے ریشم کا استعمال سفر اور حضر دونوں حالتوں میں جائز ہے۔ [4]

حنابلہ کا بھی راجح مسلک یہی ہے۔ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں۔ خارش یا جوؤں یا کسی ایسی بیماری میں جس میں ریشم کا کپڑا پہننے سے آرام ملتا ہو وہ پہنا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس بارے

---

[1] شرح مسلم ۳۲/۱۴　[2] ہدایہ، کتاب الکراھیہ ۴/۵۳۴　[3] بخاری، کتاب اللباس باب ما یرخص للرجال من الحکۃ۔ مسلم، کتاب اللباس والزینۃ۔　[4] شرح مسلم ۵۲/۱۴۔

ہیں دو رائیں ہیں ایک رائے یہ ہے کہ اس صورت میں اس کا استعمال جائز ہے۔ اس کی دلیل حضرت انسؓ کی روایت ہے۔ اس روایت میں جن صورتوں میں ریشم کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے ان پر دوسری صورتوں کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ ریشم چونکہ حرام ہے اس لیے حالت مرض میں بھی اس کا استعمال جائز نہیں ہے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اور حضرت زبیرؓ کو ہو سکتا ہے آپؐ نے خاص طور پر اجازت دی ہو۔ اور یہ اجازت دوسروں کے لیے نہ ہو۔ امام مالک کا یہی مسلک ہے۔ لیکن پہلی رائے ہی صحیح ہے اس لیے کہ حدیث کو مخصوص ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

مزید فرماتے ہیں (سامان جنگ جیسے) خود اور زرہ وغیرہ کے اندر ریشم کے کپڑے کا استعمال ہمارے علماء کے نزدیک جائز ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک جنگی ضرورت ہے۔ اسی طرح اگر زرہ پر سونا چڑھایا گیا ہو اور اس کے پہننے کے سوا کوئی دوسرا چارۂ کار نہ ہو تو یہ بھی جائز ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ بغیر کسی مجبوری کے بھی اسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ سونے کے استعمال سے منع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے فخر و مباہات کا اظہار ہوتا ہے اور جنگ میں فخر کا اظہار غلط نہیں ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ بے ضرورت اس کا استعمال صحیح نہیں ہے۔ امام احمد بظاہر جنگ میں اس کے مطلق استعمال کو جائز سمجھتے ہیں۔ ان سے جنگ میں ریشم کا کپڑا پہننے کے بارے میں پوچھا گیا تو کہا مجھے امید ہے اس سے کوئی گناہ نہ ہوگا۔ عروہ بن زبیرؓ کے بارے میں آتا ہے کہ ان کے پاس ریشم کی قبا تھی اسے وہ جنگ میں پہنتے تھے[1]

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خالص ریشم پہننے سے مطلقاً منع فرمایا ہے اس لیے جنگ میں بھی اس کا پہننا مکروہ ہے۔ ایک ناجائز چیز کسی مجبوری کے تحت جائز ہو سکتی ہے۔ یہاں کوئی مجبوری نہیں ہے۔ شریعت نے مخلوط ریشم پہننے کی اجازت دی ہے۔ یہ دشمن کے مقابلہ میں بھی کار آمد ہے۔ جنگ میں اسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر جب ایک

---

[1] ابن قدامہ : المغنی ۱/۶۲۷

جائز چیز سے جنگی ضرورت پوری ہوسکتی ہے تو ناجائز کا اختیار کرنا صحیح نہیں ہے۔

امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک جنگ میں خالص ریشم پہنا جاسکتا ہے اس لیے کہ امام شعبی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ میں ریشم کے استعمال کی اجازت دی ہے[1]۔ اس کے علاوہ یہ ایک جنگی ضرورت بھی ہے۔ خالص ریشم پر تلوار کا اثر کم ہوتا ہے اور دشمن پر اس کا رعب بھی پڑتا ہے۔[2]

جنگ کے علاوہ اور ضرورتوں کے لیے بھی فقہ حنفی کی رو سے ریشم کے استعمال کی گنجائش ہے۔ چنانچہ تتارخانیہ میں حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اور حضرت زبیرؓ کے واقعہ سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ کھجلی اور خارش ہو یا پشمین کپڑے کے علاوہ اور کوئی کپڑا نہ ہو تو اس کے پہننے میں کوئی کراہت نہیں ہے۔ اسی طرح آنکھ میں تکلیف ہو اور ریشم کا کپڑا ڈالے رہنے سے آرام ملتا ہو تو وہ ڈالا جاسکتا ہے۔ غرض یہ کہ ضرورتاً ریشم کا کپڑا استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔[3]

حضرت انسؓ کی روایت سے طبری نے یہ استدلال کیا ہے کہ ریشم کا کپڑا پہننے سے بیماری میں کمی محسوس ہوتی ہو تو اس کا پہننا جائز ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں یہی حکم اس وقت بھی ہونا چاہیے جب کہ سردی یا گرمی کی تکلیف سے بچنے کے لیے ریشم کے سوا اور کوئی چیز نہ ہو۔[4]

امام شوکانی کہتے ہیں حضرت انسؓ کی روایت میں خارش اور کھجلی کے لیے ریشم کے استعمال کی اجازت ہے۔ ان پر دوسری ضرورتوں کو قیاس کیا جائے گا۔[5]

---

[1] لیکن اس حدیث کو علامہ جمال الدین زیلعی نے "غریب" (کم زور) کہا ہے۔ اس مضمون کی ایک اور روایت حکیم بن عمیر سے آتی ہے۔ اس کے کئی راوی کم زور ہیں۔ ابن سعد نے حضرت حسن بصریؒ سے روایت کی ہے کہ مسلمان جنگ میں ریشم پہنتے تھے۔ نصب الرایہ لاحادیث الھدایہ ۴/ ۲۲۶ [2] ہدایہ کتاب الکراھیہ ۴/ ۴۵۴۔

[3] تکملۃ بحر الرائق ۸/ ۱۹۰۔ ردالمحتار علی الدر المختار ۵/ ۳۱۱ [4] فتح الباری ۱۰/ ۲۴۹۔

[5] نیل الاوطار ۲/ ۸۱۔

اس طرح فقہ میں ان چند ضرورتوں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں ریشم استعمال ہوسکتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی صراحت کردی گئی ہے کہ ان کے علاوہ دوسری ضرورتوں میں بھی اس کا استعمال ناجائز نہیں ہے

زینت کے لیے تھوڑے سے ریشم کا استعمال جائز ہے

ریشم کا لباس مردوں کے لیے حرام ہے لیکن زیب و زینت کی خاطر اس کے تھوڑے سے استعمال کی شریعت نے اجازت دی ہے۔ حضرت عمرؓ عتبہ بن فرقد کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :-

ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نھی عن الحریر الا ھکذا واشار باصبعیہ التی تلیان الابھام قال فی ما علمنا یعنی الاعلام [۱]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشم کے استعمال سے منع فرمایا الا یہ کہ وہ اس مقدار میں ہو۔ (اسے واضح کرنے کے لیے) آپؐ نے انگوٹھے سے ملی ہوئی دو انگلیوں سے اشارہ فرمایا۔ راوی کا بیان ہے کہ جہاں تک ہماری معلومات اس سے ریشم کے نقش و نگار مراد ہیں۔

مسلم کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دونوں انگلیاں ملا کر دکھائیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرد کے لباس کے چاروں طرف دو انگلیوں کے برابر چوڑائی میں ریشم کے گل بوٹے اور نقش و نگار کاڑھے جاسکتے ہیں۔ حضرت عمرؓ ہی کی ایک اور روایت میں ہے کہ چار انگلیوں کی چوڑائی کے برابر ریشم استعمال ہوسکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا:-

نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن لبس الحریر الا موضع اصبعین او ثلاث او اربع [۲]	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشم کے پہننے سے منع فرمایا الا یہ کہ وہ دو یا تین یا چار انگلیوں کی مقدار میں ہو۔

ہوسکتا ہے شروع میں ریشم کے تھوڑے سے استعمال کی اجازت رہی ہو اور بعد میں زیادہ ہوگئی ہو۔ یہ ایک اندازِ بیان بھی ہوسکتا ہے کہ دو یا چار انگلیوں کے برابر ریشم کا استعمال جائز ہے ریشم کی گوٹ لگا ہوا لباس خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زیب تن فرمایا ہے حضرت اسماءؓ

---

[۱] بخاری، کتاب اللباس، باب لبس الحریر للرجال وقدر ما یجوز منہ۔ مسلم، کتاب اللباس والزینۃ۔
[۲] مسلم، کتاب اللباس والزینۃ۔

کے غلام عبداللہ روایت کرتے ہیں:۔

اخرجت (اسماء) الی جبۃ طیالسۃ کسرونیۃ لہا لبنۃ دیباج وفرجیہا مکفوفین بالدیباج فقالت ہذہ کانت عند عائشۃ حتی قبضت فلما قبضت قبضتہا وکان النبی صلے اللہ علیہ وسلم یلبسہا فنحن نغسلہا للمرضی یستشفی بہا [1]

حضرت اسماءؓ ایک جبہ نکال کر لائیں اور مجھے دکھایا جو خسروی چادر کا تھا۔ اس کے گریبان میں ریشم کی گوٹ تھی اس کے (آگے پیچھے کے) دونوں چاک میں ریشم کی پٹی تھی انھوں نے کہا یہ جبہ حضرت عائشہؓ کے پاس تھا جب ان کا انتقال ہوا تو میں نے اسے لے لیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسے پہنتے تھے ہم اسے مریضوں (کو پلانے یا نہلانے) کے لیے دھوتے ہیں شفا کی امید میں۔

اس میں اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ قمیص کے چاک اور گریبان میں ریشم کا استعمال ہو سکتا ہے۔[2]

امام نوویؒ فرماتے ہیں جمہور کے نزدیک لباس میں ریشم کی گوٹ لگائی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ اس کی چوڑائی چار انگلیوں کی چوڑائی سے زیادہ نہ ہو۔ امام مالکؒ سے دو متضاد رائیں منقول ہیں۔ ایک یہ کہ ریشم کی گوٹ بالکل ناجائز ہے۔ دوسری یہ کہ گوٹ چار انگلیوں کے برابر ہو یا اس سے زیادہ دونوں صورتوں میں جائز ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں یہ دونوں رائیں صریح احادیث کے خلاف ہیں اس لیے قابل رد ہیں۔[3]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔ کپڑے، جبہ، عمامہ اور اسی طرح کی چیزوں میں ریشم کے کنارے

---

[1] مسلم کتاب اللباس والزینۃ　[2] اتنی بات طے ہے کہ آپ کے جبہ میں جو پٹی لگی تھی وہ مخلوط ریشم کی نہ تھی۔ بلکہ خالص ریشم کی تھی اس لیے کہ دیباج خالص ریشم ہی کو کہا جاتا ہے۔ البتہ حضرت عمرؓ کی روایات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس گوٹ یا پٹی کی چوڑائی چار انگلیوں کی چوڑائی کے برابر تھی۔ لیکن حضرت اسماءؓ کی یہ حدیث مسند احمد میں بھی آئی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں، علیہا لبنۃ شبر من دیباج یعنی جبہ کے گریبان میں ایک بالشت کی ریشم کی پٹی لگی تھی اس سے خیال ہوتا ہے کہ ریشم چوڑائی میں بالشت بھر بھی ہو سکتا ہے۔ الا یہ کہ یہ کہا جائے کہ اس کی چوڑائی نہیں بلکہ لمبائی بالشت بھر تھی۔ نیل الاوطار ۲/ ۷۹ - ۸۰ [3] شرح مسلم ۱۴/ ۴۸ - ۴۹۔

اگر چار انگشت سے زیادہ نہ ہوں تو اس کا استعمال جائز ہے۔ یہی امام شافعی وغیرہ کا مسلک ہے[1]۔

فقہ حنبلی کا بھی یہی مسلک ہے۔ یعنی یہ کہ ریشم کے گل بوٹے کپڑے میں ہوں اور ان کی چوڑائی چار انگلیوں کی چوڑائی کے برابر یا اس سے کم ہو تو مردوں کے لیے اس کا استعمال جائز ہے۔ اسی طرح ریشم کے جوڑ پیوند اس کی گوٹ، گلے کی پٹی وغیرہ کو بھی جائز کہا گیا ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ اس مقدار میں سونے کا کام بھی ہو سکتا ہے۔[2]

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کہ آستین کے کناروں، قمیص کے گلے، عبا کی پشت اور شانوں پر اتنی چوڑی ریشم کی گوٹ لگائی جا سکتی ہے۔ جتنی چوڑائی کہ چار انگلیوں کے ملانے سے ہوتی ہے۔ اتنی چوڑائی میں ریشم کے گل بوٹے بھی کاڑھے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح عمامہ کے طرہ میں بھی اس مقدار میں ریشم کا استعمال جائز ہے۔[3]

ریشم کے دوسرے استعمالات بھی ناجائز ہیں۔

ریشم کا لباس تو مردوں کے لیے حرام ہے۔ کیا لباس کے علاوہ ریشم کے دوسرے استعمالات بھی ممنوع ہیں؟ کیا ریشم کے پلنگ پوش چادریں، غلاف، تکیے، گدّے، فرش اور قالین وغیرہ بھی ناجائز ہیں؟ بظاہر حدیث سے ان کے عدم جواز ہی کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ حضرت حذیفہؓ کی روایت ہے:۔

نھانا النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن لبس الحریر والدیباج وان نجلس علیہ[4]	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ریشم پہننے اور اس پر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔

اس حدیث کی بنیاد پر جمہور کا مسلک یہ ہے کہ ریشم کی کسی چیز پر بیٹھنا بھی ممنوع ہے

---

[1] شرح مسلم ۱۴/۳۲۔ [2] ابن قدامہ: المغنی ۱/۶۲۶ [3] حضرت عمرؓ نے اپنی چار انگلیوں سے اشارہ کر کے کہا تھا کہ اتنی چوڑائی میں ریشم کے استعمال کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی ہے۔ فقہ حنفی میں اس کا اندازہ اوسط درجہ کی ایک بالشت سے کیا گیا ہے۔ یہ اندازہ بظاہر مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی تائید مسند احمد کی روایت سے ہوتی ہے جس میں علمۃ تشبہر من دیباج کے الفاظ آئے ہیں۔ ملاحظہ ہو رد المحتار علی الدر المختار ۵/۳۰۸ [4] بخاری، کتاب اللباس، باب افتراش الحریر۔

حافظ ابن حجرؒ کے بقول یہ حدیث جمہور کی سب سے مضبوط دلیل ہے۔ لیکن امام ابو حنیفہ بعض شوافع اور مالکیہ میں سے ابن ماجشون کی رائے اس کے خلاف ہے۔ ان کے نزدیک ریشم کے کپڑے پر بیٹھنا جائز ہے مذکورہ بالا حدیث کا اس نقطہ نظر سے ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ ریشمین لباس کی ممانعت تو بہت سی حدیثوں میں صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن ریشم پر بیٹھنے کی ممانعت صرف اسی ایک روایت میں ہے[1] پھر یہ کہ ان الفاظ سے صریح طور پر حرمت ثابت نہیں ہوتی ہے اس لیے کہ حضرت حذیفہؓ یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشم پہننے اور اس پر بیٹھنے سے منع فرمایا۔ کسی چیز سے منع کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ لازماً حرام ہے۔ ناپسندیدہ اور مکروہ چیزوں سے بھی منع کیا جاسکتا ہے۔ دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ اس حدیث میں ریشم کے پہننے اور بیٹھنے سے منع کیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص ریشم نہ پہنے اور بیٹھنے کے لیے اسے استعمال کرے تو سوال یہ ہے کہ کیا یہ بھی ناجائز ہوگا۔ اس معاملہ میں حدیث صریح نہیں ہے[2]

علاوہ ازیں ایک روایت میں ریشم کے گدے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹھنے کا ذکر آتا ہے[3] حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ریشم کے تکیہ کا استعمال ثابت ہے[4]۔ اسی طرح حضرت انسؓ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ ایک ولیمہ میں پہونچے اور ریشم کا تکیہ استعمال کیا۔

لیکن ان سب باتوں سے ایک صریح حدیث کو رد کرنا آسان نہیں ہے۔ پھر یہ کہ اس سلسلہ میں صرف یہی ایک حدیث نہیں ہے بلکہ دوسری حدیثیں بھی اس کی تائید میں موجود ہیں۔ کسی صحابی سے اس کے خلاف عمل ثابت ہو تو اس کی کوئی مناسب توجیہ کی جاسکتی ہے۔ اس لیے جمہور ہی کا مسلک اس مسئلہ میں قوی معلوم ہوتا ہے۔ فقہاء احناف میں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ بھی جمہور ہی کے ساتھ ہیں۔ فقہ حنفی کا فتویٰ بھی اسی کے مطابق ہے[5]

---

[1] خود حضرت ابو حذیفہؓ کی یہ روایت بخاری و مسلم میں متعدد مقامات پر آئی ہے لیکن صرف اسی ایک جگہ بخاری میں وان نجلس علیہ یعنی آپ نے ریشم پر بیٹھنے سے بھی منع فرمایا کے الفاظ آئے ہیں۔ فتح الباری ۲۴۶/۱۰

[2] فتح الباری ۲۴۶/۱۰ [3] امام زیلعی فرماتے ہیں۔ یہ بہت ہی ضعیف روایت ہے نصب الرایہ لاحادیث الہدایہ ۲۲۷/۴ [4] نصب الرایہ ۲۲۷/۴ [5] رد المحتار علی الدر المختار ۳۱۱/۵

"مسجد قرطبہ" — فنّی نقطۂ نظر سے

از: جناب ایس محمد ہاشم صاحب، شعبۂ اردو۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

"مسجد قرطبہ" اقبال کی ان اہم ترین چند نظموں میں سے ایک ہے۔ جس کی وجہ سے اقبال تاج دار شاعری کہے جاتے ہیں۔ اس میں ان کے فکر و فن کا سارا نچوڑ سمٹ آیا ہے۔ یہ وہ واحد نظم ہے جس کو پڑھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر وہ صرف یہی نظم لکھتے تو بھی ان کا شمار بڑے شاعروں میں ہوتا اس میں ان کی پوری شاعری پورا پیغام، ان کے تمام احساسات کی پرچھائیاں تخیل کی رفعت تشبیہوں واستعاروں کا حسین، لطیف اور برمحل استعمال، ان کا فلسفۂ حیات۔ تاریخ انقلاب عالم، انسان کی حقیقت، مومن کی حقیقت۔ ان کا فرشتوں سے موازنہ اور ان پر فوقیت، اس کا مسجد قرطبہ سے موازنہ، اس کی عظمت، جلال وجمال، پاکبازی، دل نوازی۔ بے نیازی، اس کے علاوہ قوموں کے عروج و زوال کے نفسیاتی اسباب، کسی تخلیق کو اعجاز بنانے کے لیے اس میں خونِ جگر کا صرف اور نہ جانے کتنے خیالات کو ایجاز بیانی کے ساتھ اس چھوٹی سی نظم میں سمو کر رکھدیا ہے۔

اقبال کے لکھنے والوں نے ان کے پیغام، ان کے مقصد اور ان کی فکر کی وضاحت پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ ان کے فن پر شاذ ہی لکھا گیا ہے۔ دراصل ان کی شہرت کا دارومدار ان کے پیغام پر ہے۔ اقبال کا مخاطب کوئی خاص ملک نہیں، ملت بیضا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں مسلم قوم کے پس ماندہ حالات کا جائزہ لیا ہے۔ ان کا مرض تلاش کیا ہے اور ان کا حل

پیش کیا ہے۔ اقبال کے کلام میں بین الاقوامیت کا عنصر ان کا مضبوط ترین پائنٹ ہے وہ پوری انسان برداری کی عموماً اور مسلمانوں کی خصوصاً فلاح چاہتے ہیں۔ اقبال وہ پہلا شاعر ہے جسے علوم متداولہ پر بھرپور عبور حاصل ہے اور صرف وہی یہ جانتا ہے کہ رومی۔ غزالی۔ گوئٹے وغیرہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ اقبال کا ذہن اپنے عہد کا انتہائی پیچیدہ ذہن تھا۔

جب کوئی قوم پستی اور زوال کی حدوں کو پار کرنے لگتی تھی تب اس میں پیغمبر بھیجا جاتا تھا بڑا ادیب بھی اسی وقت پیدا ہوا ہے۔ جب زوال حد سے زیادہ بڑھ گیا ہے خواہ وہ سرسید ہوں نذیر احمد ہوں، حالی ہوں خواہ اقبال۔ ادب زوال کے بعد عروج پاتا ہے۔ بیسویں صدی کی ابتدائی تین دہائیاں مکمل طور پر زوال پذیر تھیں، ہر جگہ مسلمان پسپا ہو رہے تھے، کوئی اسلامی سلطنت آزاد نہیں تھی۔ ترکی میں انقلاب آچکا تھا، بغداد تباہ ہو چکا۔ جرمنی۔ فرانس۔ اٹلی میں انقلابات رونما ہو چکے اور ہو رہے تھے مسلمانوں کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ حجاز کا حاکم باغی و غدار تھا۔ وہ مسلمانوں کا دشمن بن گیا تھا۔ خود ہندوستان میں مسلمانوں کی بے کسی و بے بسی کی حالت تھی۔ مسلمانوں کی اس تباہ حالت کو دیکھ کر اقبال جیسے دردمند دل رکھنے والے انسان کی روح کانپ اٹھی۔ مسلمانوں کی بہت سی نشانیاں تھیں۔ ہندوستان میں قابل قبول چیز مسجد قوت الاسلام تھی۔ لیکن اس سے شان و شوکت ظاہر ہو رہی تھی اقبال کو مسلمانوں کے سامنے عبرت کا نمونہ پیش کرنا تھا۔ قرطبہ کی جامع مسجد سات سو سال پرانی ہے۔ مسلمانوں کے شان و شوکت کے زمانے کی یاد دلاتی ہے وہ اس وقت تباہ اور ویران ہے۔ جو چیز زبان حال سے مسلمانوں کے عروج و زوال کی یاد دلا رہی ہو وہ عبرت کا بہترین نمونہ بن سکتی ہے۔ چنانچہ اسی مسجد قرطبہ کا انتخاب کر کے اقبال نے یہ نظم لکھی۔ اس کے علاوہ ہندوستان ہماری تاریخ کی کتاب نہیں، ایک باب ہے۔ کتاب مڈل ایسٹ ہے۔ اقبال نے مسجد قرطبہ کو اسی لیے انتخاب کیا کہ وہ عظمت اور عبرت کی مکمل کہانی ہے۔ عبرت کی اس وجہ سے کہ اس کا نام سن کر فرانس اور جرمن لرز جاتے تھے اور آج اس کا کوئی پرسانِ حال تک نہیں۔ عظمت کی وجہ یہ ہے کہ مسجد قرطبہ کی کیا کیا بے حرمتی ہوئی لیکن وہ سات سو سال سے اسی طرح کھڑی ہوئی زمانہ کو گذرتے

بڑے بڑے پہاڑوں کو تحلیل ہوتے۔ دریاؤں کو خشک ہوتے۔ سمندر کے مد و جزر کو، بادشاہوں کو پست ہوتے، عروج کا زوال ہوتے، اور زوال کے بعد پھر عروج کے راز کو افشا ہوتے، مذہبوں کی تبدیلیوں کے زمانے کے نشیب و فراز کو غرض ایک طویل عرصے سے ہر ہر چیز کو دیکھ رہی ہے۔ مسجد قرطبہ اسلامی تحریک، اس کی شان و شوکت، اس کی حرکت و عمل کی ایک علامت ہے، ایک SYMBOL ہے اگرچہ یہ مکمل تاریخِ انسانیت نہیں ہے لیکن مسلمانوں کے عروج و زوال کی تاریخ کا ایک نمونہ ہے اسلام سے بے انتہا محبت اور اپنے بے پناہ خلوص کے ساتھ اسے خدا کے بندوں نے دنوں کی تپش اور راتوں کے گداز کے حسین امتزاج سے بنا کر پایۂ تکمیل کو پہنچایا تھا۔ دنیا کے سامنے ایسا بے مثال نمونہ پیش کیا تھا جس کی شہادت اتنے عرصہ کے بعد وہ خود زبان حال سے دے رہی تھی ایسی تخلیق آج ویران اور تباہ شدہ شکل میں پڑی ہوئی ہے، غیر اس پر قابض ہیں۔ مدت سے یہاں اذان اور نماز نہیں ہوتی۔ یہ دریائے کبیر کے کنارے کھڑی ہوئی ہے

یہ تمام تاریخی جھلکیاں ہمیں اسی نظم "مسجد قرطبہ" میں ملتی ہیں۔

"مسجد قرطبہ" تخیل کی نہایت بلندی سے شروع ہوتی ہے۔ یہ نظم وقت کا اس وقت کا تصور لے کر طلوع ہوتی ہے جس کے تصور سے انسان کے تخیل کے پر جلنے لگتے ہیں۔ اس میں بہت بڑی حقیقت کو پیش کیا گیا ہے۔ وقت، جو کسی کے قابو میں نہیں آسکتا۔ اسے خریدا نہیں جاسکتا، اسے واپس نہیں لایا جاسکتا۔ اقبال نے اس وقت کو پیش کیا ہے۔ اس نظم میں وقت کی تیز خرامی اور تسلسل کو پیش کر کے عشق کی عظمت کو ابھارا ہے وقت سے پس منظر کا کام لیا ہے نظم اسی طرح شروع ہوتی ہے:

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات

وقت کا ایک طویل سلسلہ ہے جو اپنے اہم واقعات و حادثات کے گہرے نقوش دنیا کے مختلف حصوں پر بناتا چلا جاتا ہے، اسی وقت کے ایک خاص حصہ کا نقش خود مسجد قرطبہ بھی ہے یہ وقت زندگی اور موت کی حقیقت بتاتا ہے۔ انسانوں نے اپنی آسانی اور سہولت کے خاطر وقت

کو بہت سے حصّوں میں تقسیم کرلیا ہے یعنی سال مہینے۔ ہفتے۔ دن۔ رات۔ گھنٹے۔ منٹ۔ سیکنڈ لیکن اگر ان حدود سے بلند ہو کر ہم سوچیں تو وقت میں بہت کشادگی ہے، بہت رفعت ہے۔ ایک تسلسل ہے، ایک روانی ہے۔ یہ وقت آفرینش عالم کی داستان سناتا ہم تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ وقت انسان کو لامحدود بنانا چاہتا ہے۔ جس تیزی سے خود بہہ رہا ہے اسی رو میں انسان کو بہانا چاہتا ہے یہ سب کو پرکھتا رہتا ہے۔ اگر انسان وقت کے بازار کا سکہ بننے کے لائق نہیں تو یہ اسے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ وقت دن اور رات کی حقیقت سے انکار کرتا ہے۔ اس میں ایک تسلسل ہے۔ ایک روانی ہے۔ اگر انسان اس تسلسل میں اس کے قدم بقدم نہیں چلتا تو اس کے لیے موت بہتر سمجھتا ہے۔ وقت کا یہ سلسلہ کبھی درہم برہم نہیں ہوتا ہر وقت جاری ہے، جبکہ

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر　　کارِ جہاں بے ثبات کارِ جہاں بے ثبات

دنیا کی ہر نئی اور پرانی چیز فانی ہے۔ وقت سب کے خاتمہ کا تماشائی ہے۔ اگر کوئی اہم کارنامہ انجام دیا جاتا ہے تو اس کی علامت وقت ہی ہے۔

اس نظم میں تین چیزیں حاوی نظر آتی ہیں۔ وقت (تاریخ کے پس منظر میں بھی) مردِ مومن اور عشق۔ دراصل جس چیز کو علامت بنایا جاتا ہے۔ اس کی بجائے خود اتنی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی جتنی اس کی ہوتی ہے۔ جس چیز کی علامت مانا جائے کیونکہ وہی اپنے پورے اثر، پورے آداب اور پوری شان و شوکت کے ساتھ جلوہ افروز ہوتی ہے۔ چنانچہ یہاں مسجد قرطبہ علامت ہے عشق کی۔ اس لیے یہاں مسجد قرطبہ سے زیادہ اہمیت عشق کی ہے۔

اقبال کا پیش کردہ عشق میر و فانی کے عشق سے، مومن و غالب کے عشق سے اور داغ و حسرت کے عشق سے مختلف ہے۔ اقبال کا اپنا مخصوص عشق ہے جس کی پرچھائی تصوف میں ملتی ہے۔ اقبال کے عشق کا مطلب ہے نفی بالذات۔ ان کے عشق پر موت حرام ہے۔ یہ وقت ہی کی طرح لافانی ہے اسی لیے عصرِ رواں کے سوا بھی عشق میں بہت سے زمانے پیوست ہیں اور

عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

یہ عشق سبھی لافانی ہستیوں کے یہاں مختلف شکلوں میں جلوہ گر رہتا ہے۔ چاہے حضرت جبریل ہوں یا رسول اکرم زندگی کے دوام کا راز اسی عشق میں مضمر ہے۔ عشق کرنے والا مومن بھی لافانی اور اس کے سبھی کارنامے لافانی ہوتے ہیں۔ دنیا کی سبھی چیزیں فانی ہیں۔ وقت سب کا تماشائی ہے۔ اگر کسی چیز کو بقا اور دوام حاصل ہوا ہے یا ہوسکتا ہے تو وہ اس مرد مومن کا کارنامہ ہوسکتا ہے۔ جو خدا کے عشق کا بہترین نمونہ ہے ——— خدا کے عاشق یعنی مرد مومن کے ذریعہ ہی عشق مسجد قرطبہ کے وجود کا سبب بنا۔ اس نے اپنا خون و جگر صرف کر کے اس مسجد کو تیار کر کے دائمی بنا دیا

مردِ مومن خدا کا عاشق ہے۔ جس کے ہر سانس اور ہر نغمہ سے اللہ ہو کا ساز نکل رہا ہے جو اس کے رگ و پا میں پیوست ہے۔ یہ بندہ اگرچہ فرشتوں کے مقابلے میں بہت کم عبادت کرتا ہے لیکن دن بھر کام کرنے کے بعد اپنی ہزاروں دنیاوی اور نفسانی خواہشات کو ترک کر کے راتوں کی نیند حرام کر کے اپنے محبوب کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو کر گریہ وزاری کرتا ہے۔ وہ اس سے بلند مرتبہ حاصل کر لیتا ہے۔ جس معصوم مخلوق کو عرف عام میں "پیکر نوری" یا فرشتہ کہتے ہیں۔ جس کے پاس کوئی نفسانی خواہش بھی نہیں ہے۔ دلوں کی تپش کے نتیجے میں جو گداز انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ دعا بارگاہ ایزدی میں قبول ہوتی ہے۔ وہ گداز فرشتوں کو میسّر نہیں اگرچہ وہ ہمیشہ عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔

اس مرد مومن کا کوئی ایک مقام متعین نہیں، ہر بلندی پر پہنچ کر اس کی یہ دعا رہتی ہے:۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب

اور اقبال کے الفاظ ہیں:۔

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر　　　تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اس مرد مومن میں بہت سی صفات ہیں۔ یہ حُسن و جمال کا بہترین نمونہ ہے۔ موسیٰ اور ابراہیم جیسی لازوال شخصیتوں کا مقلد ہے۔ اس لیے خود بھی لافانی ہے۔ یہ بہادری اور شجاعت میں طاق ہے یہ دنیا کو وہم جانتا ہے صرف زندگی گذارنے کے لیے دنیا کو قبول کئے ہوئے ہے اور:

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ حلقۂ آفاق میں گرمئ محفل ہے وہ

انھیں مردانِ خدا نے دنیا کی مہذب قوموں کو حکومت کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ اور یورپ کی تاریک راتوں میں علم کی شمعیں جلا کر انھیں راستہ دکھایا۔ ان کے حسین چہروں کا عکس جن کے چہروں پر جن کی آنکھوں پر پڑ گیا ان کے سامنے چشمِ غزال ماند پڑ گئیں۔ ان کے بلند اخلاق کا اثر پڑھنے کی وجہ سے وہ لوگ اپنے کو قابلِ فخر سمجھنے لگے۔

یہ ہے اقبال کا مردِ مومن۔ ان خصوصیات کا حامل مردِ مومن اس وقت اقبال کو نظر نہیں آرہا۔ اگر ایسا شخص پیدا ہو جائے تو جس طرح فرانس۔ اٹلی۔ جرمنی وغیرہ میں انقلاب آچکے ہیں۔ ملتِ بیضا کے اس اضطراب کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے اس پر اتنے مظالم ہو رہے ہیں۔ مردِ مومن کے دل کے بیکراں سمندر میں ظلم کا تلاطم آیا ہوا ہے۔ اب یہ بھی انقلاب چاہتا ہے۔ پھر:۔

دیکھئے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

اقبال کی یہ پیشنگوئی ہے کہ مستقبل قریب میں ان زبردست مظالم کا انجام ظاہر ہو کر رہے گا۔ ان مظالم کا جس قدر صدمہ مجھے ہوا ہے اگر میں اس کا اظہار کر دوں تو:۔

لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

آخر میں اقبال اپنا ایک پیغام پیش کرتے ہیں کہ زندگی کے لیے انقلاب ضروری ہے قوموں کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ وہ زمانے کے قدم سے قدم ملا کر چلیں۔ اگر قوموں کا جمود نہیں ٹوٹتا ہے اور وہ زمانے کے حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتیں تو ان کا انجام موت ہے۔

اس نظم میں خطاب کا رنگ ولہجہ غالب ہے۔ الفاظ کی دروبست سے رجز کی موسیقی پیدا کی ہے۔ خود قرطبہ کو متعدد بار مخاطب کیا ہے پہلے بند میں وقت کے سلسلہ میں قرطبہ سے خطاب کر کے تین اشعار کہے گئے ہیں۔

مسجد قرطبہ کو اس نظم میں اس طرح مخاطب کیا ہے جیسے کوئی عاشق اپنے محبوب سے راز ونیاز کی باتوں میں مصروف ہو۔ کہیں اس سے بہت مؤدبانہ انداز میں گفتگو کرتا ہے۔

کہیں اندلس کی سرزمین کی عظمتِ حرم مرتبت کا راز وہاں مسجد کی تعمیر میں مضمر بتاتا ہے۔ کہیں خطابیہ لہجہ میں مومن اور قرطبہ کا موازنہ کرتا ہے۔ مسجد کے وجود کا سبب مردِ مومن کے عشق کو ٹھہراتا ہے۔ کہیں قرطبہ کی عظمت کا ذکر کر کے مومن کی صحیح عظمت ثابت کرتا ہے۔ کہیں کیفیت، سرور اور لطف کے لحاظ سے اپنا (شاعر کا) اور مسجد قرطبہ (کے منظر) کا موازنہ کرتا ہے کہیں مسجد کی ویرانی، اس میں اذان و نماز نہ ہونے کے سبب افسوس ظاہر کرتا ہے لیکن اس کی عظمت کا ہر ہر لحظہ اعتراف کرتا رہتا ہے۔ کہیں اس دریا کو جس کے کنارے مسجد کھڑی ہے، مخاطب کر کے مستقبل کے روشن امکانات کی امید دلاتا ہے۔ ترتیب وار ان سبھی خطابات کا اشارہ کے طور پر ایک ایک شعر پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس نظم کی اس خوبی کی خاطر خواہ وضاحت ہو سکے۔

سلسلۂ روز و شب صیرفیٔ کائنات　؛　تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ

تجھ سے حرمِ مرتبت اندلسیوں کی زمیں　؛　کعبۂ اربابِ فن، سطوتِ دینِ مبیں

وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل　؛　تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل

اسی میں یہ بات بھی مضمر ہے کہ حسن کے لیے جمال کا ہونا لازمی ہے۔ اس کی تکمیل کے لیے جلال کا ہونا بھی ازبس ضروری ہے۔ چاند خوبصورت ہے لیکن اس میں جلال نہیں۔ سورج میں یہ دونوں خصوصیات موجود ہیں۔ اس لیے وہ حسن کا مکمل نمونہ ہے۔ اسی طرح مسجد قرطبہ کے حسن کی تشکیل میں اور اسی کے ساتھ ساتھ مردِ مومن کے یہاں بھی جمال اور جلال دونوں موجود ہیں۔

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز　　اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز

اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود　　عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

تیری فضا دلفروز میری نوا سینہ سوز　　تجھ سے دلوں کا حضور مجھ سے دلوں کی کشود

کافرِ ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق شوق　　دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں　　آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

آب رواں کبیر! تیرے کنارے کوئی ؛ دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

خطاب کے ان منفرد پیرا ہائے بیان اقبال کی زبردست قدرتِ بیان اور مکالماتی لہجوں کی باآسانی تبدیلی پر روشنی پڑتی ہے جو ان کی مہارتِ فن کا بہترین ثبوت ہیں۔ خطاب کے علاوہ استفہامیہ انداز بھی کہیں کہیں اختیار کیا گیا ہے۔ اس سے جہاں خیالات کو سوال کے پیکر میں ڈھالنے کے فن سے واقفیت ہوتی ہے وہیں شاعر کے مضطرب ذہن کے جوش مار کر اٹھتے ہوئے سوالات کے پس پشت اس کی گہری بصیرت کا بھی علم ہوتا ہے

پیکر نوری کو سجدہ میسر ہے تو کیا ؛ اس کو میسر نہیں سوز و گداز سجود

کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے ؛ عشق بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا ؛ گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

بقول قاضی عبدالستار ــــــ "ہر فنکار یہ جانتا ہے کہ مجھے کیا لکھنا ہے، صرف بڑا فنکار ہی یہ جانتا ہے کہ مجھے کیا نہیں لکھنا"

اقبال نے جس سلیقہ سے الفاظ کا انتخاب کیا ہے اور بڑی سے بڑی بات کو چند لفظوں میں بیان کر دیا ہے، یہ انھیں کا کمال ہے۔ اس نظم میں فرانس۔ جرمن وغیرہ کے انقلابات کی جھلکیاں صرف ایک ایک شعر میں دکھا کر آگے بڑھ گیا ہے۔ دراصل انقلابات کی تاریخ ایک خاص مقصد اور ایک خاص نقطۂ نظر سے پیش کی ہے۔ اور وہ مقصد، وہ دلیل ہے اسلامی دنیا میں انقلاب کے امکان کی۔ اقبال نے چند انقلابات یعنی جرمن فرانس اور اٹلی کا ذکر کر کے پس منظر کا کام لے کر افسانہ کے نقطۂ عروج کی طرح بے ساختہ اپنے مقصد کو ابھارا ہے:۔

روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب ؛ رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زبان

اور پھر

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

اقبال کے سامنے تاریخ مجسم بن کر رہ گئی ہے۔ مسلمانوں کی شان وشوکت اور عروج کے زمانہ میں یہ مسجد تیار ہوئی تھی اور اس سات سو سال کے عرصہ میں اس پر کیا کیا واقعات بیتے، کیا کیا حادثات رونما ہوئے۔ یہ مسجد سب کو برداشت کر رہی ہے۔ اس کی دیواروں کے شگاف اور اینٹوں کے نکلے ہوئے دانت ایک طرف مصائب وتکالیف کو خندہ پیشانی سے قبول کرنے اور گذار دینے کی علامت کا کام دے رہے ہیں۔ دوسری طرف یہ مسجد اس دنیا کی پستیوں اور بلندیوں پر کھلکھلا کر (قہقہہ مار کر) ہنس کر اس کا مضحکہ اڑا رہی ہے غرض تاریخ کے اوراق الٹا جاتا ہے۔ وقت کو مختلف پیرائے کے بیان میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ اور چند الفاظ کے ذریعہ ہی ہمیں چلمنوں کے پیچھے سے تاریخ جھانکتی نظر آرہی ہے امیجیشکش کے لیے تفصیل وتمہید کی قطعاً ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ کم سے کم الفاظ میں اپنی بات پیش کر دینا چاہتے ہیں۔ پورا شکوہ بیان کر کے اس کے جواب کے لیے ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تاویل کے طور پر کچھ نہ کچھ تمہید ضرور ہو لیکن جواب شکوہ بھی اچانک شروع کر دیتے ہیں:-

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا

اقبال کے یہاں مقصد مقدم ہے فن کی حیثیت ثانوی ہے۔ اس کے باوجود تمام بڑی شعری خوبیاں اقبال کے یہاں نہایت کامیاب پیرایے میں بیان کی گئی ہیں، استعارے اور تشبیہیں استعمال کرتے جاتے ہیں لیکن ان میں آورد کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ ہر چیز برمحل اور چسپت رہتی ہے۔ اقبال، فن کو اس حد تک عظیم بنانے کے لیے کہ اس میں معجزہ کی شان پیدا ہو جائے اس میں خون جگر کا صرف ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر خون جگر کی سینچائی کے بعد کوئی فن وجود میں نہیں آتا تو وہ اعلیٰ درجہ کا نہیں بن سکتا۔ اسے اس نظم میں دو جگہ استعاراتی انداز میں بیان کیا ہے۔ پہلے شعر میں وہ مصوری کا استعارہ رنگ کو، تعمیر کا اینٹ وپتھر کو اور حرف وصوت (آواز) کو موسیقی کا استعارہ مان لیتے ہیں کہ فنون لطیفہ

موقر ہو ہی نہیں سکتے جب تک ان پر خون جگر صرف نہ ہو۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت ؛ معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود

دوسری جگہ بھی کچھ اسی طرح کی بات کہی ہے :-

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر ؛ نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

ذیل کے شعر میں تشبیہ و استعارے کے حسین امتزاج سے نزاکت کے ساتھ کتنی بلیغ بات کہی ہے

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات ؛ عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

ایک جگہ عشق کو کچی شراب (ٹھرّا) جس سے حقیقی معنوں میں سرمستی حاصل ہوتی ہے اس سے تشبیہ دی ہے۔

عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام

ایک اور جگہ مرد مؤمن کے یقین کو حق کی پرکار کے نقطہ (مرکز) سے تشبیہ دی ہے۔ تشبیہات کے سلسلے میں اقبال کی اس نظم کو داد دینی پڑتی ہے۔ ایسی نظم جوان کی حرکی نظم ہے اور جو عبرت کی داستان ہے۔ اس میں کئی لطیف تشبیہیں استعمال کر کے قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ روشن دن اور تاریک رات کے امتزاج سے زمانہ آگے بڑھتا جارہا ہے، یہاں اہمیت دن اور رات یعنی جزو کی نہیں کُل کی، زمانہ کی ہو جاتی ہے ٹھیک اسی طرح جیسے سفید اور کالے ریشم کے حسین امتزاج سے قبا تیار کی جائے۔ نہایت نادر، برمحل اور نازک تشبیہ ہے :-

سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ ؛ جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبا کے صفات

انسان کے سینہ کو عرش معلّٰی سے تشبیہ دے کر اس کی عظمت اور خدا سے اس کی قربت کی دلیل پیش کی ہے۔ تشبیہات بہت ہی گڑھی ہوئی اور چسپت استعمال کی ہیں، کہیں حرف شبہ ہے کہیں نہیں۔ ان تشبیہوں سے ایسی فضا آفرینی کی ہے جسے پڑھ کر دل وجد کرنے لگتا ہے اس کی نظیر ملنا مشکل ہے :-

جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اندلسی ؛ خوش دل وگرم اختلاط سادہ و روشن جبیں
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال ؛ اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں
تری بنا پائدار تیرے ستوں بے شمار ؛ شام کے صحرا میں ہوں جیسے ہجوم نخیل

شام کے وقت جب یہ نظم لکھی گئی ، جملہ معترضہ کے طور پر ایک تشبیہ کے ذریعہ اس کا سماں باندھا ہے ۔ جو آگے کہی جانے والی بات کے لیے پس منظر کا کام بھی دے رہا ہے ۔ سورج غروب ہونے کے بعد آسماں کی سرخی کو لعل بدخشاں سے تشبیہ دی ہے ۔ پھر جمود توڑ کر آنے والے انقلاب کی طرف اشارہ کیا ہے :۔

وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب ؛ لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

اقبال ایک کاما (،) کے ذریعہ ایک ہی لفظ سے پورے فقرے یا جملے کا مفہوم واضح کر دیتے ہیں ۔ یہ ان کی اختصار پسندی اور ایجاز بیانی کا بہترین ثبوت ہے ۔ مثلاً

عشق دمِ جبرئیل ، عشق دلِ مصطفیٰ ؛ عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
خاکی و نوری نہاد ، بندۂ مولا صفات ؛ ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
نرم دمِ گفتگو ، گرم دمِ جستجو ؛ رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
ساقیٔ اربابِ ذوق ، فارسِ میدان شوق ؛ بادہ ہے اس کا رحیق ، تیغ ہے اس کی اصیل

اقبال کے یہاں رمزیت ۔ ایمائی قوت خاص اہمیت رکھتی ہے ۔ وہ حسن ادا کے جادو سے انسانی ذہن کو مسحور کر لیتے ہیں ۔ ان کے یہاں الفاظ و معانی کی موزونیت ، تخیل کی رفعت ، طرزِ ادا کی شوخی و ندرت ۔ ترکیبوں کی نزاکت اور تقابل و تناسب ۔ بلاغتِ کلام ، اور ذوقِ لطافت کے ساتھ ساتھ محاسنِ کلام کو برتنے پر انھیں پوری قدرت حاصل ہے یہاں اقبال کی زبان اور ان کے تصورِ زبان پر بحث کا موقعہ نہیں تاہم اتنا ذکر نامناسب نہ ہوگا کہ وہ شاعری اور زبان کو اپنے مقصد اور پیغام پیش کرنے کا وسیلہ قرار دیتے ہیں موضوع کی تبدیلی کے ساتھ لب ولہجہ بھی بدلتا رہتا ہے ۔ الفاظ خود اچھے یا برے ، بلند تر یا

کمتر نہیں ہوتے۔ ان کے استعمال سے ان کا معیار متعین ہوتا ہے۔ اقبال نے اردو شاعری کو پرشکوہ لہجہ GRAND-STYLE عطا کیا ہے۔ جو شاعری میں صرف میر انیس کا کمال ہے۔ میر انیس کا موضوع مرثیہ تھا۔ جس رزم و بزم کے بیان کے ساتھ ساتھ تلواروں کی جھنکار، فوجوں کی گھماگھمی سے لڑائی کے مناظر پیش کئے جاتے ہیں۔ اس میں ایک جذبہ ہوتا ہے ایک جوش ہوتا ہے۔ جو تمام کیفیات سے زیادہ شدید ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسے بیان میں پرشکوہ لہجہ آ ہی جاتا ہے لیکن اقبال کا موضوع میر انیس سے مختلف ہوتے بھی شوکت الفاظ اور پرشکوہ اندازِ بیان میں ان کے قریب پہنچ گیا ہے۔ جواب شکوہ کی طرح مسجد قرطبہ کا اندازِ بیان بھی یہی ہے۔ لہجہ کے علاوہ، اور نئی نئی تشبیہات کے استعمال کے علاوہ مثال کے طور پر اقبال نے اردو شعراء میں زندگی، کے لیے سب سے زیادہ تشبیہیں و استعارے استعمال کئے ہیں۔ اس کے علاوہ بے انتہا نئی نئی ترکیبیں اردو کو عطا کیں۔ مثلاً مسجد قرطبہ سے ہی چند ترکیبوں سے ان کی زبردست صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

سلسلۂ روز و شب۔ نقش گرِ حادثات۔ تار حریر و درنگ۔ زیر و بم ممکنات۔ صیرفیٔ کائنات۔ پیکر گل۔ کاس الکرام۔ عشق کے مضراب۔ نغمۂ تار حیات۔ ساقی اربابِ ذوق۔ فارس میدانِ شوق۔ نقطۂ پرکار حق۔ عصمت پیر کنشت۔ کشتی نازک رواں۔ کشتی، دل۔ گنبد نیلوفری۔ چہرۂ افکار وغیرہ۔

اس نظم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ بعض جگہ اس میں روانی کا دریا بہہ گیا ہے۔ مثلاً:-

اس کا سرور اس کا شوق اس کا ناز اس کا نیاز

مسجد قرطبہ حسنِ تعمیر کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں زمان و مکان کا فلسفہ اور عشق کا تصور سبھی کچھ آگیا ہے۔ یہ ان کی حرکی نظم ہے۔ یہ ایک علامت ہے۔ فن کو سمجھنے کے لیے علامتوں کا یاد رکھنا ضروری ہے۔ وہ تمہید بیان کرنے کے عادی نہیں ہیں جو مقصد ہے اسے اچانک پیش کر دیتے ہیں نظم نہایت چست اور (COMPECT) ہے۔

اس میں ایک شعر بلکہ ایک لفظ بھی بھرتی کا نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جو الفاظ اس میں استعمال کئے گئے ہیں ان کی تخلیق ہی اس کے لیے ہوئی تھی اس نظم کو پڑھنا (READING) آسان نہیں ہے۔ اس کی موسیقی عجیب و غریب ہے۔ یہ رجز کے انداز میں لکھی ہوئی ہے۔ اسلیے اس میں رجز کی موسیقی ہے۔ اس کو اگر رات کی تنہائی میں پڑھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان دنیا سے بہت بلند ترین مقام پر کھڑا ہو کر دنیا کے نشیب و فراز کا جائزہ لے رہا ہے۔ اس میں سمندر سے زیادہ مد و جزر ہے۔ آٹھ بندوں کی یہ نظم ہر نئے بند سے قصیدے کے مطلع کی طرح جوش و خروش سے آگے بڑھتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑوں کی فوج قریب میں آگئی ہے اور ان کے ٹاپوں کی آواز کانوں کو پھاڑنا چاہتی ہے۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی پرشور دریا کے کنارے کھڑے ہیں۔ غرض اس کی موسیقی بے مثال ہے۔ اس نظم میں شیرینی اور سلاست نہیں ہے بلکہ کھدراپن ہے۔ یہ اس کا عیب نہیں، خوبی ہے۔ خوبی اس لیے کہ اس نظم کی تعمیر میں مسجد تعمیر ہوتی نظر آرہی ہے۔ جو اس کی نشو و نما میں اضافہ کررہی ہے پوری نظم جہاں ایک طرف بھرپور مقصد کی حامل ہے، فنی اعتبار سے بھی اقبال کی بہترین اور مکمل ترین نظم ہے۔ اس میں ان کا پورا فن سمٹ آیا ہے۔ اسی لیے کہنا پڑتا ہے کہ اقبال اگر صرف یہی نظم بھی لکھتے تب بھی ان کا شمار بڑے شعرا میں ہوتا ٭٭٭٭

ضروری گذارش

ادارہ ندوۃ المصنفین کی ممبری یا برہان کی خریداری وغیرہ کے سلسلے میں جب آپ دفتر کو خط لکھیں یا منی آرڈر ارسال فرمائیں تو اپنا پتہ تحریر کرنے کے ساتھ ساتھ برہان کی چٹ پر آپ کے نام کے ساتھ درج شدہ نمبر بھی ضرور تحریر فرمائیں۔

شہزادہ فیروز شاہ

بدر الزماں نیپالی

شہزادہ فیروز شاہ کے بارے میں، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء پر لکھی گئی ہر کتاب کے اندر کچھ نہ کچھ معلومات فراہم کی گئی ہے لیکن خدا جھوٹ نہ بلوائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا غلام رسول مہر کے علاوہ شاید کسی نے بھی بہتر معلومات نہیں حاصل کی ہیں، گو مہر صاحب نے بھی جو کچھ بتایا ہے اس میں اضافہ کی گنجائش ہے۔

شہزادہ کب اور کہاں پیدا ہوا اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے اگرچہ قیاس آرائیوں کے ذریعہ جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے البتہ اس کی وفات، اور وفات کے وقت اس کی جائے رہائش کے بارے میں تمام تذکرہ نگاروں اور جنگ آزادی پر قلم اٹھانے والوں نے کچھ نہ کچھ لکھا ہے لیکن بد قسمتی سے سب کی تصریحات باہم متضاد ہیں یا علی الاقل ان میں سے کوئی بھی بیان قابل قبول نظر نہیں آتا۔ میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں جو کچھ پیش کر رہا ہوں حرف بہ حرف صحیح ہے لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اس کی وفات اور سکونت داقامت کے سلسلے میں تمام روایات کے اندر تطبیق کی صورت نکالی گئی ہے یا کم سے کم ایک، اور روایت کا اضافہ کیا گیا ہے جو بہت حد تک قابل قبول ہے۔

شہزادے کی ابتدائی زندگی کے بارے میں مہر صاحب کے استدلالات بہت حد تک معقول ہیں اس لئے ایک لمبا اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔

"اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ شہزادہ فیروز شاہ مغلوں کے شاہی خاندان کا ایک معزز رکن تھا لیکن اس کے نسب کا معاملہ ذرا تشریح طلب ہے قیصر التواریخ کا بیان ہے

کہ شہزادہ فیروز شاہ میرزا ناظم بخت کا بیٹا تھا اور فرخ سیر کا نواسہ تھا (۱) مفتی انتظام اللہ فرماتے ہیں کہ ناظم بخت شاہ عالم ثانی کا فرزند تھا (۲) مجھے شاہ عالم ثانی کی پوری اولاد کا نقشہ بہ قید تاریخ ولادت نہ مل سکا البتہ یہ معلوم ہے کہ شاہ عالم کا بڑا بیٹا میرزا جواں بخت تھا جو ابتدا میں ولیعہد ہوا اس کی وفات پر دوسرے بیٹے کو ولیعہد بنایا گیا جو معین الدین اکبر شاہ ثانی کے لقب سے ۱۸۰۶ء میں مسند نشین ہوا اکبر شاہ کی تاریخ ولادت ۱۷۵۵ء ہے اس سے ناظم بہرحال چھوٹا ہوگا۔ اب سوچئے کہ فرخ سیر کی وفات ۱۷۱۹ء میں ہوئی اگر اس کی کوئی بیٹی ۱۷۱۹ء میں بھی پیدا ہوئی تو وہ ناظم بخت کی ولادت تک بہت بوڑھی ہو چکی ہوگی لہذا محولہ بالا بیان قابل قبول نہیں ہاں یہ مان سکتے ہیں کہ شہزادہ فیروز شاہ کا رشتہ والد اور والدہ دونوں جانب سے بہادر شاہ اول ابن عالمگیر اعظم سے ملتا تھا۔ والد کی جانب سے شاہ عالم ثانی، عالمگیر ثانی اور جہاندار شاہ کے واسطے سے والدہ فرخ سیر کی کسی بیٹی کی اولاد میں سے ہوگی۔ خود فرخ سیر عظیم الشان ابن بہادر شاہ اول کا بیٹا تھا۔

تاریخ پیدائش کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ جنگ آزادی کے وقت شہزادہ فیروز شاہ نے خوب سرگرمی دکھائی اور اس کی عمر زیادہ سے زیادہ چالیس اور پچاس کے درمیان ہونی چاہئے۔ بعض روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ وہ ۱۸۹۵ء تک زندہ تھا بلکہ میرے پاس تو ایک ایسی روایت بھی موجود ہے جس میں ۱۹۱۶ء تک اس کا زندہ ہونا بتایا گیا ہے (۳) جبوا صاحب سے شہزادہ ملا سنفان کا بیان ہے کہ عمر ستر اور اسی کے درمیان ہوگی اس وجہ سے سمجھنا چاہئیے کہ شہزادہ کی ولادت ۱۸۲۰ء اور ۱۸۳۰ء کے درمیان ہوگی۔ بے شک یہ محض قیاس ہے لیکن اس کی بنیادیں خاصی معقول ہیں۔ . . . .

شہزادے کے متعلق بتایا گیا ہے کہ والد نے علوم مروجہ اسے بخوبی سکھا دیئے تھے اور فنون حرب کی مشق بھی اس قدر کرادی تھی کہ وہ تمام فنوں میں ماہر ہو گیا تھا۔ یہ چیزیں اس عہد کی تعلیم و تربیت میں شامل تھیں اور شہزادوں کے تعلق میں تو ان کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔

بعد میں شہزادے نے جس گرمجوشی سے جہاد آزادی میں حصہ لیا اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا طریقِ زندگی وقت کے عام شہزادوں کے خلاف خاصا زاہدانہ اور جفاکشانہ تھا۔ اگر وہ بھی دوسرے شہزادوں جیسا ہوتا تو چپ چاپ کہیں بیٹھا ہوتا یا کسی لڑائی میں حصہ لیتا تو جوشِ ہمت اور استقامت کے وہ ثبوت پیش نہ کرتا جن کی تفصیل آپ آئندہ اوراق میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

مفتی انتظام اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی طبیعت کا رجحان مذہب کی طرف زیادہ تھا۔ شب و روز اوراد و وظائف کا مشغلہ رہتا تھا۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ شہزادے نے بالاہتمام حج کیا اور اس زمانے میں حج کے لئے اتنی سہولتیں میسر نہ تھیں جتنی کہ ہمارے عہد میں میسر ہیں۔

"بیان کیا جاتا ہے کہ شہزادہ ۱۸۵۶ء میں حج کے لئے گیا اور اس سال اس نے حج کیا جو ۱۱ اگست ۱۸۵۶ء کو ہوا تھا پھر غالباً مدینہ منورہ کی زیارت کرتا ہوا ۱۸۵۷ء میں ہندوستان آیا اور وہ وسط اگست ۱۸۵۷ء میں گیرو دمپورنچا جو مندسور کے قریب ایک مقام ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ شہزادہ سورت سے جہاز پر سوار ہوا تھا اور اسی بندرگاہ پر واپس آیا" (مہر)

مہر صاحب "غدر ہند کا ایک بھولا ہوا باب" نامی کتاب سے آگے نقل کرتے ہیں جسے ریاست میواڑ کے اندر ریزیڈنٹ کے طور پر مامور لفٹننٹ جنرل شاورز نے لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "وسط اگست میں مالوہ کے اندر سرکشی نے خاصی خطرناک صورت اختیار کرلی تھی اس کی سالاری کا منصب فیروز شاہ نام ایک مذہب دوست اور مجاہد شہزادے نے سنبھال لیا۔ مندسور کے مسلمانوں نے دوسرے طبقوں کو ساتھ ملا کر ریاست گوالیار کی حکومت ختم کردی۔ اور شہزادے کی حکمرانی کا اعلان کردیا۔ وہاں بہت سے میواتی، مکرانی اور افغانی موجود تھے، وہ ساتھ ہو گئے۔ مندسور کا حاکم اور کوتوال زخمی ہوئے۔ ایک افسر مارا گیا پھر حاکم کے محل پر حملہ ہوا،، وغیرہ وغیرہ۔

آگے لکھتے ہیں "میرا اندازہ ہے کہ شہزادہ جلد سے جلد دہلی پہونچنا چاہتا تھا تاکہ اس مرکز کو تقویت پہونچائی جائے جس پر باقی سمتوں میں جنگ جاری رکھنے کا انحصار تھا۔ قیصر التواریخ کا بیان ہے کہ شہزادہ گوالیار سے دھول پور پہنچا اور وہاں کے تحصیلدار سے ایک لاکھ روپیہ لیا مگر وہاں دہلی کے فتح ہوجانے کی خبر سنی تو آگرہ کا رخ کیا، ایک روز آگرہ کا محاصرہ بھی جاری رکھا بعد ازاں میوات چلا گیا وہاں سے شیخ فضل الٰہی رسالدار اور جنرل عبدالصمد خاں کو ساتھ لے کر فرخ آباد اور شاہجہاں پور ہوتا ہوا لکھنؤ پہونچ گیا" (۵)

شاورز کے بیان سے ظاہر ہے کہ شہزادہ فیروز شاہ نے رخ سے واپس ہندوستان پہونچتے ہی مجاہدین آزادی کی قیادت مالوہ کے اندر سنبھال لی تھی اس کے بعد وہ مختلف معرکوں میں حصہ لیتا رہا لیکن سب سے اہم جگہ دہلی پہونچکر وہاں مجاہدین کا ساتھ دینا ضروری تھا تاکہ دہلی جیسے مرکزی مقام پر انگریزوں کا تسلط نہ ہوسکے چنانچہ قیصر التواریخ کی تصریح کے مطابق اس نے دہلی کا رخ کیا لیکن دہلی کے مفتوح ہونے کی خبر پاکر آگرہ کا محاصرہ کیا پھر میوات چلا گیا۔

یہی وہ وقت ہے جب شہزادہ کو میوات سے ایک خاص تعلق ہوا اور تاحین حیات برقرار رہا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شہزادہ دہلی فتح ہونے کے بعد میوات آیا اور کچھ وقت یہاں ٹھہر کر اس نے اپنی ایک مستقل قرارگاہ بنائی اور پھر لکھنؤ وغیرہ کی طرف روانہ ہوا اب اس نے میوات کو اپنے محفوظ گھر کی طرح استعمال کرنا شروع کردیا چنانچہ خطرات کے وقت وہ اس خاموش اور مطمئن جگہ میں آپہونچتا اور خطرات ٹل جانے پر پھر مہم پر چلا جاتا تھا۔

قیصر التواریخ میں تو صرف میوات جانے کا ذکر ہے اب میوات جانے کی تفصیل آپ کے سامنے رکھی جاتی ہے۔ سید احمد شہید کے مجاہد ساتھیوں میں سے ایک کا نام ڈاکٹر منذر محمد ہے ان سے حکیم عبدالشکور شکراوی میواتی نے میوات کے مجاہدین کے بارے میں ایک بیان نقل کیا ہے اس میں کافی معلومات فراہم کی گئی ہیں اس لئے اسے بعینہ نقل کیا جاتا ہے۔

" غالباً جولائی ۱۸۵۸ء (۶) کی بات ہے چار اشخاص میرے پاس پہونچے جن کے خوبصورت

چہرے کملائے ہوئے تھے مگر ایمانی جلالت شانی ان کی زبانوں سے مجھے محسوس ہو رہی تھی، تھوڑی دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے اور پھر کھانے اور پانی سے فارغ ہو کر میں نے انھیں اپنے مکان میں آرام کرنے کے لئے کہا، تھوڑی دیر آرام بھی انھوں نے کیا مگر ایک شخص ان میں سے کبھی کراہتے تھے، میں نے ان کی کراہت (؟) سن کر ان سے کہا کہ آپ کو کیا تکلیف ہے انھوں نے مجھے بتایا کہ میرے پیر میں بندوق کی گولی لگی ہے ہر چند اس کو نکالنے کی کوشش کی گئی مگر ناکامی رہی میں نے کہا ذرا دکھاؤ انھوں نے مجھے دکھایا ان کے پیر میں گولی پھنسی ہوئی تھی، مجھ سے نکالنے کو کہا میں نے آلات جراحی کے ذریعہ اس کو نکال لیا وہ اس قدر مضبوط دل کے آدمی تھے کہ عمل جراحی کرنے پر انھوں نے آہ بھی نہ کی۔ میں نے خراب ساختوں کو نکال کر ان کی مرہم پٹی کر دی اور ان پانچوں (غلط ہے صحیح چاروں ہے) کو بادشاہ پور کے شمال کی طرف دو فرلانگ کے فاصلے پر جو گنبد ہے اس میں ٹھہرا دیا وہ کئی دن تک ٹھہرے رہے میں ان کو رات میں کھانا پہونچا دیا کرتا تھا یہ وہ زمانہ تھا جبکہ انگریزوں کو دہلی پر تغلب (غلبہ) حاصل ہو گیا تھا اور باغیوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو چکی تھی ایک دن صبح کو جو میں بازار میں نکلا تو چند آدمی یہ گفتگو کر رہے تھے کہ "گنبد میں کچھ آدمی ٹھہرے ہوئے ہیں دن میں اندر رہتے ہیں گاہے گاہے اکے دکے پیشاب پاخانہ کو بھی آتے جاتے دیکھا گیا ہے" میں سمجھ گیا کہ اب ان لوگوں کا راز فاش ہو چکا ہے ان کو گنبد میں رکھنا مناسب نہیں چنانچہ اسی رات کو میں ان حضرات کے پاس پہونچا اور افشائے راز کا واقعہ جس طرح میں نے سنا تھا ان کے سامنے بیان کر دیا۔ یہ لوگ رات ہی کو میوات کی طرف چلے گئے۔ ان میں سے میں دو آدمیوں کو پہچانتا تھا باقی دو کو بعد میں بھی نہ پہچان سکا پہلے بزرگ تو وہی ہیں جن کے پیر سے میں نے گولی نکال کر مرہم پٹی کی تھی اور وہ مولوی محمد مرید تھے جو فیروز پور جھرکہ میں مقیم ہو گئے تھے۔ دوسرے مولوی نور علی تھے جو ریواڑی میں مقیم ہو گئے تھے اور میوات کو ان سے بڑا فیض پہونچا۔

اس بیان کے بعد حکیم صاحب لکھتے ہیں "ڈاکٹر صاحب کے اس بیان سے مجھے جستجو ہوئی کہ

وہ دو حضرات کون بزرگ تھے جو مولوی نور علی اور مولوی محمد مرید صاحبان کے ساتھ تھے۔

میں نے میوات میں ان آدمیوں کی تلاش شروع کی تو معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک بزرگ تو وہ تھے جو موضع کھیتی کی ریاست الور (؟) میں خوانی خاں کے یہاں مقیم تھے اور عام لوگ اس مجاہد کو حضور کہا کرتے تھے۔ دوسرے بزرگ وہ ہیں جو اہل میوات کے لئے ایک عرصے تک عجوبہ بنے رہے جو بہت بڑے سیاح اور صوفی و عالم بھی تھے، جو موضع بھونری میں تقریباً چالیس سال تک مقیم رہے اور جو میوات کے نواح میں مولوی ابو الحسن کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔"

مذکورۃ الصدر روایت میں جس چوتھے آدمی کا ذکر ہوا ہے۔ اس کے بارے میں خط کشید عبارت کو غور سے پڑھیئے اور "عجوبہ بنے رہے" اور "ابو الحسن کے نام سے مشہور ہو گئے" پر گہری نظر ڈالئے۔ پھر فیروز اور ابو الحسن کے حالات کا مستقل الوجوہ مطالعہ کیجئے۔

شہزادہ فیروز کے بارے میں تمام تذکرہ نگاروں اور جنگ کی تاریخ لکھنے والوں کا اتفاق ہے کہ وہ کسی ایک جگہ پر مورچہ بند نہیں ہوا تھا بلکہ اس نے جگہ جگہ مورچے قائم کئے۔ لڑائیاں کیں، کئی جگہوں پر اسے فتح ہوئی اور کئی جگہوں پر شکست۔ اور جب جب اس کا پیچھا کیا گیا، اس پر چھاپے مارے گئے وہ کسی کے ہاتھ نہیں آیا بلکہ غائب ہو گیا اور پھر چند ہی دنوں میں دوسری جگہ جا کر نمودار ہوا اس طرح اس نے ایک وقت تک انگریزوں کو پریشان رکھا اور ایک مرتبہ بھی ہاتھ نہیں آیا۔

میوات کے کئی بزرگوں نے اپنے بزرگوں سے یہ سن رکھا ہے کہ بھونری کے ابو الحسن کسی طرف سے آگئے لوگوں سے مجذوبانہ اور درویشانہ انداز میں پیش آتے، تعویذ لکھتے اور دیکھتے دیکھتے چند ہی دنوں میں سیر و سیاحت کے لئے ایک لمبی مدت کے لئے نکل جاتے جب وہ بھونری میں رہتے تھے تو دہلی اور آگرہ کے بہت سے لوگ ان سے ملنے کے لئے آتے تھے، لیکن اس ملاقات کی نوعیت کیا ہوتی تھی میواتیوں کو اس کی کوئی اطلاع نہیں کیونکہ ان کے محسن نمبردار نے انھیں ایک کمرہ دے رکھا تھا جو ان کے لئے مخصوص تھا کوئی اس میں نہیں جاتا تھا اگر کوئی شخص دعا و تعویذ وغیرہ کے لئے وہاں جاتا یا ان کے حکم کی ذرہ برابر خلاف ورزی کرتا تھا تو وہ اسے اپنے ڈنڈے سے پیٹ دیا کرتے تھے۔

اور مارنے میں کچھ بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔

اب اگر دینی علم رکھنے والے مجاہد شہزادے کے بارے میں کہا جائے کہ وہ پناہ کے لئے میوات کے اس گاؤں کا انتخاب کر چکا تھا جہاں اس نے اپنے آپ کو مولوی ابوالحسن کے نام سے شہرت دے رکھی تھی تاکہ کسی جگہ سے یہاں پہونچنے پر وہ اجنبی نہ رہ جائے اور انگریزوں کی گرفت سے بچا رہے تو کوئی تعجب خیز بات نہیں کیونکہ میوات کے جاہل عوام سیاست سے کافی دور تھے انگریزوں میں گھلے ملے ایک مجذوب فقیر اور تعویز لکھنے والے مولوی کے بارے میں یہ شبہ بھی نہیں کر سکتے تھے کہ فیروز شاہ جیسا زیرک سیاسی قائد ایسا ہو سکتا ہے۔ اس طرح شہزادے نے اپنی ایک پناہ گاہ تیار کر لی تھی۔

ابوالحسن نے پوری زندگی اپنے آپ کو مبہم رکھا اور عوام کے سامنے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں کون ہوں، میرا اصلی وطن کہاں ہے، میرا مشغلہ کیا رہا ہے اور اس وقت میں کیا کرتا ہوں؟ یہی وجہ تھی کہ اپنے حجرے میں داخل ہونے والوں کو وہ مار کر نکال دیتے تھے۔ کیا عجب کہ وہ اپنے کمرے میں کچھ مشتبہ چیزیں رکھتے رہے ہوں جس سے لوگوں کو ان کے بارے کسی طرح کا شبہ ہوتا۔ اور شہزادہ فیروز شاہ کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ آزادی وطن سے سرشار ایک مجاہد اور سپہ سالار تھا اسے تمام لوگوں سے اپنے آپ کو کس طرح چھپا کر رکھنا تھا وہ خوب جانتا تھا جبھی تو وہ انگریزوں کے ہاتھ کبھی نہ آیا۔

فیروز شاہ شہزادہ تھا اس کی وجاہت، رعب وداب اور شان وشوکت کا کیا پوچھنا۔ ابوالحسن کو دیکھنے والے بزرگوں کا تاثر مجھے اس طرح بتایا گیا ہے کہ ابوالحسن کو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی شہزادہ ہے۔ یہ چیز تو ان کی شہزادگی کو اور موکد دیتی ہے کہ دہلی کے جوہری ہیروں کی شناخت کے سلسلے میں بھونری آنے اور ابوالحسن سے پہچان کراتے تھے۔ بھلا کسی میواتی مولوی اور وہ بھی مجذوب فقیر کو ہیروں سے کیا واسطہ یہ تو جوہری کی چیز ہے یا پھر شاہ کی۔

ع قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری

شہزادے کے بارے میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ عام شہزادوں کی طرح وہ نہیں تھا بلکہ دین کا زبردست علم رکھتا تھا، بہت سے شعبوں کے اندر اسکو کامل دستگاہ تھی وہ ابتداءً حج کے لئے پھر جنگ کے سلسلے

ہیں اور پھر وطن کی آزادی کے امکانات تلاش کرنے یا اپنی جان بچانے کے لئے ایک زمانے تک کسی ایک جگہ نہیں بیٹھا اور برابر چلتا پھرتا رہا۔ اس شخصیت کا موازنہ ابوالحسن سے کیجئے اس کے بارے میں ان کو دیکھنے والے کا بیان ہے۔ "مولانا ابوالحسن کوئی معمولی پڑھے لکھے آدمی نہیں تھے بلکہ جملہ علوم وفنون کے بڑے بھاری جید عالم تھے۔ فن مناظرہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ دینی تبلیغ کا بے پناہ جوش رکھتے تھے۔ انھوں نے تبلیغ کے سلسلے میں سارے ہندوستان کا سفر بھی کیا تھا علم کیمیا کے بارے میں بھی عام شہرت تھی کہ وہ علم کیمیا جانتے تھے۔" (۸)

دوسری جگہ ڈاکٹر نذر محمد کے مندرجہ بالا بیان پر استدراک کرتے ہوئے لکھتے ہیں "دوسرے بزرگ وہ ہیں جو اہل میوات کے لئے ایک عرصے تک بجو بہ بنے رہے جو بہت بڑے سیاح اور محقق و عالم بھی تھے جو موضع سیوڑی میں تقریباً چالیس سال تک مقیم رہے اور ...... میوات کے نواح میں مولوی ابوالحسن کے نام سے مشہور ہو گئے تھے (۹)

ان بیانات کو سامنے رکھئے پھر دیکھئے کہ فیروز شاہ کی وفات اور ان کی آخری زندگی کے بارے میں لوگوں کے بیانات میں کتنا اختلاف ہے۔ جس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اس کی آخری زندگی ہنوز پردۂ خفا میں ہے۔ صحیح صورت حال کی اطلاع اگر ہوتی تو لوگوں کے بیانات میں اختلاف ہرگز نہ ہوتا۔ اگر کچھ لوگوں نے غلطی کی ہوتی تو صحیح علم رکھنے والے کھل کر تردید کرتے حالانکہ کھل کر کوئی کسی کی بات کو غلط نہیں بتا رہا ہے اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کے پاس سنی سنائی باتیں اور قیاس آرائیاں ہیں ہاں جن کے پاس کوئی دلیل موجود تھی اس نے بہت حد تک ریمارک کیا ہے چنانچہ آپ آگے ملاحظہ فرمائیں گے پہلے لوگوں کے بیانات مختصر انقل کیے جاتے ہیں۔ مہر صاحب نقل کرتے ہیں۔

پہلا بیان۔ "پھر وہ زائروں کا بھیس بدل کر کربلا چلا گیا اور ۱۸۷۹ء تک وہیں تھا۔"

دوسرا بیان۔ "حیدر آباد سندھ ہوتے ہوئے شہزادہ کابل گیا وہاں سے ایران و روس ہو کر حجاز پہونچ گیا مکہ معظمہ میں اقامت اختیار کرلی جہاں مولانا رحمت اللہ کیرانوی، حاجی امداد اللہ تھانوی،

شاہ عبدالغنی دہلوی، مولانا یعقوب دہلوی مولانا شاہ اسحاق دہلوی، مولانا محمد مظہر مجددی ہدایت و اصلاح کی غرض سے ایک جماعت بنائے بیٹھے تھے نواب فیض احمد خاں رئیس وناولی، مولوی واعظ الحق بہاری، حکیم نوازش حسین بہاری، اور شہزادہ فیروز شاہ بھی اسی جماعت کے رکن ہو گئے ایک ترکی خاتون سے نکاح کر لیا تھا صرف دو لڑکیاں یادگار چھوڑیں ۱۸۹۶ء کے بعد انتقال ہوا ان کی ایک ہمشیرہ کلثوم زمانی بیگم فقیرانہ لباس اختیار کر کے میرٹھ چلی گئیں اور باقی عمر نواب ممتاز علی خاں نبیرہ نواب تیر اندیش خاں کے یہاں بسر کر دی، بھائی کے لئے دعائیں کرتی رہتی تھیں،، (۱۱)

تیسرا بیان۔ "قیصر التواریخ میں مرقوم ہے کہ کئی برس جے پور کے جنگلوں، بیکانیر یا دامن کہسار دکن میں سرگرداں رہا، وہاں قوم بھیل بھی شریک ہو گئی۔ آخر کار اٹک دریا اتر کر کابل سے داخل ملک ایران ہوا وہاں سے رہبر پاکر روس چلا گیا" کہتے ہیں کہ وہاں اپنی جماعت کے ساتھ بخوبی زندگی بسر کرتے ہیں وہاں کی سلطنت سے بجہت ناموری کچھ کفالت ہوتی ہے" (۱۲)

چوتھا بیان: ...... "یہ سید احمد شہید کی جماعت مجاہدین کے متعلق ذخیرۂ معلومات سے ماخوذ ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شہزادہ فیروز شاہ اپریل ۱۸۶۲ء میں جماعت مجاہدین کے امیر مولانا عبداللہ سے باج کٹھ (علاقہ بونیر سرحد آزاد) میں ملا تھا اور کچھ مدت وہاں قیام پذیر بھی رہا۔"

پانچواں بیان۔ "میرے عزیز دوست اولاد علی شاہ گیلانی (ادارہ دائرۃ المعارف) نے بتایا کہ میں ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۹ء میں زیر تعلیم تھا ایک روز اپنے مکان کے اس کمرے میں بیٹھا تھا جو میرا دارالمطالعہ تھا اور بازار میں اس کا دروازہ کھلتا تھا۔ ایک بوڑھے بزرگ نے اس کا دروازہ کھولا ان کی آنکھوں میں ایسی کشش تھی کہ میں نے اعزاز سے انھیں اندر بلایا اور وہ دو روز اسی کمرے میں میرے پاس رہے انھوں نے بتایا کہ میں فیروز شاہ ہوں، کئی مرتبہ آیا ہوں۔ اب مجھ میں بہت زیادہ سکت باقی نہیں رہی اور ملک کے حالات میں بھی کوئی امید افزا جھلک نظر نہیں آتی صرف ایک جماعت مجاہدین میں ہمت ہے اور وہ جانداری دکھائی دیتی ہے شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے ڈر ضرور لگ رہا تھا کہ شہزادہ بہت بڑا سیاسی آدمی ہے مبادا اس کی وجہ سے کوئی آفت نازل

ہو جائے تاہم انھیں دیکھتا تھا تو بے اختیار عزت کرنے کو جی چاہتا تھا میں نے خود ان سے کچھ نہ پوچھا اور نہ اتنی سمجھ تھی کہ پوچھتا، جو کچھ وہ بتاتے رہے وہی سنتا رہا تاہم پچاس سال گذر جانے کے باوجود اس عجیب و غریب شخصیت سے ملاقات کے نقوش حافظے میں بالکل تازہ ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ واقعی فیروز شاہ تھے یا کوئی اور بزرگ تھے۔" (۱۳)

چھٹا بیان۔ مولانا محمد میاں صاحب ٹائمس آف کراچی کے حوالے سے لکھتے ہیں "شہزادہ فیروز شاہ کا انتقال نہایت غربت و عسرت میں مکہ معظمہ میں ۱۸۷۷ء میں ہوا۔" (۱۴)

ساتواں بیان محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں " بریلی کی جنگ کا خونریز معرکہ ختم ہوا تو ...... فیروز شاہ کچھ دنوں ادھر ادھر بھٹک بھٹکا کر خوش قسمتی یا ہوشیاری سے بچ نکلا اور مکے چلا گیا، کہتے ہیں کہ وہیں باقی زندگی فقیرانہ حالت میں گذار کر دنیا کو رخصت کیا۔" (۱۵)

آٹھواں بیان۔ خورشید مصطفیٰ رضوی کا بیان ہے کہ "۱۸۶۰ء میں شہزادہ قندھار میں تھا اور اس کے بعد ۱۸۶۱ء میں وہ بخارا کی طرف بڑھ رہا تھا...... ۱۸۶۲ء میں وہ وہاں سے پیچھے کو واپس ہوا اور طہران کا رخ کیا.... شہزادہ اگلے چند سال ہرات اور بخارا کے درمیان سفر کر رہا تھا ۱۸۶۵ء میں وہ خطرناک پوزیشن میں آ گیا یعنی ہندوستان کی سرحد پر وادی صوات میں کہا جاتا ہے کہ یہاں وہ سید احمد شہید کی جماعت کے رہنما مولانا عبداللہ سے بھی ملا اور اس کے بعد کابل چلا گیا..... امیر افغانستان نے اسے بدخشاں جانے پر مجبور کیا شہزادہ یہاں بھی زیادہ دیر نہ ٹھیرا اور اس کے بعد سمرقند میں دیکھا گیا...... اکتوبر ۱۸۷۵ء میں قسطنطنیہ میں تھا جہاں اکثر آزادی پسند ہندوستانی مسلمان جمع ہو گئے تھے۔ ۱۸۷۵ء میں وہاں عام طور پر یہ خیال تھا کہ وہ مکہ چلا گیا لیکن غلط تھا چنانچہ ایک انگریز جاسوس نہر طے نے جولائی ۱۸۷۵ء میں لکھا "میرے خبر رساں شخص کو سلطان ابراہیم کے ذریعہ فیروز شاہ سے ملایا گیا اور وہ اس کے پاس کچھ دیر بیٹھا وہ بیان کرتا ہے کہ شہزادہ بظاہر نہایت خستہ حالی اور درماندہ نظر آتا ہے وہ تقریباً نابینا ہو چکا ہے اس کی صرف ایک آنکھ باقی ہے اور وہ لنگڑا بھی ہے۔" (۱۶)

رضوی صاحب نے ۱۸۸۸ء میں شہزادہ کے مکہ جانے کی تغلیط کی ہے اور اپنے موقف کے اثبات میں دلیل بھی پیش کی ہے لیکن نہ جانے پھر انھوں نے کیوں اپنے قول کی خود ہی تردید کردی چنانچہ مذکورہ بالا بیان کے بعد لکھتے ہیں "جون ۱۸۸۸ء میں شہزادہ مکہ معظمہ چلا گیا اور بالآخر اسی

مقدس سرزمین پر ۲۷ دسمبر ۱۸۸۸ء کو ہمیشہ کے لئے سو گیا" (۱۷)

بہرحال رضوی صاحب کا بھی ایک بیان ہے جس میں وہ شہزادے کو بہت سے ممالک کی سیر کرتا دکھا کر آخر میں مکہ معظمہ پہونچاتے اور ۱۸۸۷ء میں اس کے وصال کی خبر دیتے ہیں۔ جبکہ مولانا محمد میاں صاحب مکہ میں ۱۸۸۸ء میں اس کے فوت ہونے کی اطلاع دیتے ہیں اور مفتی انتظام اللہ شہابی اسے مکہ کے اندر ۱۹۰۵ء تک زندہ بتاتے اور اس کے بعد انتقال کی خبر دیتے ہیں لیکن اس کے برخلاف مولانا غلام رسول مہر ایک چشم دید گواہ ۱۹۰۵ء کے لئے پیش کرتے کہ فیروز شاہ اس وقت تک حیات تھا۔

خیال ہے کہ جن لوگوں نے فیروز شاہ کے مکہ معظمہ میں فوت ہونے کی اطلاع دی ہے ان میں سے ہر ایک کی حقیقت مہر صاحب کے دوست اولاد علی شاہ گیلانی کے بیان سے واضح ہو جاتی ہے اور ہم نے جو موازنہ فیروز شاہ اور ابوالحسن کا کیا ہے یہ اس کی تائید کرتا ہے اس طرح اب ہم ایک اور بیان کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔

نواں بیان۔ یہ بیان مندرجہ بالا بیانات کی روشنی میں میواتی علماء کی تحریری اور زبانی یادداشتوں سے ماخوذ ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ شہزادہ غیر ممالک کے سفر سے واپس آیا اور تقریباً چالیس سال تک میوات میں مقیم رہا اب اسے شاید کسی قدر مایوسی ہو چلی تھی اس لئے اس نے دوڑ دھوپ میں کمی کردی اور مذہبی زندگی گذارنے لگا اس کی مذہبی زندگی بھی کتاب و سنت کی پیروی کی زندگی تھی۔ اس نے مولوی محمود الحسن دیوبندی سے ایک بار مناظرہ کرنے کے لئے فیروزپور جھرکہ میں بھی حاضری دی اس وقت آپ اسے اچھی طرح جانتے اور اسے ایک عالم سمجھتے تھے اس کی علمی زندگی قابل رشک تھی لیکن اس نے اپنے آپ کو کبھی کسی آدمی پر ظاہر نہیں ہونے دیا کیونکہ اسے کچھ سکون سے رہنا تھا اور اب وہ سیاست سے بیزار ہو کر مذہبی آدمی بن چکا تھا اس کی وفات موضع بھونری ضلع بھرتپور میوات میں ۱۹۳۱ء سے

۱۹۳۴ء تک میں کسی وقت ہوئی وفات کے وقت اس کی عمر سو سال سے کچھ متجاوز تھی۔(۱۸)

حوالہ جات

(۱) قیصر التواریخ ۲/۲۶۵ (۲) غدر کے چند علماء ص ۱۳۳

(۳) بلکہ ہم اسے ۱۹۳۰ء تک زندہ پاتے ہیں بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔

(۴) ۱۸۵۷ء کے مجاہد ص ۱۲۰ و ۱۲۱ (۵) قیصر التواریخ ۲/۲۶۵ بحوالہ ۱۸۵۷ء کے مجاہد

(۶) گذر چکا ہے کہ وسط اگست میں شہزادہ مالوہ میں تھا۔ اس لئے جولائی کے بجائے اگست کے بعد کا مہینہ اگر مان لیا جائے تو زنجیر کی ایک کڑی دوسری کڑی سے مل سکتی ہے، راوی نے غالباً کے ذریعہ یہ وسعت خود ہی پیدا کر دی ہے۔

(۷) تاریخ میو چھتری ص ۳۸۶ تا ۳۸۴ (۸) تاریخ میو چھتری ص ۳۸۴

(۹) حوالہ مذکور (۱۰) میل سن ۵/۲۵۸

(۱۱) غدر کے چند علماء ص ۱۳۵۔ یہاں صرف یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ مولانا شاہ اسحٰق ۱۸۵۷ء سے بارہ سال پیشتر فوت ہو چکے تھے (مہر)

(۱۲) قیصر التواریخ ۲/۲۶۸۔

(۱۳) ۱۸۵۷ء کے مجاہد ص ۱۲۷ و ۱۲۸

(۱۴) ٹائمس آف کراچی ۱۴ مارچ ۱۹۵۵ء بحوالہ علماء ہند کا شاندار ماضی ۴/۳۸۲

(۱۵) ۱۸۵۷ء ص ۳۱۹

(۱۶) فارن ڈپارٹمنٹ ۵۰۰۱ بحوالہ سین ص ۳۰۸ بحوالہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص ۳۴۴

(۱۷) جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص ۳۴۴

(۱۸) تاریخ میو چھتری ص ۳۸۴ مسودہ تحریک اہل حدیث میوات نیز لوگوں کے زبانی بیانات

التقریظ والانتقاد

اردو املا

ایک تنقیدی جائزہ

( )

از جناب مولوی حفیظ الرحمان صاحب واصف

نئے لطیف صـ ۴۱۰

مِی ناب، مےِ ناب صحیح ہے۔ لفظ نئے میں آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ اس کا تلفظ ہمزہ کے ساتھ ہے۔ نئے ءِ لطیف۔ یہ لفظ مہموز اللام ہے۔ ہمزہ مادہ کا حرف ہے یہ حذف نہیں ہو سکتا۔ اِنَّ اللہَ عَلیٰ کُلِّ شَیْءٍ قَدِیر۔

مندرجہ ذیل مصرعوں کی تقطیع کیجیے:۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا

جفائے آسماں بھی شکوہ سنج بے نیازی ہے   جلوے میں تیرے ہے تسخیر ہوائے دیدار

آپ فرماتے ہیں کہ تقطیع میں برِدن کو بردنے فرض کر لیا جائے گا۔ تماشائے میں، ایک کی جگہ دو دیے، مان لی جائیں گی۔

فرض تو کیا جاتا ہے شےءِ موہوم و معدوم کو اور آپ خود اپنی زبان سے ایک زائد (ے) کا تلفظ بھی فرماتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ فرض کر لی گئی ہے۔ دو دیے مان لی جائیں گی۔ یعنی اگرچہ ان کا وجود نہیں ہے مگر مان لی جائیں گی۔ تو جب ایک فرضی چیز کو ماننا ہی ٹھہرا تو دو دیے میں سے ایک کو ہمزہ ہی کیوں نہ مان لیا جائے؟۔

یہاں ایک نیا قاعدہ ہاتھ لگا کہ علم اللسان کی بنیاد مفروضات پر بھی رکھی جاسکتی ہے۔

عدد استغراقی ص ۴۸

اہل دہلی عدد استغراقی میں دو سے پانچ تک واو مجہول اور نون غنہ لگاتے ہیں چھ میں (ون) لگانے کے بجائے چھ کے چھ کہتے ہیں۔ پھر ساتوں، آٹھوں۔ پھر نو سے سونک کہیں (ون) نہیں۔ چھ کی طرح نو کے نو، دس کے دس، گیارہ کے گیارہ الخ۔

چھیاسی، چھیانوے کا تلفظ بکسر اول چ مشدد یائے مخلوط سے ہے۔ ننانوے میں یائے مخلوط نہیں ہے۔ چھ کا تلفظ دہلی میں بفتح اول بروزن مے ہے اور یوپی میں بکسر اول بروزن ے اور روے۔ تلفظ میں یائے مجہول کچھ تھوڑی سی ہے۔ میرے خیال میں یہ لفظ مرکب نہیں ہے۔ تنہا ایک مفرد حرف ہے۔ اور اگر مرکب مانا جائے تو میرا قیاس یہ کہتا ہے کہ چھچھے ہوگا۔ مخفف ہوکر اکیلا رہ گیا۔ بہرحال تحقیق طلب ہے۔ چھدام (چھ دام) بفتح اول اسی سے بنا ہے۔ فرہنگ آصفیہ میں چھ پر بھی زبر لگا ہے۔

غلو ص ۴۲۶

غلو اور افراط و تفریط دونوں طرف ہے۔ اگر ایک طرف یہ ہے:۔

ایکطرف، ضرورتکے موافق، ضرورتکیموافق، ضلعمرادآباد۔ وغیرہ۔ تو دوسری طرف یہ ہے۔ بل کہ، بے گار، بے زار، بے دار، بے داد، لے زار، بے رونی، بے طائبے دہ، بے ہودہ۔

نون نفی، یائے جارہ اور یہ میں ہائے مختفی نہیں تھی۔ علحدہ لکھنے میں وہ صرف ایک نوک تھی قلم کی روانی سے اس کے آگے خم آگیا ہائے مختفی بن گئی۔ اگر ہم بخوبی، بہرحال، بدولت نگفت لکھیں تو وقت کی بھی بچت ہے اور قلم کا سفر بھی مختصر ہوتا ہے۔ ایک ناخواندہ مہمان سے بھی نجات مل گئی۔ تحریر میں جگہ بھی کم خرچ ہوئی۔

پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ دو حرفوں کو ملا کر جیسے بلکہ، چونکہ، وغیرہ یا اسی اور حرف کو ملا کر لکھیں۔ جیسے غرضکہ، لبشرطیکہ، بیشک وغیرہ، تو اس میں فائدہ تو ہے نقصان نظر نہیں آتا۔

بہر حال اس افراط اور تفریط سے سخت انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ کلی حکم دیدیا گیا کہ دو لفظوں کو ملا کر نہ لکھو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مفرد الفاظ کے بھی ٹکڑے ہو گئے۔

طالب علم حیرانی و پریشانی کی اصل وجہ یہ ہے کہ قوم کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے گھٹیا لوگ بیسک اسکولوں میں آتے ہیں۔ وہ اپنی تہذیب اپنا کلچر اپنا اخلاق اپنی زبان اپنا لہجہ اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ تعلیم عام ہوتی جا رہی ہے۔ معیار گرتا جا رہا ہے، تربیت فنا ہو چکی ہے۔

کشش ص ۵۰۲

اساتذۂ فن تو بلا ضرورت سین کی کشش بھی معیوب قرار دیتے ہیں۔ اور محض کشش بلا حرف تو بہت ناپسند کرتے ہیں۔ لفظ قطعہ کو کشش سے لکھنا غیر مستحسن ہے اور لفظ مثنوی میں واؤ سے پہلے کشش آ ہی نہیں سکتی۔ کشش کے ساتھ واو اور قاف کے جوڑ کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس قسم کی فرد گذاشتیں اور غلطیاں آج کل عام ہیں وجہ یہ ہے کہ صحیح تربیت یافتہ خوشنویس نہیں رہے۔ کتابت میں الفاظ کے درمیانی فاصلوں کو مناسب حد تک ملحوظ رکھتے ہوئے عبارت کو کھپانے کی واقفیت ہی مفقود ہو چکی ہے۔

اب دیکھیے کتاب اردو املا کے صفحہ ۵۰۳ پر پہلا پیرا (سے ہے) پر ختم ہوتا ہے۔ اگر لفظ مسئلہ کی غیر ضروری کشش نہ ہوتی اور ڈیش دکوما اور دیگر فاصلوں کے تناسب کا لحاظ رکھا جاتا تو (سے ہے) لکھ کر بھی جگہ خالی رہتی۔ چھوٹے چھوٹے لفظوں کے لئے پوری سطر ضائع کر دینا عام عادت بن گئی ہے۔ اسی کتاب میں سے اور چند مثالیں دیکھیے اور آپ خود غور

فرمائیے کہ مندرجۂ ذیل الفاظ کی گنجائش کیا سطر ماقبل میں نہیں تھی؟۔

صفحہ ۱۵ ڈالا ہے۔ ص ۲۶ ہیں۔ جاتا ہے۔ ص ۳۰ ہے، ہو سکتا ہے۔ ص ۴۱ ہی نہیں۔ ص ۴۸ ہیں۔ ص ۵۱ چاہیے۔ ص ۹۰ جائے۔ ص ۱۰۶ وغیرہ۔ ص ۱۰۷ اگی۔ ص ۱۰۸ اگا۔ ص ۱۸۵ ہے۔ ص ۲۲۳ جائے گا۔ ص ۳۳۱ نہیں۔ ص ۳۳۸ کے ساتھ۔ ص ۳۷۹ بات ہے۔ محض ورق گردانی سے ہی سیکڑوں مثالیں ملیں گی۔ غیر ضروری کششوں پر خاص طور سے غور کیا جائے بعض جگہ تو ستم ہی ڈھایا ہے صرف "گا، گی، ہے، ہیں، نہیں" کے لئے پوری ایک سطر کو ضائع کیا گیا ہے۔ بہت سی جگہ ایک سطر بلا وجہ اور بلا ضرورت خالی چھوڑی گئی ہے۔ مثلاً ص ۵۰۰ پر ایک سطر خالی چھوڑنے کی وجہ میری سمجھ میں تو نہیں آئی۔

زیر زبر اور نقطے لگانے میں آج کل کے ناتربیت یافتہ کاتب (اور ان کی اکثریت ہی ناتربیت یافتہ ہے) بے انتہا تکلیف دہ اور پریشان کن بے احتیاطی کرتے ہیں۔ حرف کے اوپر کا زیر سطر بالا کے حرف کا زبر معلوم ہوتا ہے سوچنا پڑتا ہے کہ یہ نقطہ اوپر والے حرف کے نیچے کا ہے یا نیچے والے حرف کے اوپر کا ہے۔ واضح ہو کہ قلم کی کتابت اور ٹائپ میں بہت فرق ہے۔ یہاں کمپوزٹینگ کی قسم کی کوئی دشواری نہیں ہے۔

کاتب صاحب سے درگذر کا طالب ہوتے ہوئے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کے فن میں مداخلت بلا وجہ نہیں کر رہا ہوں۔ کچھ تھوڑی سی واقفیت احقر کو بھی فن خطاطی سے ہے۔ احقر کے سلسلۂ اساتذہ میں دو مقتدر ہستیاں سراج الدین نام کی بھی ہیں۔ شاعری کی ٹوں ٹاں میں تو بلا واسطہ نواب سراج الدین احمد خاں سائل سے اور خوش خطی کی ابجد میں اعلیٰ حضرت ظل سبحانی سراج الدین ظفر بہادر شاہ سے بالواسطہ شرف تلمذ حاصل ہے۔ میں نے اب ت کی مشق کی استاد عبد الغنی سے اور وہ شاگرد تھے اپنے والد منشی ممتاز علی کے اور وہ شاگرد تھے بہادر شاہ ظفر کے۔

نسبت ہے بہت بڑی اگر خود کیا ہے بدنام کنندۂ نکو نامے چند

غور فرمایئے۔! یہ فن شریف تخت شاہی سے پٹریوں پر جا پہنچا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار
اصول کے مطابق "میں اور ہیں" کے شروع میں گول سر بنایا جاتا ہے۔ امتیاز کیلئے
شوشہ لگایا جاتا ہے۔ اگر نیچے شوشہ ہے تو (ہ) اور شوشہ نہیں ہے۔ تو (م) ہے۔
صفحہ ۵۰۵ سطر ۷ میں پانچ لفظوں میں (ر) کا جوڑ ایک ہی طرز کا لگایا گیا ہے جو غلط
ہے۔ کاتب صاحب غور فرمائیں۔

چینوٹی ص ۵۲۳

اس لفظ کے تلفظ میں علاقائی اختلاف ہے۔ اہل دہلی کے تلفظ میں واضح طور پر
یائے معروف اور واؤ موقوف ہے یوپی میں چ مکسور ہی واو پر پڑھ جاتی ہے۔ اور بعض
مرتبہ مضموم ہو جاتی ہے۔ اب رہی کتابت میں نون غنہ کے مقام کی تعیین۔ یہی کام بہت
مشکل ہے۔ آصفیہ میں نون غنہ کو (واؤ اور ٹ) کے بیچ میں لکھا گیا ہے۔ لیکن میں (ی) اور
واو کے بیچ میں جگہ دیتا ہوں۔ کیوں؟

میری دلیل یہ ہے کہ اسی لفظ کا دوسرا تلفظ بھی ہے اور دہلی میں عام ہے۔ چمٹی
اور چمٹا۔ ممکن ہے دوسرے مقامات میں بھی کہیں ہو۔ اور اسی تلفظ سے لفظ چمٹا بمعنی
آتش گیر معرض وجود میں آیا ہے۔ کیوں کہ چینوٹے کے جبڑے اور آتش گیر دونوں میں
گرفت کی مشابہت ظاہر ہے۔ دہلی میں آتش گیر کو دست پناہ کہتے ہیں اور سادھوؤں
کا چمٹا کہلاتا ہے۔

نون غنہ اور واؤ مخلوط ہو کر میم بن گیا۔ اور واو تنہا میم کا مخرج اختیار نہیں کر سکتا
جب تک ی کے کھنچاؤ کے ساتھ نون غنہ شامل ہو کر نہ آئے اور اگر بغیر نون غنہ کے
واؤ کا تلفظ ہو گیا تو بعد میں نون غنہ کی آواز پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور بالفرض ہو بھی
جائے تو واؤ کو مبدل بہ میم کرنے کا عمل نہیں ہو سکتا۔ تو جب کہ نون غنہ کی آواز
واؤ سے پہلے ضروری ہے تو کتابت میں بھی اس کا مقام متعین ہے۔

علاقائی اختلاف لہجہ کی مثال میں ایک اور لفظ پیش کرتا ہوں۔ لفظ ڈیوڑھی کو دہلی والے بکسر اول و یائے مجہول ساکن، واو ملفوظ موقوف (بروزن بیشگی) بولتے ہیں۔ لیکن یوپی میں اس کا تلفظ بھی چینوٹی کی طرح ہے۔ یعنی ڈال مکسور اور واو کے بیچ میں (ی) نہیں۔ بلکہ ڈال مکسور واو سے ملتی ہوئی مائل بضمہ ہوتی ہے۔

اس کا ماخذ لفظ ڈیوڑھ (بروزن زیور) ہے۔ ڈیوڑھ کے معنی تسلسل کے ہیں اور اسی معنی میں دہلی میں بولا جاتا ہے۔ ڈیوڑھی میں آمدورفت کا تسلسل ہوتا ہے وجہ تسمیہ ظاہر ہے۔

یائے معدولہ مت۲

سابقہ اوراق میں عرض کیا جا چکا ہے۔ کہ جس واو کو معدولہ قرار دیکر رد کر دیا گیا ہے اگر آپ غور کریں تو کچھ کارفرمائی اس کی اب بھی باقی ہے جیسے خوان اور خان۔ درخواست اور برخاست میں فرق ہے اور فرق کرنا چاہیے۔ میں واو معدولہ کو بھی متروک نہیں سمجھتا۔ اور جس کو یائے معدولہ کہا جا رہا ہے اگر غیر ملفوظ کے معنی میں کہا گیا تو صحیح نہیں کیوں کہ وہ تو ہائے مخلوط کی طرح ملفوظ ہے۔

آپ نے چار حرفوں (د ہ ری) کو معدولہ کا نام دیا ہے۔ میرے خیال میں معدولہ کے بجائے مخلوطہ کا نام دینا چاہیے۔ اور جس (ہ) کی مثالیں دی ہیں وہ تو صاف طور پر تلفظ میں آتی ہے۔ کہیو، رہیو، چوہیا میں تو واضح طور پر ہائے ملفوظ ہے۔ پہیا میں ذرا دب جاتی ہے۔ اور پیہیا، جو پیہا کا تبدیل شدہ تلفظ ہے اس میں بھی ذرا دب جاتی ہے۔

بہرحال فارسی الفاظ جو اردو کا جزو لاینفک بن چکے ہیں جس طرح ان میں ہم معروف و مجہول کے امتیاز کو ترک نہیں کر سکتے۔ اسی طرح ہمیں واو معدولہ کی بھی ضرورت ہے معدولہ کہہ کہہ کر اس کا تلفظ بچپن سے نہیں کرایا جاتا۔ ورنہ اس کا تلفظ کچھ مشکل

نہیں۔ دیکھیے لفظ بوائے کے ضمن میں ص ۵۳۲ پر آپ نے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔

نیولا وغیرہ ص ۵۲۹

مندرجۂ ذیل الفاظ میں بھی علاقائی لہجے کا اختلاف ہے۔ دہلی کے لہجے میں کیاری بروزن پٹاری ہے نیولا اور کیوڑا، بروزن کیکڑا۔ اور تیوڑانا کا تلفظ بھی انھیں کے مطابق جیوڑا بکسرِ اول و یائے معروف ساکن واؤ موقوف۔ جو ہیا میں واؤ لکھا ضرور جائیگا

ماند اور چاند میں نون غنہ نہیں ہے۔ ہاں کنور بھنور میں غنہ ہے۔

سرہانا ص ۶۲۸

ایک لفظ ہے، ہاں، اسم ظرف ہے۔ یہاں، وہاں، سرہانا۔ اسی سے مرکب ہو کر بنے ہیں۔ یوپی میں پائنتی ہانا بھی بولتے ہیں۔ (دہلی میں پائنتی) اصل کے لحاظ سے ہائے مخلوط نہیں تھی۔ کثرتِ استعمال سے مخلوط ہو گئی۔

کہ یہ وغیرہ ص ۶۴۱

اس شوشہ کا اضافہ قطعاً غیر ضروری ہے۔ میں گذشتہ اوراق میں اختلاف رائے لکھ چکا ہوں۔ اگر یہ شوشہ نہ لگایا جائے تو نہ لفظ کے پڑھنے میں کوئی دشواری ہوتی ہے نہ کوئی التباس لازم آتا ہے۔ ہائے مختفی وغیر مختفی کی اصطلاحوں کو عام لوگ نہیں سمجھ سکتے انکو اس امتیاز کے چکر میں نہ ڈالیے۔

مانتے جانتے ص ۶۴۵

ان الفاظ کا مادہ مان، جان ہے۔ اسی پر صیغوں کی علامتیں لگتی ہیں۔ علامت مصدر (نا) علامت ماضی (الف) علامت مضارع (ے) علامت حال (تا ہے) علامت استقبال (گا) وغیرہ۔

گا، کے بارے میں تو آپ کا یہ ناطق فیصلہ صادر ہو چکا ہے کہ ملا کر ہرگز نہیں لکھا جائے گا۔ بلکہ اگر گا، گی، دوسری سطر میں تنہا جا پڑے تب بھی خوبصورت ہے (دیکھیے ص ۱۰،

س ۹) اور پوری کتاب میں اس فیصلہ کا التزام کیا گیا ہے۔ اب اگر عود ہندی کے کاتب نے دوسرے صیغوں کی علامتوں کو بھی الگ کر دیا تو اس نے آپ کے حکم کی تعمیل کا حق ادا کیا۔ یہ علامتی الفاظ ہی تو ہیں اس میں گلہ شکوہ کیا ہے۔ ترے اور سٹھ بھی دو مستقل لفظ ہیں (تین اور ساٹھ) آپ ہی کا حکم ہے کہ دو لفظوں کو ملا کر نہ لکھو۔

سیر مرادف پیاز ص۶۲

اقتباس میں سیر مرادف پیاز دیکھ کر ٹھنک پڑ گیا۔ اس کی تحقیق کر لی جائے۔ لفظ مرادف سے مصنف کی کیا مراد ہے۔؟ واللہ اعلم

٭ ٭ ٭

کتاب کا سرسری مطالعہ کرنے میں جہاں کہیں اپنے خیالات کا اظہار ضروری سمجھا اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے تحریر کر دیا گیا ہے اور دوران تحریر کوشش یہ رہی ہے کہ ادب و احترام کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ تاہم اگر کہیں کچھ جذباتیت آگئی ہو تو عفو و درگذر کا طالب ہوں۔

آپ نے کتاب میں بہت سے اصطلاحی الفاظ استعمال کیے ہیں اور بعض تو غیر مانوس، نوایجاد اور مشکل ہیں۔ مثلاً انفیا نا وغیرہ۔ اور صراح وغیرہ سے مدد لیے بغیر ان کے معانی کا سمجھنا بھی دشوار ہے۔ اور میں نے اپنی تحریر میں شاید اور بھی زیادہ اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ دیکھیے! ہم دونوں نے مل کر اردو کو کس قدر بوجھل بنا دیا ہے۔

بہر حال امید ہے کہ ٹھنڈے دل سے میری گذارشات پر غور کیا جائے گا۔ اصل مقصد آپکو تحقیق دینا ہے نہ کہ الزام دینا۔ اور لغزش و خطا سے پاک صرف ذات باری تعالیٰ ہے

(نوٹ، صفحات کا حوالہ میں اس طرح لکھتا ہوں ص۵۶۲ س۹۔ لیکن کاتب صاحب کی دانش و ہنرمندی کے آگے سپر ڈال چکا ہوں۔ واصف

تبصرے

حیات خلیل۔ از مولانا محمد ثانی حسنی تقطیع متوسط ضخامت ۴۱۲ صفحات، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد -/۱۵ پتہ:- مکتبہ اسلام، گوئن روڈ، لکھنؤ۔

مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری سلسلہ سہارنپور و دیوبند کے اکابر علماء ومشائخ میں سے تھے اور اس سلسلہ کی خصوصیات کے جامع تھے، علم وعمل، شریعت وطریقت، ورع وتقوی، درس وتدریس اور تصنیف وتالیف یہ سب اوصاف آپ کی کتاب زندگی کے روشن ابواب تھے آپ کا ایک تذکرہ مولوی عاشق الٰہی صاحب میرٹھی نے تذکرۃ الخلیل کے نام سے لکھا تھا۔ لیکن ضرورت تھی کہ سوانح نگاری کے جدید اصول وضوابط کی روشنی میں ایک مفصل ومبسوط تذکرہ لکھا جائے۔ یہ کتاب اسی ضرورت کی تکمیل کے لئے مرتب کی گئی ہے۔ شروع کے دو ابواب میں لائق مولف نے حضرت سہارنپوری کے خاندان اور وطن کے تذکرہ وبیان کے سلسلہ میں سہارنپور، دیوبند اور مظفر نگر کے اطراف واکناف کے مختلف مگر نمایاں خانوادہائے علم وفضل اور ان کے مشاہیر علماء ومشائخ کا تذکرہ بڑی جامعیت اور خوبی سے کیا ہے جو اڑسٹھ صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ باقی سولہ ابواب میں حضرت سہارنپوری رحمتہ اللہ علیہ کے ذاتی سوانح وحالات، پیدائش، تعلیم، ملازمت، درس وتدریس تصنیف وتالیف، اسناد واجازتِ روایت، اساتذہ، تلامذہ، مشائخ ومسترشدین کمالات علمی وروحانی۔ فضائل اخلاق، معمولات وعادات، اسفار، جذبہ جہاد ملفوظات وارشادات، مکتوبات، رسائل وکتب، تبلیغ واشاعتِ دین میں

انہماک و توغل، غرض کہ ایک عارف باللہ اور عالم بلند پایہ کی حیات مقدسہ کے جتنے گوشے اور پہلو ہو سکتے ہیں ان سب کا تذکرہ بسط و تفصیل اور تحقیق و تفتیش سے کیا ہے اور چونکہ اس کتاب کا مسودہ حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ اعظم شیخ العرب والعجم مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ العالی نے حرفاً حرفاً پڑھا یا پڑھوا کر سنا ہے اس بنا پر اس کے مستند ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مقدمہ بھی دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہے۔ البتہ کتاب چونکہ عجلت میں لکھی گئی ہے اس لئے عبارت میں حسن ترتیب و انسجام نہیں ہے زبان بھی کہیں کہیں غلط ہے اور کتابوں کے حوالے بھی بعض جگہ مکمل نہیں ہیں۔ تاہم کتاب بڑی محنت اور انہماک سے مرتب کی گئی اور بصیرت افروز و معلومات افزا ہے امید ہے کہ ارباب ذوق اس کی قدر کریں گے۔

سازِ مغرب حصہ دوم مرتبہ جناب حسن الدین احمد صاحب، تقطیع متوسط ضخامت ۲۷۹ صفحات کتابت و طباعت اور کاغذ اعلیٰ قیمت -/20

پتہ: ولا اکیڈمی، عزیز باغ، سلطانپورہ، حیدرآباد - 500024

اردو شاعروں نے بہت کثرت سے مشرق و مغرب کی مختلف زبانوں کی نظموں اور غزلوں کا اردو میں منظوم ترجمہ بھی کیا ہے اس سلسلہ میں انگریزی زبان کا حصہ سب سے زیادہ ہے، یہ منظوم ترجمے جو اردو ادب کی ایک اہم صنف تھے، عام طور پر نظر انداز اور پراگندہ و منتشر تھے جناب حسن الدین احمد کو جو خود اردو زبان کے ادیب اور مصنف ہیں اس طرف توجہ ہوئی اور آپ نے محنت و تلاش بسیار کے بعد ان منظوم تراجم کا ایک مجموعہ سازِ مغرب کے نام سے شائع کیا تھا جو اس سلسلہ کا حصہ اول تھا۔ اور برہان میں اس پر تبصرہ ہو چکا ہے۔ اب یہ کتاب اسی سلسلہ کا حصہ دوم ہے جو چھوٹی بڑی ۸۰ مترجم غزلوں

اور نظموں پر مشتمل ہے۔ اور بعض بعض کے تو ایک دو نہیں متعدد تراجم ہیں، فاضل مرتب نے حسب سابق شروع میں تمام انگریزی شاعروں کے نام انگریزی حروف میں درج کر دیئے ہیں ہر اردو منظوم ترجمہ کے ساتھ اس کے ماخذ کا ذکر کیا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شروع میں ایک طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں فنِ ترجمہ اور اس کے لوازم و شرائط پر بصیرت افروز کلام کیا ہے۔ امید ہے حصہ اول کی طرح یہ حصہ بھی تاریخ اردو ادب کے اساتذہ اور طلبہ میں مقبول ہوگا۔ اور ارباب ذوق اس کی قدر کر کے فاضل مرتب کی محنت اور حسنِ ذوق کی داد دیں گے۔

دفتر پنجم مثنوی مولانائے روم:۔ ترجمہ مولانا قاضی سجاد حسین صاحب صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری، دہلی۔ تقطیع متوسط، ضخامت ۴۲۴ صفحات، کتابت، طباعت اور کاغذ اعلیٰ، جلد اور گٹ اپ شاندار قیمت -/22

پتہ:۔ سب رنگ کتاب گھر، دہلی۔ 6

مثنوی مولانائے روم کے اس اردو ترجمہ کی چار جلدیں، جو علی الترتیب چار دفتروں پر مشتمل ہیں شائع ہو کر مقبول عوام و خواص ہو چکی ہیں۔ یہ اس ترجمہ کی پانچویں جلد ہے جو پانچویں دفتر پر مشتمل ہے اور ان تمام خصوصیات کی حامل ہے جو سابقہ جلدوں کی تھیں، یعنی اشعار کا شگفتہ و سلیس اور عام فہم زبان میں ترجمہ، حواشی مکمل جن میں تلمیحات کی تشریح و توضیح اور حل لغات اور اشعار کے مطالب کو بیان کرنے کا اہتمام و التزام کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں شروع میں حسب معمولی ایک مقدمہ بھی ہے جس میں مختلف علوم و فنون کی جو اصطلاحات یا جن تاریخی اقوام و ملل اور جغرافیائی مقامات کا ذکر اس جلد میں آیا ہے ان کی تشریح کی گئی ہے، غرض کہ ظاہری معنوی خوبیوں کے اعتبار سے یہ جلد ایک ہی سلسلۂ زریں کی کڑی ہے۔ اور بڑی خوشی کی بات ہے، کہ اشاعت کا کام مستعدی اور تیزی سے ہو رہا ہے۔

جلد ۸۲ | ربیع الاول ۱۳۹۹ھ مطابق فروری ۱۹۷۹ء | شمارہ ۲

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

اطلاعاً عرض ہے کہ راقم الحروف کالیکٹ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں وزٹنگ پروفیسر ہوکر ایک برس کے لیے آیا تھا، یہ مدت آیندہ مارچ کے پہلے ہفتہ میں پوری ہورہی ہے، اس لیے جو اخبارات اور رسالے میرے نام کالیکٹ کے پتہ پر آتے ہیں یا جو احباب مجھے خط پہلی مارچ کے بعد لکھیں وہ ازراہِ کرم یہ پتہ نوٹ کرلیں:

Diggi Road, Behind Bal Baradari Bhawan

ALIGARH-202001

یہاں آنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سیرتِ حضرت عثمان پر کم و بیش چار سو صفحات کی میری کتاب تقریباً مکمل ہوگئی ہے، جتنے اہم مباحث ہیں مثلاً فتوحات، بغاوت اور اس کے اسباب، نظم و نسق، علم و فضل، عظیم الشان کارنامے، اوصاف و کمالات وغیرہ سب لکھ لیے ہیں۔ بس عمال و ولاۃ خلافتِ عثمانی اور باغیوں کے سرگروہ لوگوں پر سوانحی نوٹ لکھنے باقی ہیں تاکہ حقیقت نکھر کے سامنے آجائے۔

میں نے صدیق اکبرؓ کی تصنیف سے فراغت کے بعد ہی جسے اب بیس برس ہوگئے سیرتِ عثمان لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور اس کا اظہار بھی ہوچکا تھا، اس مدت میں ہزاروں صفحات اردو، انگریزی اور عربی میں میرے قلم سے نکلے جن میں سینکڑوں صفحات علمی و تحقیقی مقالات و مضامین کے ہوں گے جن میں سے چند برہان میں قسط وار شایع ہوئے اور باقی ہندوستان اور بیرونی ممالک کے علمی مجلات میں یا مستقلاً بصورتِ رسالہ شایع ہوئے، اس پوری مدت میں سیرتِ حضرت عثمان کے خیال سے کبھی غافل نہیں ہوا اور مطالعہ کے اثنا میں اس سلسلہ کی جہاں کوئی نئی اور مفید چیز نظر آئی اسے یادداشت میں درج کرتا رہا لیکن باینہمہ ایک اہم اور مختلف الجہات موضوع پر قلم اٹھانے کے لیے جس دل جمعی اور یکسوئی کی ضرورت تھی وہ چونکہ ملازمت کی چند در چند پریشان کن مصروفیتوں کے

باعث میسر نہ آئی اس لیے سیرت حضرت عثمان کی ترتیب و تالیف کا کام معرض التوا میں پڑتا رہا۔ یہاں کالیکٹ یونیورسٹی میں فرصت تھی، تنہائی اور یکسوئی تھی، فضا بہت خوشگوار اور ماحول پرسکون و نشاط انگیز، لائبریری بھی ایک بڑی حد تک اچھی، اس لیے یہاں آتے ہی باقاعدہ و باضابطہ یہ کام شروع کر دیا اور آج الحمد للہ میں اس سفر کی آخری منزل میں ہوں۔

کتاب کے شروع میں ایک مقدمہ بھی ہوگا جس میں کسی قدر بسط و تفصیل سے تاریخ اسلام کے قدیم اصل ماخذ اور ان کے مصنفوں کی تاریخ نگاری پر نقد و تبصرہ ہے، یہ کتاب کیسی ہوگی اس کا فیصلہ ارباب نظر ہی کر سکتے ہیں، البتہ اس سلسلہ میں دو باتیں عرض کرنی ہیں: (۱) ایک یہ: جب سے میں نے تاریخ اسلام کا مطالعہ شروع کیا ہے میرا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام خصوصاً اکابر مہاجرین و انصار کا تعلق ہے سب کی ایک شخصیت ہے اور ایک ان کی تاریخ، ان کی شخصیت کا آئینہ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ ہیں اور تاریخ یعنی احوال و واقعات زندگی کا آئینہ کتب تاریخ ہیں، ضروری ہے کہ دونوں میں مطابقت ہو، لیکن اگر مطابقت نہیں ہے تو چونکہ اول الذکر آئینہ کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا اس بنا پر لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ موخر الذکر آئینہ میں کوئی نقص اور خرابی ہے، اس قسم کے مواقع پر ہمارے بزرگ یہ کہہ کر سبکدوش ہو جاتے ہیں کہ مثلاً واقدی اور ابن اسحٰق اور طبری اور یعقوبی اعتماد کے لائق نہیں ہیں، میرے نزدیک یہ طریقہ قطعاً غیر علمی اور اس طرح کی بات کہہ کر ایک اہم مسئولیت سے سبکدوش ہو جانا پست ہمتی اور احساس کمتری کی دلیل ہے، کیونکہ حدیث میں ان حضرات کا مرتبہ خواہ کچھ ہو بحیثیت مورخ کے ان کے بلند مرتبہ و مقام میں کوئی شک نہیں ہو سکتا اور تاریخ اسلام کے اولین ماخذ کی حیثیت سے ان حضرات کی کتابوں سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا اور امت نے ہمیشہ ان پر اعتماد اور بھروسہ کیا ہے۔

اس بنا پر مذکورہ بالا دونوں آئینوں کی عدم مطابقت میں میرا ہمیشہ یہ معمول رہا ہے کہ میں ہمت ہار کر نہیں بیٹھتا اور اصولِ تنقید کی روشنی میں اس کا سراغ لگانے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ اگر نقص ہے تو کیا ہے؟ کیوں اور کہاں ہے؟ محنت، خلوص اور دل کی لگن شرط ہے، ورنہ ہماری تاریخوں میں کیا نہیں ہے؟ کہیں اگر زہر ہے تو اس کا تریاق بھی وہیں موجود ہے بس درکار ذوقِ جستجو اور دیدۂ بینا ہے، جن حضرات نے میری کتابیں اور میرے مقالات بالاستیعاب پڑھے ہیں وہ اس کا اندازہ کرسکتے ہیں کہ یہی جدوجہد اور یہی طریقۂ کار (METHOD) میری تصنیفی زندگی کا نمایاں پہلو رہا ہے جس پر اپنے بزرگوں سے دعائیں لی ہیں، سیرتِ حضرت عثمان میں بھی طریقہ کار یہی رہا ہے۔ اربابِ نظر اور محققین اس کا فیصلہ کریں گے کہ مصنف کو اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے۔

---

(۲) دوسری بات یہ کہنی ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں قاہرہ اور بیروت سے چند کتابیں تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر شایع ہوئی ہیں جو اگرچہ دفاترہ کی لکھی ہوئی ہیں اور کہنے کو محققانہ ہیں لیکن چونکہ اصول تنقید سے کام نہیں لیا گیا اس لیے سخت افسوس ہے وہی گنے چنے اعتراضات جو حضرت عثمان پر کیے جاتے ہیں وہ ان کتابوں میں بھی دہرادیے اور اپنی تائید میں حوالے مستشرقین اور سید امیر علی کی کتابوں کے نقل کردیے گئے ہیں یہ ایک عام ناانصافی اور ظلم ہے جس کو عرب ممالک اور برصغیر کے بعض مصنفین نے امیر المومنین عثمان ذوالنورین کے ساتھ روا رکھا ہے، میں اپنی تحریروں کا لب ولہجہ ہمیشہ علمی اور سنجیدہ ومتین رکھتا ہوں، مناظرانہ طرزِ گفتگو سے مجھے نفرت ہے، کسی بات کی اگر تردید کرنی بھی ہوتی ہے تو کسی شخص اور فرقہ کا نام نہیں لیتا، کیونکہ اس سے افادیت کم ہوجاتی ہے لیکن جہاں تک احقاق حق کا تعلق ہے مقدرت بھر اس میں کوتاہی نہیں کرتا یہی اسلوب سیرتِ حضرت عثمان کا ہے، وھو المستعان وعلیہ التکلان۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کتاب تقریباً مکمل ہے البتہ ماخذ کی فہرست میں جو کتابیں درج ہیں ان میں سے عربی اور انگریزی کی چند کتابیں یہاں نہیں مل سکی ہیں، اس لیے علیگڈھ پہونچ کر ان کتابوں کو بھی دیکھنا اور پھر پورے مسودہ پر نظرِ ثانی کرکے عبارت کا نوک پلک درست کرنا باقی ہے، اس میں کم وبیش دو مہینے لگ جائیں گے اس کے بعد ہی کتابت شروع ہوسکے گی۔

اسلام اور سامانِ تعیّش

از: سید جلال الدین عمری صاحب

(۴)

ریشم ملے ہوئے کپڑے کا استعمال

یہ ساری بحث خالص ریشم سے متعلق تھی۔ سوال یہ ہے کہ کسی کپڑے میں ریشم ملا ہو تو کیا اس کا استعمال بھی مردوں کے لیے ناجائز ہے؟ سلف میں بعض حضرات کا مسلک یہ ہے کہ ریشم ملے ہوئے کپڑے کا استعمال بھی ممنوع ہے، لیکن جمہور کے نزدیک ریشم ملا ہوا کپڑا ناجائز نہیں ہے[1]

اس مسئلے کو پوری طرح سمجھنے کے لیے حسبِ ذیل روایات پر غور کرنا ہوگا۔

حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں:۔

نھانا عن لبس الحریر والدیباج والقسی والاستبرق ومیاثر الحمر[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشم، دیباج، قسی اور استبرق کے پہننے سے اور سواری پر ریشم کے سرخ گدے استعمال کرنے سے منع فرمایا۔

دیباج، باریک ریشم کو اور استبرق، موٹے ریشم کو کہا جاتا ہے۔ البتہ 'قسی' کے بارے میں اختلاف ہے۔ حدیث میں چونکہ ریشم اور اس کی اقسام کا ذکر ہے اس لیے بظاہر یہ بھی ریشم ہی کی ایک قسم ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ 'قس' در اصل 'قز' تھا۔ عربی میں 'ز' کو 'س' سے

نوٹ: جنوری ۱۹۶۹ء میں شائع شدہ قسط (۳) شمار کی جائے۔

[1] فتح الباری ۱۰/۲۴۸۔ [2] بخاری کتاب اللباس، باب میثرۃ الحمراء۔ مسلم کتاب اللباس والزینۃ۔

بدل دیا گیا۔ 'قز' معمولی ریشم کو کہا جاتا ہے۔ اس تشریح کی رو سے گویا حدیث میں ریشم اور اس کی مختلف اقسام سے منع کیا گیا ہے۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں:

واما لبس الحریر والدیباج والقسی وھو نوع الحریر فکلہ حرام علی الرجال ..... واما النساء فیباح لھن لبس الحریر وجمیع انواعہ[1]

ریشم، دیباج اور قسی۔ یہ بھی ریشم ہی کی ایک قسم ہے۔ تو یہ سب مردوں کے لیے حرام ہے، البتہ عورتوں کے لیے ریشم اور اس کی تمام اقسام کا لباس جائز ہے۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ 'قس' مصر کی ایک بستی کا نام ہے۔ یہاں ریشم ملا ہوا کپڑا تیار ہوتا تھا۔ اسی کو 'قسی' کہا جاتا تھا۔ اس کی تائید حضرت علیؓ کے ایک بیان سے ہوتی ہے، اس لیے اسے اس کی مستند تعریف کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے 'قسی' کے پہننے اور سواری پر 'میاثر'[2] کے استعمال کرنے سے منع فرمایا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ قسی کیا ہے؟ تو جواب دیا۔

ثیاب اتتنا من الشام او مصر مضلعۃ فیھا من حریر وفیھا امثال الاترنج[3]

قسی ان کپڑوں کو کہا جاتا تھا جو شام یا مصر سے (مسلم کی روایت میں ہے کہ شام اور مصر سے) آتے تھے ان کے عرض میں ریشم کی ٹیڑھی دھاریاں (اترنج کی دھاریوں کی طرح) ہوتی تھیں۔

---

[1] نووی شرح مسلم ۱۴/۳۲۔ [2] میاثر کے بارے میں فرماتے ہیں: والمیثرۃ کانت النساء تصنعہ لبعولتھن مثل القطائف یصفونھا۔ یعنی میثرہ اس گدے کو کہا جاتا تھا جسے عورتیں اپنے شوہروں کے واسطے کجاوے پر بچھانے کے لیے تیار کرتی تھیں۔ یہ تشریح بخاری، کتاب اللباس، باب لبس القسی میں تعلیقاً آئی ہے اور مسلم، کتاب اللباس والزینۃ میں سند کے ساتھ مروی ہے۔ جس طرح ریشم کے فرش پر بیٹھنے سے منع کیا گیا ہے گویا اسی طرح یہاں سواری پر ریشم کے نمدے استعمال کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ اگر وہ سرخ رنگ کے ہوں تو احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ممانعت شدید ہوگی۔ لیکن اگر یہ نمدے ریشم کے
(باقی صفحہ ۸۲ پر)

اس سے بظاہر اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ کپڑے میں تھوڑا سا ریشم ہو تو بھی اس کا استعمال ممنوع ہے۔ لیکن بعض دوسرے دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ ریشم کا تھوڑا سا استعمال جائز ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ ناپسندیدہ کہا جا سکتا ہے۔

قسی کے بارے میں تیسری رائے یہ ہے کہ کتان کے کپڑے کو جس میں ریشم شامل ہوتا تھا قسی کہا جاتا تھا[1]

یہ دونوں تشریحیں اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان کی رو سے ریشم ملے ہوئے کپڑے کی حرمت ثابت ہوتی ہے لیکن جمہور کے نزدیک کپڑے میں ریشم کی مقدار کتان کی مقدار سے زیادہ ہو تو ناجائز ہے اور کم ہو تو جائز ہے[2]

خز کا استعمال اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ حدیث سے "خز" کا جواز ثابت ہے اور بہت سے صحابہ و تابعین نے اسے استعمال کیا ہے۔ چنانچہ سعد دشتکی کہتے ہیں: میں نے بخارا میں ایک صاحب کو دیکھا وہ سفید خچر پر سوار تھے اور خز کا سیاہ عمامہ باندھے ہوئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ عمامہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے باندھا ہے[3]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۷ کا) نہ ہوں تو یہ کہا جائے گا کہ ان سے مخالفت کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح عجمیوں لباس سے ان کے مسرفانہ رویہ میں مشابہت پیدا ہوتی ہے۔ فتح الباری ۱۰/ ۲۵۹

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] کتان ایک پودے کا نام ہے اس سے بہت ملائم کپڑا تیار ہوتا ہے۔

[2] پوری تفصیل کے لیے دیکھی جائے نووی: شرح مسلم ۱۴/ ۳۴۔ [3] ابو داؤد، کتاب اللباس، باب ما جاء فی الخز۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں: خز کے جواز کے سلسلے میں جو روایات آئی ہیں ان میں سب سے اعلیٰ یہی روایت ہے۔ فتح الباری ۱۰/ ۲۴۹ لیکن اس حدیث پر اس پہلو سے جرح کی گئی ہے کہ سعد دشتکی کے حالات معلوم نہیں ہیں۔ صرف یہی ایک روایت ان سے آئی ہے۔ اسی طرح جن صاحب کو انھوں نے صحابی کہا ہے ان کے بارے میں بھی کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ نصب الرایہ: ۴/ ۲۳۱۔ بعض لوگوں نے ان کا نام ابو حازم بتایا ہے۔ لیکن ان کی صحابیت کے بارے میں اختلاف ہے۔ نیل الاوطار ۲/ ۸۲۔

امام ابوداؤد کہتے ہیں بیس سے زیادہ صحابہؓ نے 'خز' استعمال کیا ہے۔ ابن ابی شیبہ نے عمدہ سندوں کے ساتھ صحابہ و تابعین کی ایک بڑی تعداد کے بارے میں نقل کیا ہے کہ وہ خز پہنتے تھے[1]

بعض لوگوں نے 'خز' کو بھی ریشم ہی کی ایک قسم سمجھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ خز کے بارے میں تین رائیں پائی جاتی ہیں۔

۱۔ 'خز' کا تانا ریشم کا اور بانا کسی اور چیز کا ہوتا تھا۔

۲۔ 'خز' ریشم اور اون ملا کر بنا جاتا تھا۔

۳۔ 'خز' اصلاً خرگوش کے اون سے تیار ہوتا تھا لیکن چونکہ وہ نرم اور ملائم ہوتا تھا اس لئے ریشم ملے ہوئے کپڑے کو بھی 'خز' کہا جانے لگا، کیونکہ وہ بھی اسی کی طرح نرم ہوتا تھا۔[2]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ 'خز' خالص ریشم کو بہرحال نہیں کہا جاتا تھا بلکہ مخلوط ریشم ہی کو خز کہا جاتا تھا، علامہ ابن اثیرؒ کہتے ہیں:

'خز' ابتداء میں عام طور پر ان کپڑوں کے لیے بولا جاتا تھا جو اون اور ریشم سے بنتے جاتے تھے۔ ان کا استعمال مباح ہے، صحابہ و تابعین نے انھیں پہنا ہے۔ بعض حدیثوں میں اس سے منع بھی کیا گیا ہے، تاکہ عجمیوں اور عیش پرست لوگوں سے مشابہت نہ پیدا ہو۔ اگر 'خز' کا مطلب خالص ریشم ہو اور آج کل اسی کو خز کہا جاتا ہے۔ تو یہ حرام ہے۔ اسی سلسلے میں یہ وعید آئی ہے: "یستحلون الخز والحریر" (میری امت میں ایسے لوگ پیدا ہونگے جو خز اور ریشم کو حلال کرلیں گے)[3]

---

[1] فتح الباری ۱۰/۲۴۹ — [2] حافظ ابن حجر نے پہلی رائے کو صحیح قرار دیا ہے۔ تیسری رائے کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو خز کے جواز پر اسی وقت اس سے استدلال کیا جاسکتا ہے جب کہ یہ ثابت ہوجائے کہ صحابہ نے جو خز استعمال کیا تھا وہ ریشم ملا ہوا تھا۔ فتح الباری ۱۰/۲۴۹۔

[3] بخاری میں یہ روایت اس طرح آئی ہے: لیکونن من امتی اقوام یستحلون الحر والحریر

(باقی صفحہ ۹ پر)

اس تحقیق کی رو سے 'خز' دور صحابہ و تابعین میں اون ملے ہوئے ریشم کے کپڑے کو کہا جاتا تھا۔ خالص ریشم کے کپڑے کے لیے اس لفظ کا استعمال بعد کا ہے۔ اسی وجہ سے جمہور کے نزدیک ریشم ملا ہوا کپڑا پہنا جا سکتا ہے۔ حرمت صرف خالص ریشم کے کپڑے کی ہے۔

ریشم ملے ہوئے کپڑے کے جواز پر جمہور نے حسب ذیل حدیث سے بھی استدلال کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

انما نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الثوب المصمت من الحریر فاما العلم من الحریر وسدی الثوب فلا باس بہ۔[۱]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو بس اس کپڑے سے منع فرمایا ہے جو خالص ریشم کا ہو۔ باقی رہے ریشم کے نقش و نگار یا ریشم کا تانا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

یہ حدیث صراحت کے ساتھ کہتی ہے کہ خالص ریشم ہی حرام ہے، مخلوط ریشم حرام نہیں ہے (ایک خاص حد کے اندر ریشم کے گل بوٹے بھی ہو سکتے ہیں اور کپڑے کا تانا ریشم کا ہو تو بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

(باقی صفحہ ۸ کا حاشیہ) والخمر والمعازف (کتاب الاشربہ، باب ما جاء فی من یستحل الخمر الخ) شارحین حدیث نے صراحت کی ہے کہ اس میں 'خز' نہیں بلکہ 'حر' کا لفظ آیا ہے۔ 'حر' شرمگاہ کو کہا جاتا ہے۔ گویا حدیث میں ان لوگوں کا ذکر نہیں ہے جو خز استعمال کرتے ہیں بلکہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو زنا اور بدکاری میں اس طرح مبتلا ہو جائیں گے جیسے وہ ان کے لیے حلال ہے۔ فتح الباری ۱۰/۴۸۔ حقیقت یہ ہے کہ خز کی ممانعت کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔

[۱] ابوداؤد، کتاب اللباس، باب الرخصۃ فی العلم وخیط الحریر۔ اس کے ایک راوی خصیف کے بارے میں امام زیلعی فرماتے ہیں: ضعفہ غیر واحد من اھل العلم (ایک سے زیادہ اہل علم نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ روایت طبرانی میں بھی ہے اس کی سند حسن ہے ایک اور سلسلہ سند سے بھی یہ روایت طبرانی میں ہے۔ حاکم نے بھی اسی روایت کو تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ صحیح سند سے روایت کیا ہے۔ فتح الباری ۱۰/۲۴۸

ابن عربی کہتے ہیں اس بات کی دلیل کہ صرف خالص ریشم ہی حرام ہے یہ ہے کہ سوتی (اور اونی) کپڑا تو پہننے کی صریح اجازت ہے۔ اگر اس میں ریشم اس طرح مخلوط ہو کہ اسے ریشمین کپڑا نہ کہا جاسکے تو اسے بھی جائز ہونا چاہیئے۔[1]

فقہاء کا مسلک

ریشم ملے ہوئے کپڑے کے بارے میں شوافع کے ہاں دو رائیں ملتی ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ اگر کپڑے میں ریشم کا وزن مخلوط چیز سے کم ہو تو جائز اور اور زیادہ ہو تو ناجائز ہے۔ اسی رائے کو ترجیح حاصل ہے دوسری رائے یہ ہو کہ دیکھنے میں ریشم زیادہ لگتا ہو تو ناجائز ہوگا اور کم معلوم ہو تو جائز ہوگا۔ قفال نے اس رائے کو اختیار کیا ہے۔[2]

ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں ریشم ملے ہوئے کپڑے میں یہ دیکھا جائے گا کہ ریشم غالب ہے یا نہیں۔ اگر ریشم کم ہے تو اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں۔ ابن عباس اور اہل علم کی ایک جماعت کا مسلک یہ ہے کہ خالص ریشم جس میں کوئی دوسری چیز شامل نہ ہو وہی حرام ہے۔ اگر ریشم تھوڑی مقدار میں ہو تو جائز ہے اس کے برعکس روئی کی مقدار تھوڑی ہو تو حرام ہے۔ اگر دونوں برابر کی مقدار میں ہوں تو اسکے جواز کی رائے بھی دی گئی ہے اور عدم جواز کی بھی۔ ابن عقیل کہتے ہیں کہ اس کی حرمت قرین قیاس ہے۔ اس لیے کہ آدھی مقدار کو زیادہ ہی کہا جائے گا۔ جبّہ اور گدّے وغیرہ کے اندر ریشم بھرا جائے تو قاضی کے نزدیک وہ حرام نہیں ہے۔ یہی امام شافعی کا مسلک ہے اس کی حرمت کی رائے بھی دی جاسکتی ہے۔ اس لیے کہ احادیث میں ریشم کے استعمال کی جو ممانعت آئی ہے وہ بالکل عام ہے۔[3]

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کہ کپڑے میں صرف تانا ریشم کا ہو اور بانا کسی اور چیز کا تو اس پر ریشم کے کپڑے کا اطلاق نہیں ہوتا، اس لیے وہ جائز ہوگا۔ کپڑے میں اصل اہمیت بانے کی ہے اور اسی کا اعتبار کیا جائے گا۔[4]

---

[1] فتح الباری ۱۰/۲۴۹ - [2] فتح الباری ۱۰/۲۴۸ - [3] ابن قدامہ: المغنی ۱/۶۲۷ - ۶۲۸ - [4] ہدایہ ۴/۴۵۴ -

ریشم اگر تانے کی جگہ بانے میں استعمال کیا جائے اور وہ اتنا زیادہ ہو کہ کپڑا ریشم ہی کا معلوم ہونے لگے تو ناجائز ہوگا ورنہ ناجائز نہ ہوگا۔ کپڑے میں جو ریشم منتشر طور پر پایا جائے اسے جمع کرکے حساب نہیں کیا جائے گا[۱]

کپڑے پر ریشم کے نقش و نگار ہوں اور کوئی بھی نقش چار انگشت سے زیادہ نہ ہو تو اس کا استعمال جائز ہے۔ چاہے ان سب کو ملانے سے وہ اس مقدار سے زیادہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ ہاں اگر کپڑا ریشم ہی کا معلوم ہونے لگے تو ناجائز ہوگا[۲]

کپڑے اندر بھرتی کے لیے بھی ریشم کا استعمال جائز ہے[۳]

امام شوکانی کی رائے متاخرین میں امام شوکانی نے جمہور کے مسلک سے اختلاف کیا ہے اور اس پر سخت تنقید کی ہے۔ ذیل میں ان کے دلائل کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ساتھ ہی ان کا تھوڑا سا تجزیہ بھی کیا جائے گا۔

فرماتے ہیں سعد دمشقی والی روایت میں، ایک صحابی نے 'خز' کے عمامہ کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ:

کسانیھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ پہنایا۔

اس سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ اس کا پہننا جائز ہے۔ اس لیے کہ یہی الفاظ حضرت علی رضؓ نے بھی ایک موقع پر استعمال کیے ہیں:

کسانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حُلّۃ سیراء۔	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے ریشم ملے ہوئے کپڑے کا جوڑا پہنایا۔

لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ پہنے دیکھا تو ناخوشی کا اظہار فرمایا۔ حضرت علی رضؓ کی روایت سے ہم آگے چل کر بحث کریں گے۔ یہاں صرف یہ عرض کرنا

---

[۱] رد المحتار علی الدر ۵/۳۱۳۔ [۲] حوالہ سابق ص ۳۰۸ [۳] ہدایہ ۴/۴۵۲

ہے کہ 'کسانی' کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دست مبارک سے خز پہنایا اور یہ بھی کہ خز پہننے کے لیے عطا فرمایا۔ لیکن زیر بحث روایت سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی کو 'خز' کا عمامہ باندھا۔ اسی بنیاد پر انھوں نے اسے جائز سمجھا اور مستقل اسے استعمال فرماتے رہے۔ ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ آپ کا منشا انھوں نے نہیں سمجھا۔ اس کے لیے کوئی مضبوط دلیل ہونی چاہیے۔ اور یہاں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے۔

۲۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضؓ کی روایت کے بارے میں فرماتے ہیں۔ ایک تو یہ ضعیف ہے۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے تو صرف یہ کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خالص ریشم سے منع فرمایا ہے۔ دوسرے صحابہ رضؓ نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ آپ نے ریشم ملے ہوئے کپڑے سے بھی منع فرمایا ہے۔ اس لیے اس اضافہ کے ساتھ ہی ریشم کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا۔

جیسا کہ اس سے پہلے گزر چکا یہ حدیث مختلف سندوں کے ساتھ آئی ہے۔ ان میں سے بعض کو محدثین نے 'حسن' اور 'صحیح' بھی قرار دیا ہے۔ اس لئے اس کے قابل استدلال ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں ہے، دوسری بات یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضؓ یہ نہیں فرماتے ہیں کہ ریشم کے استعمال کے بارے میں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا سنا، یا ان کی کیا معلومات ہیں بلکہ وہ اس سلسلہ میں شریعت کا حکم بیان کرتے ہیں کہ آپ نے چونکہ صرف خالص ریشم کے استعمال سے منع فرمایا تھا، اس لیے ریشم ملے ہوئے کپڑے کے استعمال میں قباحت نہیں ہے۔

۳۔ صحابہ رضؓ کے عمل کے بارے میں فرماتے ہیں کسی مسئلہ میں بعض بلکہ بہت سے صحابہ کا عمل بھی کوئی حجت نہیں ہے۔ حجت تو ان کا اجماع ہے اور وہ بھی ان لوگوں کے نزدیک جو اسے حجت سمجھتے ہیں۔ اگر بعض صحابہ کا 'خز' استعمال کرنا اس کے جواز کی دلیل ہے تو

خالص ریشم کا استعمال بھی جائز ہوگا۔ اس لیے کہ ابو داؤد کی روایت کے مطابق بیس صحابہ نے ریشم کا کپڑا پہنا ہے۔

صحابہ شریعت کے سب سے پہلے مخاطب تھے۔ وہ شریعت کا منشا بھی دوسروں سے بہتر طریقے سے سمجھتے تھے اور اس کی اتباع کا جذبہ بھی ان میں سب سے زیادہ تھا۔ اس لیے ان کے عمل یا اسوہ کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ان کا عمل کسی حکم صریح کے خلاف مل رہا ہو تو بھی اس کی توجیہ و تاویل کی جائے گی لیکن اگر کسی حکم کے ساتھ ان کا عمل بھی ہو تو اس سے اس کی مزید تائید اور توثیق ہوگی۔ یہاں یہی صورت ہے، ایک طرف تو روایات سے خز کا جواز ثابت ہے۔ دوسری طرف صحابہ کے عمل سے اس کی تائید اور تصدیق ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف خالص ریشم کے استعمال سے احادیث میں صراحتاً منع کیا گیا ہے۔ اگر بعض صحابہ نے ریشم استعمال کیا تھا تو اس کی توجیہ کی جانی چاہیے اور فی الواقع کی گئی ہے۔ باقی رہا ان کے اجماع کے بارے میں امام شوکانی نے جو کہا ہے تو اسے ان کے تفردات میں شمار کرنا چاہیے۔ یہاں اس سے بحث نہیں ہے۔

۴۔ فرماتے ہیں، بعض لوگوں نے اس سلسلہ میں اجماع کا بھی دعویٰ کیا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اجماع کوئی حجت نہیں ہے۔ اجماع کے بارے میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ کیا اس کا امکان ہے، کیا فی الواقع وہ ہوا بھی ہے؟ اور ہم تک نقل بھی ہوا ہے؟ ان میں سے ہر سوال قابلِ غور ہے۔ پھر یہ کہ علامہ ابن دقیق العید نے اس سے اختلاف کیا ہے اس لیے اجماع کا دعویٰ یوں بھی صحیح نہیں ہے۔

اجماع کے بارے میں امام شوکانی نے جو کہا ہے۔ یہاں ہم اس سے تعرض نہیں کریں گے۔ البتہ علامہ ابن دقیق العید کے متعلق ان کا خیال صحیح نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں، حدیث سے چار انگلیوں کے برابر ریشم کے استعمال کی اجازت ہے، اس پر اگر قیاس کیا جائے تو یہ کہا جائے گا کہ پورے کپڑے کے اندر جو ریشم ہو وہ اس مقدار سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے[1]

[1] فتح الباری ۱۰/ ۲۴۸

اس سے بظاہر ان کو اختلاف نہیں ہے کہ ریشم ملا ہوا کپڑا پہنا جا سکتا ہے البتہ ریشم کتنی مقدار میں ہو اس کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے کہ کپڑے کے چاروں طرف چار انگلیوں کی چوڑائی کے برابر گوٹ میں جتنا ریشم لگتا ہے وہ اس سے زیادہ نہیں ہونا چاہیئے۔

۵۔ فرماتے ہیں یہ بات بھی کوئی معنی نہیں رکھتی کہ یہ قولِ جمہور ہے۔ حق کو اشخاص سے نہیں دلائل سے پہچانا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جمہور کا قول بھی رد کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس کے خلاف کوئی مضبوط دلیل ہو۔ زیر بحث مسئلہ میں دلائل ان ہی کے حق میں ہیں۔

۶۔ فرماتے ہیں ان سب بحثوں سے قطع نظر خود اس میں اختلاف ہے کہ خز کس کپڑے کو کہا جاتا ہے؟ اس میں کسی ایک کو اختیار کرنا اور دوسرے کو چھوڑ دینا صحیح نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اختلاف بہت سے مسائل میں ہوتا ہے لیکن دلائل کی بنا پر کسی نہ کسی پہلو کو ترجیح دی جاتی ہے، علماء کا تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ کم از کم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے دور میں خز خالص ریشم کے کپڑے کو نہیں کہا جاتا تھا بلکہ ریشم ملے ہوئے کپڑے کو کہا جاتا تھا، اختلاف جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ ریشم کس چیز کے ساتھ شامل ہوتا تھا اس سے اصل مسئلے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

امام شوکانی نے اپنے دعوے کی تائید میں دو حدیثیں بھی پیش کی ہیں:

(۱) حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ ریشم کا ایک جوڑا (حلّہ سیراء) بازار میں دیکھ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ اسے خرید لیں اور باہر سے جب وفود آئیں یا جمعہ میں زیب تن فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا، "اسے تو وہ شخص پہنتا ہے جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے"[1]

(۲) حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ریشم کا ایک جوڑا (حلہ سیراء)

---

[1] بخاری، کتاب اللباس، باب الحریر للنساء، مسلم، کتاب اللباس والزینۃ۔

مجھے بھجوایا۔ میں اسے پہن کر نکلا تو آپ کے چہرے پر غصہ کے آثار دیکھے۔ آپؐ نے فرمایا، میں نے یہ اس لیے نہیں بھجوایا تھا کہ تم اسے پہنو بلکہ اس لیے بھجوایا تھا کہ عورتوں کے لیے اوڑھنیاں بنوادو۔ چنانچہ میں نے اس کی اوڑھنیاں بنوادیں[1]

یہ حلّہ سیراء، جس کا ذکر ان حدیثوں میں ہے اس کے بارے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کے کپڑے کا تھا۔ اہلِ لغت کا کہنا ہے کہ سیراء خالص ریشم کا نہیں ہوتا بلکہ ریشم کی دھاریاں اس میں ہوتی ہیں۔

امام شوکانی فرماتے ہیں اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ریشم ملے ہوئے کپڑے کا استعمال صحیح نہیں ہے[2]

محدثین اس تحقیق کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک سیراء خالص ریشم کا ہوتا ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں مختلف روایتوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ (حلیہ سیراء خالص ریشم کے جوڑے کو بھی کہا گیا ہے اور ریشم ملے ہوئے جوڑے کو بھی۔ روایات سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے جس جوڑے کا ذکر کیا تھا وہ خالص ریشم کا تھا۔ البتہ حضرت علیؓ کو جو جوڑا بھجوایا تھا وہ مخلوط ریشم کا تھا۔ لیکن حضرت علیؓ کے لیے اسے بھی آپؐ نے پسند نہیں فرمایا۔ چنانچہ اسی سلسلے کی ایک روایت میں آتا ہے: لا ارضی لک الا ما ارضی لنفسی (میں تمہارے لیے وہی بات پسند کرتا ہوں جو اپنے لیے پسند کرتا ہوں)[3]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ریشم ملے ہوئے کپڑے کو آپ نے حرام نہیں قرار دیا، البتہ حضرت علیؓ کے لیے اسے پسند نہیں فرمایا:

ریشم کی دوسری مصنوعات کا استعمال عورتوں کے لیے

عورتوں کے لیے ریشم کا استعمال بالاتفاق جائز ہے۔ کیا لباس کے علاوہ ریشم کی

---

[1] بخاری، کتاب اللباس، باب الحریر للنساء۔ مسلم، کتاب اللباس والزینۃ۔ [2] تفصیل کے لیے دیکھیے نیل الاوطار ۲/ [3] فتح الباری ۱۰/۲۵۳-۲۵۴۔

اور چیزیں بھی وہ استعمال کر سکتی ہیں؟ اس سلسلہ میں ایک رائے یہ ہے کہ عورتوں کے لیے لباس کی طرح ریشم کی دوسری مصنوعات بھی جائز ہیں۔ اس کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ جن حدیثوں میں ریشم کے استعمال سے منع کیا گیا ہے ان میں خطاب مردوں سے ہے عورتیں اسمیں داخل نہیں ہیں۔ دوسری رائے یہ ہے کہ عورتوں کے لیے صرف ریشم کا لباس مباح ہے۔ ریشم کی اور مصنوعات کے سلسلے میں مردوں اور عورتوں کا ایک ہی حکم ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کو سونے چاندی کے زیور پہننے کی اجازت دی، اور دوسرے استعمالات سے جس طرح مردوں کو منع کیا اسی طرح عورتوں کو بھی منع کیا۔ اسی پر ریشم کو قیاس کرنا چاہیے۔ کیونکہ تینوں کا حکم ایک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ریشم کا لباس تو عورتوں کے لیے جائز ہے اور مردوں کے لیے ناجائز ہے لیکن جہاں تک ریشم کے دوسرے استعمالات کا تعلق ہے اس میں دونوں صنفوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، دونوں کے لیے ایک ہی طرح کے احکام ہیں۔[1]

بچوں کے لیے سونے چاندی اور ریشم کا استعمال

سونے، چاندی اور ریشم کا استعمال کیا صرف بڑے آدمیوں ہی کے لیے ممنوع ہے یا نابالغ بچوں کو بھی ان کا استعمال کرانا منع ہے؟۔

شوافع کے نزدیک لڑکوں کو عید میں ریشم کے کپڑے پہنائے جا سکتے ہیں؟ عید کے علاوہ اور دنوں کے بارے میں تین رائیں ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ بچوں کے لیے ہر زمانہ میں ریشم کا استعمال جائز ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں یہی صحیح رائے ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ بچوں کے لیے بھی اس کا استعمال ناجائز ہے۔ تیسری رائے یہ ہے کہ بچوں کے سن تمیز کو پہنچنے کے بعد اس کا استعمال کرانا حرام ہے۔ اس سے پہلے استعمال کرایا جا سکتا ہے۔[2]

امام مالکؒ کے نزدیک لڑکوں کو سونے کی کوئی چیز پہنانا مکروہ ہے۔ فرماتے ہیں مجھ تک یہ روایت پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کی انگوٹھی پہننے سے منع فرمایا۔ اس لیے میں بڑوں اور چھوٹوں دونوں کے لیے اس کے استعمال کو ناپسند کرتا ہوں۔[3]

---

[1] فتح الباری ۱۰/۲۴۶ — [2] نووی شرح مسلم ۱۴/۳۳ — [3] موطا کتاب الجامع باب ما جاء فی لبس الثیاب المصبغة والذہب۔

فقہ حنبلی میں بچوں کو ریشم استعمال کرانے کے بارے میں دونوں طرح کی رائیں پائی جاتی ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ بچوں کو ریشم کے کپڑے پہنائے جاسکتے ہیں۔ دوسری رائے یہ ہے کہ ان کو ریشم کا لباس پہنانا حرام ہے۔ ابن قدامہ حنبلی نے اسی کو صحیح رائے قرار دیا ہے۔ ان کی ایک دلیل یہ ہے کہ مردوں کے لیے ریشم کو حرام ٹھہرایا گیا ہے۔ اس میں بچوں اور بڑوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے۔ اس لیے اس کی حرمت بھی دونوں ہی کے لیے ہے۔ دوسری دلیل صحابہ کا عمل ہے۔ حضرت جابر رضؓ فرماتے ہیں کہ ریشم کا لباس لڑکوں کے بدن پر ہوتا تو ہم اسے اُتار دیتے تھے۔ اور لڑکیاں پہنتیں تو تعرض نہ کرتے۔ حضرت حذیفہ رضؓ ایک سفر سے واپس ہوئے تو دیکھا کہ ان کے بچے ریشم کی قمیصیں پہنے ہوئے ہیں۔ انھوں نے لڑکوں کے بدن پر جو قمیصیں تھیں وہ پھاڑ دیں اور لڑکیوں کی قمیصوں کو چھوڑ دیا۔ عبدالرحمٰن بن یزید کہتے ہیں کہ ہم چار پانچ آدمی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کا ایک بچہ ریشم کی قمیص پہن کر آیا تو انھوں نے اس سے پوچھا "یہ قمیص تمھیں کس نے پہنائی ہے؟" اس نے جواب دیا: "امی نے"۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ نے اسے چاک کر دیا[1]

فقہاء احناف نے لکھا ہے کہ کم سن لڑکوں کو بھی سونے چاندی کا زیور اور ریشم کا لباس پہنانا مکروہ ہے[2] اس لیے کہ نص (حدیث) نے سونے اور ریشم کو امت کے مردوں پر حرام قرار دیا ہے۔ اس میں بالغ اور نابالغ آزاد اور غلام کے درمیان فرق نہیں کیا ہے۔ البتہ گناہ بچوں پر نہیں ہوگا بلکہ ان پر ہوگا جو اسے یہ چیزیں پہنائیں۔ علامہ ابن عابدین کہتے ہیں: "بظاہر مرد اور عورت دونوں ہی کے لیے مکروہ ہے کہ بچہ کو سونا اور ریشم پہنائیں[3]"

بیشتر فقہاء کی یہی رائے ہے اور یہی رائے صحیح ہے کہ نابالغ لڑکے کو بھی سونا، چاندی اور ریشم نہ استعمال کرایا جائے۔ تربیت کے نقطۂ نظر سے بھی یہی مناسب ہے کہ شروع ہی سے بچے کے دل میں شریعت کا احترام پیدا کیا جائے اور جہاں تک ہو سکے اسے اس کا پابند بنایا جائے۔ ●●

---

[1] ابن قدامہ: المغنی ۱/۶۲۹۔ [2] ہدایہ کتاب الکراہیہ ۴/۴۵۵-۴۵۶۔ [3] رد المحتار علی الدر المختار ۵/۳۱۸۔

سید مرتضیٰ بلگرامی مؤلفِ تاج العروس

از پروفیسر خورشید احمد فارق صاحب، دہلی یونیورسٹی۔ دہلی

ہندوستانی بالعموم اور عرب بالخصوص یہ سمجھتے ہیں کہ سید مرتضیٰ بلگرامی یمن کے خوش آیند شہر زبید میں پیدا ہوئے تھے، حال میں شام کے ایک صاحبِ قلم عالم علی طنطناوی کے مضامین کا مجموعہ نظر سے گزرا جس میں ایک مضمون بلگرامی پر بھی ہے، لکھتے ہیں کہ:

"بلگرامی یمن کے شہر زبید میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم پائی۔"

مُنجد کے قاموسِ اعلام میں بھی ان کے بارے میں "وُلد بالیمن" قلمبند ہوا ہے جن پڑھے لکھے لوگوں سے وقتاً فوقتاً تاج العروس کا ذکر آیا، ان کی باتوں سے بھی مترشح ہوا کہ وہ بلگرامی کو زبید کا باشندہ سمجھتے ہیں۔ بلگرامی ۱۱۴۵ھ میں اورنگ زیب کی وفات کے کوئی چالیس سال بعد شہر قنوج کے قریب واقع پرگنہ بلگرام کے خاندانِ سادات میں پیدا ہوئے تھے، اس خاندان کو بلگرام میں خاص وجاہت حاصل تھی، اس کے بہت سے باصلاحیت لوگ علمی افق پر چمکے تھے اور سرکاری مناصب پر بھی فائز ہوئے تھے۔ بلگرامی کا قد متوسط تھا جسم چھریرا، اعضا متناسب، رنگ گلابی، بات چیت کا انداز دلکش، ذہن رسا حافظہ بہت اچھا۔ اپنے وطن کے اساتذہ سے تعلیم پانے کے بعد انھوں نے دوسرے شہروں کے محدثین سے بھی استفادہ کیا جن میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ بھی شامل تھے، پھر علمی پیاس انھیں یمن لے گئی اور زبید یمن کے علمی حلقوں میں شرکت کر کے انھوں نے لغت، حدیث اور فقہ کی استعداد بڑھائی۔ اس وقت ان کی

عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہ تھی، کئی برس تک زبید کے دل لگاؤ ماحول اور معتدل آب و ہوا میں کسب علم کرنے کے بعد بلگرامی مکّے چلے گئے اور وہاں کے محدثوں اور فقیہوں کے حلقوں میں شریک ہوئے، مکے کے ایک استاد نے انھیں مصر کے علمی افق پر چمکنے اور کسب معاش کے روشن امکانات سے فائدہ اٹھانے کا مشورہ دیا۔ مصر میں ان کی قدر و منزلت ہوئی، قاہرہ کی ایک مسجد میں انھوں نے اپنا درسی حلقہ کھول لیا، اس حلقے میں وہ فیروز آبادی کی مشہور ڈکشنری "قاموس" کی شرح بیان کرتے تھے، شرح کے لیے انھیں لغت کی سیکڑوں کتابیں قاہرہ کے کتب خانوں میں مل جاتی تھیں، وہ ان کا مطالعہ کر کے قاموس کے الفاظ کی شرح انھیں کتابوں کے الفاظ میں لکھتے اور پھر اپنے حلقے میں آکر لغت اور ادب کے طالبوں کے سامنے سبقاً سبقاً بیان کر دیتے تھے، یہ سلسلہ چودہ سال سے زیادہ جاری رہا، اس اثناء میں ان کے بہت سے شاگرد ہو گئے جن میں حکمراں، زمیندار اور مالدار تاجروں کا تناسب خاصا تھا، ان کے تحفے تحائف اور مالی عطیات سے بلگرامی کی معقول آمدنی تھی، صورت شکل اچھی تھی، لباس عمدہ قسم کا پہنتے تھے۔ بات چیت کا انداز دلکش تھا، لغت اور ادب پر گہری نظر تھی، لگن، تحقیق اور کاوش سے شرح کے لیے مواد جمع کرتے تھے اور اسے سلجھے ہوئے دلنشیں انداز میں پیش کرتے تھے اس لیے بہت جلد مشہور ہو گئے اور چند ہی ماہ میں قاہرہ کے درباری اور خوشحال حلقوں میں ان کا چرچا ہونے لگا، بڑے لوگ اپنے لڑکوں اور اقرباء کو ان کے درس میں لغت اور ادب کی تعلیم کے لیے بھیجنے لگے اور انھیں تحفے تحائف دیگر علم و فضل سے اپنی دلچسپی کا اظہار کرنے لگے۔ چودہ سال بعد جب قاموس کی شرح مکمل ہوئی تو بلگرامی نے اس کا نام "تاج العروس" رکھا اور تکمیل کی خوشی میں بڑے پیمانے پر دعوت کی جس میں شاگردوں کے علاوہ شہر کے علماء، اعیان اور بڑے لوگوں کو مدعو کیا۔ اس دعوت کا مقصد علماء اور اکابر سے شخصی ربط اور تعارف پیدا کرنا تھا، دعوت کے موقع پر بلگرامی نے علماء اور اعیانِ شہر کے سامنے اپنی شرح کے مناقب بیان کیے اور اس کی امتیازی خوبیوں سے انھیں واقف کرایا ایسے خوبصورت

پُر وقار انداز ہیں اور علم و فضل کی ایسی گہرائیوں میں اتر کر کہ حاضرین پر ان کی لیاقت، تقوی عظمت اور دلکش شخصیت کا سکہ بیٹھ گیا، اکابر و امراء کی مجلسوں میں ان کی مانگ ہوگئی، بڑے لوگوں کی معرفت دور دور تک ان کی شہرت پہنچ گئی، ان کی تاج العروس کا ہر طرف شہرہ ہوگیا مالداروں، علم دوست تاجروں اور حکمرانوں کی طرف سے تاج العروس کے نسخے طلب کیے جانے لگے اور اس کے مطالعے کے بعد ان لوگوں کی طرف سے بلگرامی کو بڑے بڑے عطیات پیش کیے جاتے تھے۔

لغت و ادب کے میدان میں اپنا سکہ جمانے اور اعیان و اکابر کو اپنی علمی عظمت کا معترف بنانے کے بعد بلگرامی نے حدیث کی طرف توجہ کی، یہ وہ فن تھا جس سے عام لوگوں کو بڑی عقیدت تھی اور بلگرامی عوام میں اپنی مقبولیت بڑھانا چاہتے تھے، قاہرہ کے کتب خانے کتابوں سے بھرے ہوئے تھے اس لیے بلگرامی کو حدیث کی کتابوں کی واضح اور مبسوط شرح کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ ان کا حافظہ طاقت ور تھا اس لیے ہر حدیث کی اسناد انھوں نے حافظے میں محفوظ کرلی، ہر غریب لفظ کا مفہوم و مدلول اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ رواۃ حدیث (اسناد) کے حالات یاد کر لیے مشکل اعلام کا صحیح تلفظ متعلقہ کتابوں سے دریافت کر لیا اور اپنے دلکش انداز بیان اور علمی وقار کے ساتھ احادیث کی توضیح و تشریح کرنے لگے۔ اس میدان میں بھی انھیں غیر معمولی کامیابی ہوئی عوام ان کے معتقد ہو گئے اور دل و جان سے ان کی عزت کرنے لگے، خواص و اکابر کی نظر میں ان کی قدر و منزلت پہلے سے زیادہ ہوگئی اور اب وہ خود تحفے تحائف اور مالی عطیات لے کر ان کے گھر آنے لگے اور انھیں عالم کے ساتھ ایک مقدس شخصیت خیال کرنے لگے۔ چند سال بعد بلگرامی نے لوگوں کے دلوں میں اپنی عظمت و عقیدت کا نقش گہرا کرنے اور اپنے قدردانوں کا دائرہ وسیع تر کرنے کے لیے حدیث کے ساتھ گنڈے تعویذ اور اَوراد و اذکار، نیز جھاڑ پھونک کا بھی اضافہ کر دیا، مصر کے عوام اور بہت سے خواص جن میں حکمراں طبقے، فوجی اکابر، زمینداروں اور مالدار تاجروں کا بڑا تناسب تھا، تعویذوں،

اورادواذکار اور جھاڑ پھونک پر گہرا عقیدہ رکھتے تھے اور ایسے لوگوں کو اپنا قبلہ وکعبہ بنا لیتے تھے، جن کے تعویذوں کے بارے میں مشہور ہو جاتا کہ کبھی خطا نہیں کرتے، ان کی بتائی ہوئی دعائیں پوری ہوتی ہیں اور جھاڑ پھونک، بلاؤں اور مصیبتوں کو ٹال دیتی ہے۔

بلگرامی کے زمانے میں ترکی کی عثمانی خلافت پر انحطاط کے بادل چھائے ہوئے تھے اور اس کے اہم صوبوں، مصر، شام، لبنان، اور شمالی افریقہ میں سیاسی قسمت آزما اور فوجی سالار ذاتی حکومتیں قائم کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے، ان لوگوں میں بھی گنڈے تعویذوں اور دعاؤں کی بڑی مانگ تھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ گنڈے تعویذ اور قرآن کی مخصوص آیتوں کا وِرد دشمنوں کو نیچا دکھانے میں مادّی طاقت سے زیادہ کارگر ثابت ہوتے ہیں۔ بلگرامی ان لوگوں کے بھی قبلہ و کعبہ بن گئے۔ یہ لوگ خود بھی عقیدت سے معمور دل اور بڑے بڑے قیمتی تحفے لے کر ان کے گھر آتے اور تعویذ و اوراد لیتے اور ان کے نمائندے بھی شام، لبنان، فلسطین، تونس، الجیریا، مراکش، سوڈان اور دوسرے علاقوں سے عطیات و تحائف لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ یہ بلگرامی کے مادی عروج اور روحانی وجاہت کا زمانہ تھا جب ہزاروں، لاکھوں آدمیوں کو حرکت میں لانے کے لیے ان کا اشارہ کافی تھا۔ انھوں نے مہدی منتظر کا روپ بھرنے کا ارادہ کر لیا اور خفیہ طور پر مصر، شام اور لبنان وغیرہ کے عقیدت مند اور تعویذوں کے گاہک ترکی حکومت سے باغی فوجی سالاروں، غاصبوں اور قسمت آزماؤں کو ان کے تاثرات معلوم کرنے کے لیے مراسلوں اور سفیروں کے ذریعہ اپنے مہدی منتظر ہونے کی خبر دینے لگے۔ ان کی یہ خواہش پروان چڑھنے کے لیے ماحول تیار ہو رہا تھا کہ قاہرہ میں طاعون کی وبا پھیلی، بلگرامی اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ کوئی تعویذ گنڈا، وِرد و ذکر کام نہ آیا اور انسٹھ سال کی عمر میں اپنی آرزو دل میں لیے دنیا سے رخصت ہو گئے۔

تاج العروس بلگرامی نے پچاس اور بقول بعض سو سے زیادہ رسالے اور کتابیں (مضمون) لکھی تھیں، ان میں سے

صرف چار چھپی ہیں ۔تاج العروس، اتحاف السادۃ المتقین، شرح احیاء العلوم غزالی، عقود الجواہر المنیفۃ فی أدلۃ مذہب الإمام أبی حنیفۃ اور بلغۃ الأریب فی مصطلح آثار الحبیب، باقی کتابیں حدیث، فقہ حنفی، لغت اور نحو سے متعلق ہیں، یہ سب روایتی موضوعات ہیں۔ جن پر بلگرامی سے پہلے سیکڑوں ہزاروں کتابیں لکھی جا چکی تھیں، انہی کی مدد سے انھوں نے یہ کتابیں مرتب کی تھیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ان کے اقتباسات ہی سے انھوں نے اپنی تالیفوں کا پیٹ بھرا ہے، اسی لیے انھیں طباعت کے لیے موزوں نہیں سمجھا گیا اور آج تک گمنامی کے گوشے میں پڑی ہوئی ہیں، ان کی چار مطبوعہ کتابوں میں تاج العروس سب سے اہم ہے، یہ فیروزآبادی متوفی ۸۱۷ھ کی قابلِ قدر ڈکشنری قاموس کی شرح ہے۔ بلگرامی سے پہلے بھی اس کی متعدد شرحیں لکھی جا چکی تھیں جن میں اُن کے ایک استاد محمد بن طیب فاسی متوفی ۱۱۷۰ھ کی شرح سب سے بہتر تھی اور اسی کو سامنے رکھ کر اور مشعلِ راہ بنا کر بلگرامی نے اپنی شرح مرتب کی تھی۔ انھوں نے سو کے قریب ڈکشنریوں اور لغت و تاریخ کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے جن میں جوہری کی صحاح ازہری کی تہذیب، ابن سیدہ کی محکم، محمد بن مکرم افریقی کی لسان العرب، صغانی لاہوری کی عُباب اور تکملۃ علی صحاح الجوہری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بلگرامی کی ساری شرح جیسا کہ مقدمے میں انھوں نے اعتراف کیا ہے دوسری کتابوں سے ماخوذ ہے، انھوں نے لغوی معاملات میں اپنی طرف سے کوئی تنقیدی یا اجتہادی رائے ظاہر نہیں کی ہے، حد یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مقدمے تک میں بہت سے جملے جوں کے توں لسان العرب کے مقدمے سے لے لیے ہیں، لسان العرب کے مقدمے میں یہ عبارت ملتی ہے:

"فانتظم شمل تلک الأصول[1] فی ھذا المجموع وصار ھذا بمنزلۃ الاصل

---

[1] اصول سے لغت کی چار بنیادی کتابیں مراد ہیں جن پر مؤلف نے اپنی کتاب کی عمارت بلند کی ہے: صحاح جوہری، تہذیب ازہری، محکم ابن سیدہ اور ابن بری کے امالی۔

وأولئك بمنزلة الفروع، فجاء بحمد الله وفق البُغية وفوق المنية بديع الإتقان صحيح الأركان سليما من لفظ ولو كان حللتُ بوضعه ذروة الحفاظ وحللت بجمعه عقدة الألفاظ وأنا مع ذلك لا أدعي فيه دعوى فأقول شافهت أو سمعت أو فعلت أو صنعت أو شددت أو رحلت أو نقلت من العرب العرباء أو حملت .... وليس لي في هذا الكتاب فضيلة أمُتّ بها ولا وسيلة أتمسك بسببها سوى أني جمعت فيه ما تفرق في تلك الكتب من العلوم وبسطت القول فيه ولم أشبع باليسير وطالب العلم منهوم، فمن وقف فيه على صواب أو زلل أو صحة أو خلل فعهدته على المصنف الأول وحمده وذمه لأصله الذي عليه المعول لأنني نقلت من كل أصل مضمونه ولم أبدل منه شيئاً فيقال فإنما إثمه على الذين يبدلونه بل أديت الأمانة في نقل الأصول بالفص لہ"

تقریباً یہ ساری عبارت بلا اعتراف ماخذ بلگرامی نے اپنے مقدمے میں داخل کر لی ہے تاج العروس کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے بہت سی عربی ڈکشنریوں کے مطالعے سے بے نیاز کر دیا ہے، اس کے سینے میں مفردات لغت سے متعلق بیشمار ی شرحی تفصیلات محفوظ ہیں جو عربی ڈکشنریوں میں مندرج ہیں، اس کی دوسری امتیازی فضیلت یہ ہے کہ قاموس کے مؤلف کے شرح کیے ہوئے الفاظ سے مشتق جو نام اور نسبتیں یا اعلام اکثر چھوٹ گئے تھے بلگرامی نے ہر لفظ کی شرح کے آخر میں "ومما یستدرك علیه" کا باب باندھ کر ان کا صحیح تلفظ متعین کر دیا ہے۔ اسی طرح دوسرے یا تیسرے درجے کے محدثوں کے نام یا نسبتیں جو شرح کیے ہوئے لفظ سے مشتق ہیں اور جنھیں فیروز آبادی نے نظر انداز کر دیا تھا، بلگرامی نے مع سنہ وفات بیان کر دیے ہیں۔ حدیث کے علاوہ دوسرے علوم کے فضلاء اور مصنفوں کے نام نہ فیروزآبادی

لہ لسان العرب (بیروت) ۱/۹

نے دیئے ہیں نہ بلگرامی نے مُنمّق ابن جیب کی تصحیح کے دوران مجھے اس کتاب میں ایسے بہت سے اجنبی اعلامِ اشخاص و امکنہ ملے جو کسی دوسرے قاموس میں دستیاب نہیں ہوئے، بلگرامی نے ان میں سے بیشتر کی باب استدراک ہیں تلفظ متعین کر کے وضاحت کر دی ہے، اجنبی اور غریب الفاظ انھوں نے زیادہ تر صغانی کی عُباب اور تکملہ علی الصحاح سے اخذ کیے ہیں اور یہ دونوں بلند پایہ کتابیں جیسا کہ معلوم ہے مطبوعہ شکل میں دستیاب نہیں۔

ذیل میں ہم لسان العرب اور تاج العروس میں کی ہوئی دو لفظوں کی شرح پیش کرتے ہیں تاکہ قاری کو ان عظیم ڈکشنریوں کے اُسلوبِ بیان اور دائرۂ تشریح کا اندازہ ہوسکے۔

لسان العرب[1] مادہ فدك:

فدك القطن تفديكا وهی لغۃ أزدیۃ وفدك وفدكی اسمان وفُدیك اسم عربی وفدك موضع بالحجاز، قال زهیر:

لئن حللت بجو فی بنی أسد فی دین عمرو وحالت بیننا فدك

الأزهری: فدك قریۃ بخیبر قیل بناحیۃ الحجاز فیها عین ونخل أفاء اللّٰہ علی نبیہ وكان علی والعباس علیهما السلام یتنازعانها وسلمها عمر[رض] إلیهما فذكر علی[رض] أن النبی كان جعلها فی حیاتہ لفاطمۃ وولدها وأبی العباس ذلك. وأبو فدیك رجل والفدیكات قوم من الخوارج نسبوا إلی أبی فُدیك الخارجی۔

تاج العروس[2]:

(فَدَك محركۃ بلدۃ بخیبر[3]) فیها نخل وعین أفاء اللّٰہ علی نبیہ[ص] وكان

---

[1] ۲۷۳/۰. [2] پہلا مصری ایڈیشن ۷/۱۶۶. [3] بریکٹ میں قاموس کا متن ہے جس کی بلگرامی شرح کرتے ہیں۔

علی رض والعباس يتنازعانها وسلمها عمر رض اليهما فذكر علی رض أن النبی صلعم كان جعلها فی حياته لفاطمة وولدها وأبى العباس ذلك. قال زهير بن ابى سُلمىٰ:

لئن حللت بجو فی بنی أسد ؛ فی دين عمرو وحالت بيننا فدك

وقال رؤبة بن العجاج الراجز:

كأنه إذ غاد فينا أو زحك ؛ حمى قطيف الخط أو حمى فدك

ر و فدكى بن أعبد) كمربی (أبو صيا أم عمرو بن الأهتم) وأمها بنت علقمه من زُرارة، قال عمرو بن الأهتم:

نمتنی عروق من زُرارة للعلا ؛ ومن فدكى والأشد عروق

ر و فُديك كزبير ع) كما فی العُباب وفی اللسان وفديك اسم عربی او الفُديكات قوم من الخوارج نُسبوا إلى أبى فديك الخارجی) كما فی اللسان والعُباب ر و تفديك القطن (نفشه) قال الجوهری: لغة أزدية ومما يستدرك عليه أبو اسماعيل محمد بن مسلم بن أبى فديك واسم أبى فَديك دينار من ثقات أصحاب الحديث، نقله الصغانی، قلت: وهو مدنی مشهور وقد تكلم فيه ابن سعد، وفُديك أبو بشير الزبيدی له صحبة حجازی، روى عنه حفيده، وفُديك بن عمرو وأبو حبيب لهما صحبة.

لسان العرب مادة خبر[2]

الخبير من أسماء الله عز وجل العالم بما كان وما يكون، وخَبُرتُ بالأمر علمته وخبرت الأمر أخبُره إذا عرفته على حقيقته. وقوله تعالى: فاسأل به خبيراً أى اسئل عنه خبيراً يخبُر. والخَبَر بالتحريك واحد الأخبار والخبر ما أتاك من نبأ عمن تستخبر ابن سيده الخبر النبأ والجمع

لہ ع ، علم ۔ ۲ ۔ ۴/۲۲۶ ۔ ۲۲۹ ۔

أخبار وأخابير جمع الجمع، فاما قوله تعالى: يومئذ تحدث أخبارها فمعناه يوم تزلزل تخبر بما عمل عليها وخبّره بكذا وأخبره نبّأه واستخبر به سأله عن الخبر وطلب أن يخبره، ويقال: تخبّرتُ الخَبَر واستخبرته ومثله تضعّفت الرجل واستضعفته، وتخبّرت الجواب واستخبرته، والاستخبار والتخبّر السؤال عن الخبر، وفي الحديث الحديبية: إنه بعث عيناً من خُزاعة يتخبّر له خبر أنشد ثعلب:

وشِفاء عِيّك خابراً أن تسألي:

فسّره فقال: معناه ما تجدين في نفسك من العِيّ أن تستخبري، ورجل مخبراني: ذو مخبر كما قالوا المنظراني ذو منظر، والخَبْر والخِبْر المزادة العظيمة والجمع خُبور وهي الخبراء ايضا، عن كراع، ويقال الخِبر إلا أنه بالفتح أجود وقال الهيثم: الخَبْر بالفتح المزادة وأنكر فيها الكسر، ومنه قيل: ناقة خَبْرٌ اذا كانت غزيرة والخَبر والخِبْر الناقة الغزيزة اللبن شُبّهت بالمزادة في غزرها، والجمع كالجمع وقد خَبرت خبوراً. عن اللحياني والخَبراءُ المجرتية بالغزر، والخَبرة القاع يُنبت السِدرَ وجمعه خَبرٌ وهي الخبراء ايضا والجمع خبراواتٌ وخَبارٌ، قال سيبويه: وخَبارٌ كسروها تكسير الأسماء وسلّموها على ذلك وان كانت في الأصل صفة لأنها قد جرت مجرى الأسماء، والخَبراء منقع الماء وخصّ بعضهم به منقع الماء في أصول السِدر وقيل: الخبراء القاع ينبت السِدرَ والجمع الخبارى والخبارِى مثل الصحارى والصحارِى والخبراوات يقال: خبِر الموضع بالكسر فهو خَبِرٌ وارض خَبِرة والخَبْر شجر السِدر والأراك وما حولهما من العُشب واحدته خَبرة وخَبراء الخِبرة شجرها وقيل: الخبر منبت السِدر في القيعان والخبراء

قاع مستدير يجتمع فيه الماء وجمعه خبارى وخبارِى وفى ترجمة نقع النقائع خبارى فى بلاد تميم. الليث: الخبراءُ شجراءُ فى بطن روضة يبقى فيها الماء إلى القيظ وفيها ينبت الخَبْر وهو شجر السدر والأراك وحواليها عُشب كثير وتسمى الخَبِرَة والجمع الخَبِرُ وخَبِرَة الخَبِرة شَجَرها، قال الشاعر:

فجادتك أنواء الربيع وهلّلت ؛ عليك رياض من سلام ومن خَبُر

والخَبُر من مواقع الماءِ ماخبِرا لمسيلُ فى الرؤوس فتخوض فيه وفى الحديث: فدفعنا فى خَبارٍ من الأرض أى سهلة لينة، والخَبار من الأرض مالان واسترخى وكانت فيه جِحَرَة، والخبار الجراثيم وجِحرة الجُرذان واحدته خَبارة، وفى المثل: من تجنب الخَبار أمِن العِثار، والخبار أرض رِخوة تتعتع فيه الدواب وأنشد:

تتعتع فى الخَبار إذا علاه ويعثر فى الطريق المستقيم

ابن الأعرابي: والخَبار ما استرخى من الأرض وتَحفَّر وقال غيره وهو ما تهوّر وساخت فيه القوائم وخبِرت الأرضُ خَبَراً كثر خَبارها الخَبْرُ أن تزرع على النصف أو الثلث من هذا وهى المخابرة واشتقت من خيبر لأنها أول ما أقطعت كذلك. والمخابرة المزارعة ببعض ما يخرج من الأرض وهو الخِبْر ايضا بالكسر، وفى الحديث كنا نُخابر ولا نرى بذلك بأساً حتى أخبر رافعٌ أن رسول الله نهى عنها وفى الحديث أنه نهى عن المخابرة، قيل هى المزارعة على نصيب معين كالثلث والربع وغيرها وقيل هو من الخَبار الأرض اللينة وقيل أصل المخابرة من خيبر لأن النبى أقرّها فى أيدى أهلها على النصف من

فصولها فقيل خابرهم أي علمهم وقال اللحياني هي المزارعة فعم بها والمخابرة ايضا المؤاكرة والخبير الأكار قال:

تجز رؤوس الأوس من كل جانب ❊ كجز عقاقيل الكروم خبيرها

رفع خبيرها على تكرير الفعل أراد جزه خبيرها أي أكارها والخَبْرُ الزرع. والخبير النبات وفي حديث طهفة: نستخلب الخبير أي نقطع النبات والعُشب وتأكله شبه بخبير الإبل وهو وبرها لأنه ينبت كما ينبت الوَبَر واستخلابه احتشاشه بالمِخلب وهو المِنجل والخبير يقع على الوَبَر والزرع والأكار والخبير الوبر، قال أبو النجم يصف حمير وحش:

حتى إذا ما طار من خبيرها. والخبير نسالة الشعر والخبيرة الطائفة منه. قال المتنخل الهذلي:

فآبوا بالرماح وهن عوج ❊ بهن خبائر الشعر السقاط، والمخبور الطيب الأدام والخبير الزبد وقيل زبد أفواه الإبل، وأنشد الهذلي:

تغذ من في جانبيه الخبير ❊ لما وهي مزنه واستبيحا

تغذ من يعني المفحول أي مضغن الزبد وعمينه. والخُبر والخُبرة اللحم يشتريه الرجل لأهله يقال للرجل: ما اختبرت لأهلك؟ والخُبرة الشاة يشتريها القوم بأثمان مختلفة ثم يقتسمونها فيسهمون كل واحد منهم على قدر ما نقد، وتخبروا خبرة اشتروا شاة فذبحوها واقتسموها، وشاة خبيرة مقتسمة قال ابن سيده: أراه على طرح الزائد، والخُبرة بالضم النصيب تأخذه من لحم او سمك وأنشد:

بات الربيعي والخامير خُبرته ❊ وطاح طي بني عمرو بن يربوع

وفى حديث أبى هريرة : حين لا آكل الخبير، قال ابن الأثير : هكذا جاء فى رواية أى المأدوم، والخبير والخبرة الأدام، وقيل هو الطعام من اللحم وغيره ويقال : أخبر طعامك أى دسمه وأتانا بخبزة وكم يأتنا بخبرة، وجمل مختبر كثير اللحم والخبرة الطعام وما قدم من شىء وحكى اللحيانى أنه سمع العرب تقول : اجتمعوا على خبرته يعنون ذلك والخبرة الثريدة الضخمة، وخبر الطعام يخبره خبراً دسمه والخابور نبت أو شجر قال :

أيا شجر الخابور مالك مورقا ٭ كأنك لم تجزع على ابن طريف

والخابور نهر أو واد بالجزيرة وقيل موضع بناحية الشام، وخيبر موضع بالحجاز قريبة معروفة ويقال : عليه الدبرى وحمى خيبرى .

تاج العروس[1] :

(الخبر بحركة النبأ) هكذا فى المحكم، وفى التهذيب الخبر ما أتاك من نبأ عمن تستخبر، قال شيخنا ظاهره بل صريحه أنهما مترادفان وقد سبق الفرق بينهما وأن النبأ خبر مقيد بكونه عن أمر عظيم كما قيد به الراغب وغيره من أئمة الاشتقاق والنظر فى أصول العربية ثم إن أعلام اللغة والاصطلاح قالوا : الخبر عرفا ولغة ما ينقل عن الغير وزاد فيه أهل العربية : واحتمل الصدق والكذب لذاته والمحدثون استعملوه بمعنى الحديث أو الحديث عن النبى والخبر ما عن غيره وقال جماعة من أهل الاصطلاح : الخبر أعم والأثر هو الذى يعبر به عن غير الحديث كما الفقهاء خراسان وقد مر إيماء اليه فى أثر وبسطه فى علوم

---

[1] ۳/۱۶۶ -

اصطلاح الحدیث (ج اخبار) و (جج) أی الجمع (اخابیر) یقال (رجل خابر وخبیر) عالم بالخبر والخبیر المخبر (و) قال ابو حنیفة فی وصف شجرٍ أخبرنی بذلک الخَبِر فجاء (ککتف) قال ابن سیده: وهذا لایکاد یعرف الا ان یکون علی النسب (و) یقال رجل خَبَر مثل (حجر) ای (عالم به) ای بالخبر علی المبالغة کزید عدل (واخبره خُبورہ) بالضم أی (أنباہ بما عنده والخِبر والخِبرة بکسرهما ویضمان والمخبرة) بفتح المواحدة (والمُخبُرة) بضمها (العلم بالشئ) تقول لی به خُبر وخِبرة (کالاختبار والتخبر) وقد اختبرہ و تخبّره یقال من أین خبرت بهذا الأمر أی من أین علمت ویقال: صدق الخَبَر الخبر وقال بعضهم الخُبر بالضم العلم الباطن الخفی لاحتیاج العلم به للاختبار والخبرة العلم بالظاہر والباطن وقیل بالخفایا الباطنة ویلزمها معرفة الأمور الظاہرة (وقد خَبُر) الرجل (ککرم) خُبورًا فهو خبیر (والخَبْر) بفتح فسکون (المزادة العظیمة کالخبراء) ممدود الأخیر عن کراع (و) من المجاز الخبر (الناقة الغزیرة اللبن) شبهت بالمزادة العظیمة فی غزرها وقد خبرت خبورًا عن اللحیانی (ویکسر فیهما) ذکر ابو الهیثم الکسر فی المزادة وقال غیره الفتح أجود (ج) أی جمعهما (خبور و) الخبر (ة[1] بشیراز) بها قبر سعید أخی الحسن البصری (منها) أبو عبد اللہ (الفضل بن حماد) الخبری الحافظ (صاحب المسند) وکان یعد من الأبدال، ثقة ثَبت یروی عن سعید بن ابی مریم و سعید بن عفیر وعنہ ابو بکر بن عبدان الشیرازی وأبو بکر عبد اللہ بن أبی داؤد السجستانی وتوفی ۲۶۴ھ (و) الخبر (ة بالیمن) نقله الصغانی

---

[1] ة: بلدة۔

(و) الخبر (النزع و) الخبر (منقع الماء فی الجبل) وهو ما خبر المسيل فی الرؤوس فتخوض فيه والخبر (السدر) والأراك وما حولهما من العشب قال الشاعر:

فجادتك أنواء الربيع وهللت ... عليك رياض من سلام ومن خَبر

(كالخَبِر ككتف) عن الليث واحدتهما خبرة وخبرة (و) الخبراء (القاع تُنبته) أى السِدر (كالخَبْرة) بفتح فكسر وجمعه خبر. وقال الليث: الخبراء شجراء فی بطن روضة يبقى فيها الماء إلى القيظ وفيها ينبت الخبر وهو شجر السدر والأراك وحواليها عشب كثير وتسمى الخَبِرة (ج الخبارى) بفتح الراء (والخبارِى) بكسرها مثل الصحارى (و) الخبراوات والخبار بالكسر وفی التهذيب فی نقع النقائع خبارى فی بلاد تميم (و) الخبراء (منقع الماء) وخص بعضهم به منقع الماء (فی أصوله) أى السدر، وفی التهذيب الخبراء قاع مستدير يجتمع فيه الماء (والخَبار كسحاب مالان من الأرض واسترخى) وكانت فيها حجارة زاد ابن الأعرابي وتحفر وقال غيره هو ما تهور وساخت فيه القوائم وفی الحديث فدفعنا فی خبار من الأرض أی سهلة لينة، وقال بعضهم الخبار أرض رخوة تتعتع فيها الدواب وأنشد:

تتعتع فی الخبار إذا علاه ... وتعثر فی الطريق المستقيم

(و) الخبار (الجراثيم) جمع جُرثوم وهو التراب المجتمع بأصول الشجر (و) الخبار (جحرة الجرذان) واحدته خبارة (ومن تجنب الخبار أمن العثار مثل) ذكره الميدانی فی مجمعه والزمخشری فی المستقصى والأساس (وخبرت الأرض) خبرا (كفرح كثر خبارها) وخبر الموضع كفرح فهو خبر كثر به وهو

السد روأرض خبرة وهذا قد أغفله المصنف (و) خيفاء (وخيف الخبار ع بنواحي عقيق المدينة) كان عليه طريق رسول الله صلعم حين خرج يريد قريشا قبل وقعة بدر ثم انتهى عنه إلى يليل (والمخابرة المزارعة) عم بها اللحياني وقال غيره (على النصف ونحوه) أى الثلث وقال ابن الاثير المخابرة المزارعة على نصيب معين كالثلث والربع وغيرها وقال غيره هو المزارعة ببعض ما يخرج من الأرض (كالخبر بالكسر) وفى الحديث: كنا نخابر ولا نرى بذلك بأسا حتى أخبر رافع أن رسول الله صلعم نهى عنها، قيل هو من خبرت الأرض خبرا كثر خبارها، وقيل أصل المخابرة من خيبر لأن النبى أقرها فى أيدى أهلها على النصف من محصولها فقيل خابرهم أى عاملهم فى خيبر (و) المخابرة أيضا المؤاكرة والخبير الأكار قال:

تجز رؤوس الأوس من كل جانب ٭ كجز عقافيل الكروم خبيرها

رفع خبيرها على تكرير الفعل أراد جزه خبيرا أى أكارها (و) الخبير (العالم بالله تعالى) بمعرفة اسمائه وصفاته والمتمكن عن الأخبار بما علمه، والذى يخبر الشئ يعلمه (و) الخبير (الوبر) يطلع على الإبل واستعاره أبو النجم لحمير وحش، فقال:

حتى إذا ما طار من خبيرها (و) من اعجاز فى حديث طهفة نستخلب الخبير أى نقطع (النبات والعشب) وناكله شبه بخبير الإبل وهو وبرها لانه ينبت كما ينبت الوبر واستخلابه احتشاشه بالمخلب وهو المنجل (و) الخبير (الزبد وقيل زبد أفواه الإبل) وأنشد الهذلى:

تغذ من فى جانبيه الخبير لما وهى مزنه واستبيحا

تغذ من يعنى الفحول أى مضغن الزبد وعميته (و) الخبير

(ونسألة الشعر) قال المتنخل الهذلی:

فآبوا بالرماح وهن عوج   يهن خبائر الشعر السقاط

(و) خبير (جد والد أحمد بن عمران) بن موسى بن خبير الغويديني (المحدث) النسفي عن محمد بن عبد الرحمن الشامي وغيره (و) الخبيرة (بالهاء) اسم (الطائفة منه) أي من نسالة الشعر (و) الخبير (الشاة تشترى بين جماعة) بأثمان مختلف (فتذبح) ثم يقسمونها فيسهمون كل واحد على قدر ما نقد (كالخبرة بالضم وتخبروا) خبرة (فعلوا ذلك) أي اشتروا شاة فذبحوها واقتسموها وشاة خبيرة مقتسمة قال ابن سيده أراه على طرح الزائد (و) الخبرة (الصوف الجيد من أول الجزء) نقله الصغاني (والمخبرة) بفتح الموحدة (المخرأة) موضع الخرأة نقله الصغاني (و) المخبرة (نقيض المرآة) وضبطه ابن سيده بضم الموحدة وفي الأساس و من المجاز تخبر عن مجهولة مرآته (والخبرة بالضم الثريدة الضخمة الدسمة (و) الخبرة (النصيب تأخذه من لحم أو سمك) وأنشد -

بات الربيعي والخامیز خبوته   وطاح طي من بني عمرو بن يربوع

(و) الخبرة (لما تشتريه لأهلك) وخصهم بعضهم باللحم (كالخبر) بغير هاء يقال للرجل ما اختبرت لأهلك (و) الخبرة (الطعام) من اللحم وغيره (و) قيل هو (اللحم) يشتريه لأهله (و) الخبرة (ما قدم عن شيء) وحكى اللحياني أنه سمع العرب تقول اجتمعوا على خبرته يعنون ذلك (و) قيل الخبرة (طعام يحمله المسافر في سفرته) يتزود به (و) الخبرة (قصعة فيها خبز ولحم بين أربعة أو خمسة (والخابور نبت) أو شجر له زهر زاهي المنظر أصفر جيد الرائحة تزين به الحدائق قال شيخنا ما إخاله

خالہ یوجد بالمشرق قال:

أیا شجر الخابور مالك مُورِقاً		كأنك لم تجزع علی ابن طریف

(و) الخابور (نہر بین رأس عین والفرات) مشہور (و) الخابور نہر (آخر شرقی دجلة الموصل) بینہ وبین الرَّقة علیہ قری کثیرة وبلیدات ومنھا ابو الریان شریح بن ریان بن شریح الخابوری کتب عنہ السمعانی (و) الخابور (واد) بالجزیرة وقیل بسنجار منہ یعیش بن ہشام القرقسانی الخابوری القصار روی عن مالك وعنہ عبید بن عمر والسرقی وقال الجوہری موضع بناحیة الشام وقیل بنواحی دیار بکر ما کما قالہ السید والسعد فی شرحی المفتاح والمطول کما نقلہ شیخنا ومرادہ فی شرح بیت التلخیص والمفتاح: ایا شجر الخابور مالك مُورقا المتقدم ذکرہ (و) خابوراء (ع) و یضاف إلی عاشوراء ومامعہ (وخیبر) کصیقل (حصن) ای معروف (قریب المدینة) المشرفة علی ثمانیة بُرد منہا إلی الشام سُمی باسم رجل من العمالیق منزل بہا وھو خیبر بن قانیة بن عبیل وھو أخو عاد وقال قوم خیبر بلسان الیہود الحصن ولذا سمیت خیائر ایضا وخیبر معروف غزاہ النبیؐ ولہ ذکر فی الصحیح وغیرہ وھو اسم للولایة بہ سبعة حصون حولہا مزارع ونخل وصادقت قولہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ أکبر خربت خیبر وھذہ الحصون السبعة اسماؤہا شِق وَوَطیح ونَطاة وحموص وسُلالِم وکُتیبة وناعم (و) أحمد بن عبد القاہر اللخمی الدِمشقی یروی عن مُنبہ بن سلیمان، قلت وہو شیخ للطبرانی (و) محمد بن عبد العزیز) ولد منصور الاصبہانی سمع من ابی محمد بن فارس (الخیبریان کأنہما ولدا بہ) والا فلم یخرج منہ من یشار الیہ بالفضل

(وعلى بن محمد بن خيبو محدث) وهو شيخ لأبي اسحاق المستملي (والخيبرى) بفتح الراء وألف مقصورة ومثله في التكملة وفي بعض النسخ بكسرها وياء النسبة (الحية السوداء) يقال بلاه الله بالخيبرى يعنون به تلك وكانه لما خرب صار ماوى الحياة القاتلة۔

تاج العروس کے دسویں اور آخری حصے کے اختتام پر بلگرامی کے بارے میں ایک تعارفی نوٹ ہے، اس میں ایسی تفصیلات بیان کی گئی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک سادہ، دُنیا سے بے تعلق، علم میں ڈوبی ہوئی زندگی بسر کرتے تھے، اس کے برخلاف علی طنطاوی کے مضمون سے جس کا مآخذ بلگرامی کے ایک ہم عصر کے بیانات ہیں جنھیں شیخ عبدالرزاق بیطار نے اپنی غیر مطبوعہ تاریخ میں قلمبند کیا ہے ظاہر ہوتا ہے کہ بلگرامی کو دُنیا سے دل چسپی تھی، نمود و نمائش سے بھی، وہ شاندار لباس پہنتے تھے۔ ہمعصر اکابر و اعیان سے ان کے روابط تھے اور وہ علمی شہرت و وجاہت کو حکومت و امارت حاصل کرنے کا آلہ کار بنانا چاہتے تھے، اس رائے کی توثیق کے لیے تعارفی نوٹ اور علی طنطاوی کے مضمون کے اہم حصے یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

تعارفی نوٹ[1]:

"۔۔۔۔ بلگرامی نے تحصیلِ علم کے لیے ہندوستان کے مختلف شہروں کا سفر کیا اور تقریباً تین سو استادوں سے استفادہ کیا جن کے نام انھوں نے اپنی فہرستِ تالیفات میں درج کیے ہیں۔ پھر وہ یمن آئے اور بہت دن تک زبید میں بود و باش رکھی حتیٰ کہ لوگ زبید کو ان کا وطن قرار دینے لگے اور وہ زبیدی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ انھیں چاروں اماموں کے شیوخ نے فضیلت کے سارٹیفکیٹ (اجازہ) دیئے اور دُور دُور کے علماء نے بھی، انھوں نے کئی بار حج کیا، مکّے میں انھوں نے وہاں کے بڑے عالم شیخ عبداللہ

---

[1] تاج العروس ۱۰/ ۴۶۹-۴۷۱۔

سندھی اور سید عبدالرحمن عید روسی سے استفادہ کیا، آخر الذکر سے مختصر سعد پڑھی اور مستقل طور پر ان کی صحبت میں رہنے لگے، انھوں نے ہی ان کے دل میں مصر جاکر قسمت آزمائی کا داعیہ پیدا کیا، وہ ۱۱۶۷ھ میں (جب ان کی عمر بائیس سال تھی) مصر آگئے، خانہ صاغہ میں قیام کیا اور ہمعصر علماء، محدثوں اور فقیہوں کے درسی حلقوں میں شرکت کی، انھوں نے ڈیلٹائے نیل کے ان شہروں کا بھی دورہ کیا جہاں حدیث کی تعلیم دی جاتی تھی، انھوں نے اسیوط اور صعید (بالائی مصر) کے علمی حلقوں میں بھی شرکت کی اور مقامی عالموں سے رابطہ قائم کیا۔ اس کے بعد انھوں نے شادی کرلی اور عطفۃ الغسال نامی محلے میں سکونت اختیار کی اور وہ کتاب (تاج العروس) لکھنا شروع کی جس نے انھیں سرخروئی عطا کی اور علم لغت میں ان کی مہارت وحذاقت کا شہرہ دور دور تک قائم کردیا (قاموس کی یہ شرح) انھوں نے چودہ سال اور دو ماہ میں دس ضخیم جلدوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچائی اور تکمیل کی خوشی میں ایک بڑی دعوت کی جس میں ہمعصر علماء، اکابر اور ممتاز لوگوں کو مدعو کیا اور اور ان کے سامنے تاج العروس کی امتیازی خوبیاں بیان کیں، دعوت میں شریک علماء اور اکابر نے ان کے علم وفضل اور وسیع لغوی معلومات کو سراہا اور کتاب پر نثر و نظم دونوں میں تقریظیں لکھیں۔

بہت جلد "تاج العروس" کے ہر طرف چرچے ہونے لگے، عثمانی خلیفہ نے ان سے شرح کے ایک نسخے کی فرمائش کی، سلطانِ دارفور اور شمالی افریقہ (یونس، الجیریا، اور مراکش) کے حاکم نے بھی اس کے نسخے طلب کیے۔ اور (غاصب مصر) امیر الامراء محمد بک نے جس کا لقب ابوالذہب تھا اس کا ایک نسخہ حاصل کیا، اس مسجد کے کتب خانے میں اسے جگہ دی جسے ازہر کے قریب اس نے بنوایا تھا اور قدردانی کے طور پر بلگرامی کو ہزار ریال کا عطیہ پیش کیا۔

"تاج العروس" کے علاوہ بھی بلگرامی کی بہت سی تالیفات (مضامین، کتابچے اور کتابیں)

ہیں جن کی تعداد سو سے زیادہ ہے اور جن کا انھوں نے اپنی فہرست تالیفات میں ذکر کیا ہے ان میں سے دو اہم کتابیں احیاء العلوم غزالیؒ کی شرح اور قاموس کا تکملہ ہیں۔

۱۱۸۹ھ کے اوائل میں (جب ان کی عمر چوالیس سال تھی) بلگرامی (امراء و رؤساء کے محلے) سُوَیقۃ اللالاء منتقل ہو گئے اور اس محلہ کے اعیان و اکابر کی نظر میں اونچا مقام حاصل کر لیا، وہ بلگرامی سے ربط و ضبط رکھنے اور ان کے مصاحب بننے کے خواہشمند ہو گئے، اسکی وجہ یہ تھی کہ ان کا ڈیل ڈول اور صورت اچھی تھی، بات چیت کے انداز، مزاج اور اخلاق میں کشش تھی، وہ مسکراتے ہوئے لوگوں سے ملا کرتے تھے، ان کے طور طریق پر خودداری اور وقار کی مہر لگی ہوئی تھی، اہل مکہ کی طرح عمامہ باندھتے تھے، ذرا ترچھا سفید کپڑے کا جس کا سرا پیچھے لٹکا ہوتا اور اس میں بقدر دو انگل ریشم کا پھندنا لگا ہوتا تھا۔ بلگرامی میانہ قد آدمی تھے، جسم چھریرا، رنگ سونے کی طرح دمکتا ہوا، اعضا متناسب، داڑھی درمیانہ جس کے اکثر بال سفید تھے، لباس بڑھیا پہنتے تھے، انھیں ادبی و علمی لطیفے یاد تھے، برجستہ جواب دیتے اور برمحل گفتگو کرتے تھے، عقل رسا پائی تھی، معلومات کا دائرہ وسیع تھا، ترکی اور فارسی زبان سے واقف تھے، اکابر و رؤساء کے اس محلے کے لوگ ان سے مانوس ہو گئے اور ان کی قدر و منزلت کرنے لگے۔ بلگرامی ان کے سامنے وعظ کہتے تھے اور ان کی سیرت و کردار سنوارنے والی باتیں کرتے تھے اور انھیں اوراد و احزاب (مخصوص قرآنی آیات) کی تلقین کرتے تھے، اس طرح بلگرامی بہت مشہور ہو گئے اور دور دور ان کا چرچا ہونے لگا۔ لوگ ہر سمت اور ہر ملک سے ان کے پاس آنے لگے، اب انھوں نے سلف کے طریقے پر حدیثیں بیان کرنا اور املا کرانا شروع کر دیا، وہ اپنے حافظے سے رواۃ کے نام اور مختلف اسناد سے حدیثیں بیان کرتے تھے...... حدیث کے درس کے زمانے میں ازہر کے کچھ عالم ان سے ملے اور حدیث میں فضیلت کا سرٹیفکیٹ (اجازہ) مانگا، انھوں نے کہا سرٹیفکیٹ اس وقت دوں گا جب آپ لوگ اوائل کتب حدیث میری نگرانی میں پڑھ لیں گے، اس کے لیے طے ہوا کہ ہر پیر

اور جمعرات کے دن شیخوں کی جامع مسجد میں اجتماع ہوا کرے، بلگرامی نے وہاں صحیح بخاری سے ابتدا کی، اس درس میں ازہر کے دوسرے علما بھی شریک ہونے لگے، صحیح بخاری کی چند حدیثوں کے درس کے بعد وہ فضائل اعمال سے متعلق حافظے سے کچھ حدیثیں اور ان کی اسناد بیان کرتے پھر علما کو کچھ اچھے شعر بھی سناتے، حاضرین ان کی لیاقت، خوش بیانی اور علمی نظر پر سر دھنتے، ان کی شہرت، وجاہت اور قدر و منزلت میں برابر اضافہ ہوتا گیا، اُس محلے کے اعیان و اکابر کے علاوہ دوسرے محلوں کے عوام اور بڑے لوگ بھی ان کے درس میں شریک ہونے لگے، بہت سے ممتاز اور بااثر لوگوں نے انھیں اپنی کوٹھیوں اور محلوں میں بلانا شروع کر دیا اور ان کے اعزاز میں بڑی بڑی دعوتیں کرنے لگے، وہ اپنے خاص طلبہ، قاری، مستملی اور کاتب کے ساتھ دعوتوں میں جاتے اور بخاری وغیرہ کی کچھ حدیثیں تلاوت کرتے، مجمع میں مہمان، میزبان، ان کے دوست واحباب، اقربا اور بچے حتی کہ بیویاں اور لڑکیاں تک پردے کے پیچھے سے بلگرامی کے افادات ذوق وشوق سے سنتے، عنبر اور اگر بتیوں کی خوشبو ہر طرف فضا کو مہکاتی، حدیثوں کی تلاوت کے بعد مصر میں مروّجہ دستور کے مطابق رسول اللہ پر درود بھیجنے کی تقریب ہوتی، بلگرامی کا کاتب حاضرین کے نام ایک رجسٹر میں نوٹ کرتا بچوں عورتوں اور لڑکیوں تک کے نام، دن اور تاریخ بھی، اس کے بعد بلگرامی "صح ذلک" لکھ کر تحریر کی توثیق کر دیتے۔

۱۱۹۴ھ میں (جب بلگرامی انچاس سال کے تھے) عثمانی خلیفہ نے انھیں استنبول آنے کی دعوت دی، جسے انھوں نے قبول کر لیا، لیکن گئے نہیں۔ بیرونی ملکوں میں ان کا نام روشن ہو گیا ترکی، حجاز، ہند، یمن، شام، بصرہ، عراق، شمالی افریقہ، سوڈان، جزائر اور دوسرے دور افتادہ ملکوں کے سلاطین کے دعوت نامے ان کے پاس آنے لگے اور ہر سمت سے علما، اور اکابر کے وفدان سے علمی فضیلت کے سرٹیفکیٹ مانگنے لگے، قسطنطینیہ کے خلیفہ امیر المومنین سلطان عبد الحمید اوّل تک نے ان سے اسی طرح کا سرٹیفکیٹ طلب کیا تو انھوں نے

حدیث کی چند کتابیں اور مطلوبہ سرٹیفکیٹ اسے بھیج دیا۔ انھوں نے صدرِ وزارتِ مصر محمد بن باشا راغب کو بھی سرٹیفکیٹ عطا کیا، اسی طرح غزہ، دمشق، حلب، آذربی جان میسوپوٹامیا اور دوسرے ملکوں کے علمار کی درخواستوں کو بھی شرف قبول بخشتا، ہر طرف سے وفد ان کے پاس آتے، حدیثیں اور ان کی تفسیر و تشریح سنتے اور اپنے اپنے علاقوں کے علمار کے لیے سرٹیفکیٹ لے کر چلے جاتے۔

جب بلگرامی کی شہرت بامِ کمال کو پہنچ گئی اور خاص و عام میں ایسی عزت اور وجاہت حاصل کرلی جس سے زیادہ ممکن نہ تھا تو وہ پبلک زندگی سے کنارہ کش ہو کر خانہ نشین ہو گئے اور اپنے دوست احباب اور قدر دانوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ گھر کے دروازے ملاقاتیوں کے لیے بند کر دیئے، درس، وعظ، تلقین، اجازہ تعویذ اوراد وغیرہ سب سے منھ موڑ لیا، اس حال میں زندگی گذار رہے تھے کہ انھیں طاعون نے آ پکڑا، وہ اپنے مکان کے سامنے والی مسجد کردی میں جمعے کی نماز ادا کر کے گھر آئے تو طاعون میں مبتلا تھے۔ رات میں ان کی زبان بولنے سے بھی قاصر ہو گئی، اور اگلے دن شعبان ۱۲۰۵ھ کو (مصر میں نپولین کی آمد اور نئے انقلاب انگیز تمدن کے داخلے سے چند سال پہلے) ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے نہ کوئی لڑکا تھا نہ لڑکی کسی شاعر نے ان کا مرثیہ نہیں کہا اور طاعون کی تباہ کاری کے باعث ازہر کے علمار کو بھی ان کی موت کی خبر نہ ہو سکی، (قاہرہ سے باہر) سیدہ رقیہ کے مزار کے پاس انھیں اُس قبر میں دفن کیا گیا جسے اپنی زندگی میں انھوں نے (اپنی بیوی کی قبر کے برابر) بنوا لیا تھا۔"

علی طنطاوی[۱]:

"..... مصر میں بلگرامی کا ستارہ چمکا، نام روشن ہوا اور انھوں نے وہ اعلیٰ مرتبہ پایا جس کا میں نے ابھی ذکر کیا، اول اول انکا رابطہ امیر اسماعیل کتخدا سے قائم ہوا، خدا نے بلگرامی کی محبت اور قدر و منزلت اس کے دل میں ڈال دی اور اس نے بلگرامی کو اچھا سا

---

[۱] رجال من التاریخ دمشق ص ۲۶۴-۲۷۰۔

عہدہ دیا، یہ دیکھ کر کہ اسماعیل نے بلگرامی کو عہدہ دیا ہے اور ان کے قدردان ہیں۔ لوگ بلگرامی کی طرف ٹوٹ پڑے ان کے درس میں شرکت کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت کرنے لگے اور بلگرامی خوش حال ہو گئے اور شاندار لباس پہننے لگے اور سواری کے لیے خوبصورت قیمتی گھوڑے خرید لیے۔ ان کا جسم چھریرا تھا، قد درمیانہ، چہرہ گلابی، اعضاء سڈول، وہ حجازی لباس پہنتے تھے جو علمائے ازہر کے لباس سے مختلف تھا، ان کا عمامہ حجازی طرز کا تھا جسے مزرکش ٹوپی کے گرد باندھتے تھے اور اس کا سرا پیٹھ پر لٹکا لیتے تھے، لوگ علمائے ازہر سے مختلف اور زیادہ رُعب دار لباس سے بھی ان کی طرف مائل ہونے لگے۔ (دولت و وجاہت حاصل کرکے) وہ سویقۃ اللالاء منتقل ہو گئے۔ یہ اس زمانے میں بڑے لوگوں کی رہائش کا علاقہ تھا، یہاں آ کر انھوں نے اپنے گھر کے دروازے کھول دیئے، دعوتیں کرتے، اور جو لوگ انھیں تحفے دیتے انھیں خود بھی تحفے دیتے۔ وہ درس کے لیے ایک مسجد سے دوسری مسجد اور ایک محلے سے دوسرے محلے میں گشت کیا کرتے، تین بار انھوں نے بالائی مصر (صعید) کا دورہ کیا، وہ جہاں کہیں جاتے لوگ انھیں گھیر لیتے اور علم کے طالب نیز علماء کے ان کے پاس ٹھٹ لگ جاتے، امراء، کبراء اور حکمراں طبقے کے اعیان میں ان کی دعوتیں اور اعزاز و اکرام کرنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی دوڑ سی رہتی تھی، انھوں نے ڈیلٹائے نیل کے شہروں کا بھی بار بار دورہ کیا، جیسے دمیاط، رشید اور منصورہ۔

پھر انھوں نے شادی کر لی اور بیوی سے انھیں ایسی محبت ہوئی جیسی قیس کو لیلیٰ اور عباس کو فوزہ سے بھی نہیں ہوئی ہوگی، اس کے ساتھ بلگرامی ایسی پُرسکون زندگی گذارتے تھے جیسی جنت ہی میں میسّر ہو سکتی ہے۔

شادی کے بعد انھوں نے قاموس کی شرح لکھنا شروع کی، جب اس کا ایک جزء مرتب کر لیتے تو اسے اسلامی ملکوں کے علماء کے پاس بھیجتے، اس طرح وہ شرح پوری کرنے سے پہلے ہی مشہور ہو گئے اور جب شرح (تاج العروس) مکمل ہوئی تو انھوں نے شاندار

دعوت کی جس میں علماء اور بڑے لوگوں کو مدعو کیا تھا، یہ بہت بڑی تقریب تھی جس کے مدتوں چرچے ہوتے رہے۔

جب (غاصبِ مصر کے داماد، معتمد اور سالارِ اعلیٰ) محمد بک ابوذہب نے مشہور مسجد ازہر کے قریب بنوائی تو اس میں ایک کتب خانہ بھی قائم کیا جس کے لیے وہ نادر کتابیں گراں قیمت پر خرید اکرتا تھا، اس نے تاج العروس کے پہلے نسخے کے لیے بلگرامی کو پچاس ہزار روپے (ایک لاکھ درہم) کا عطیہ دیا۔ وسیع دُنیوی اعزاز اور مال و دولت بلگرامی کو علم کے جادے سے نہیں ہٹا سکے وہ تصنیف و تالیف میں لگے رہے، طلبار کو بڑھاتے رہے اور ان علوم کو تازہ کرتے رہے جو بھلائے جا رہے تھے، جیسے علم نسب، اسانید اور تخریج احادیث۔

دنیوی علوم اور اعزاز اور علوم سے وابستگی کے ساتھ بلگرامی وعظ، جھاڑ پھونک تعویذ گنڈے، اور اوراد و احزاب سے بھی دل چسپی لیتے تھے اور لوگوں کو باور کرلتے تھے کہ وہ مہدی ہیں، انھوں نے غیر معمولی دنیوی اعزاز اور وسیع شہرت جو حاصل کی وہ اس طرح کی علمی دلچسپیوں، ہیئت ولباس کی غرابت، فارسی، ترکی اور گرجی زبانوں سے واقفیت، سلاطین واکابر کی صحبت کے آداب اور عوام کا دل موہنے کے گروں میں مہارت کی مرہون تھی، جب کوئی انھیں اپنے گھر بلاتا تو بڑے پیمانے پر شاندار دعوت کرتا اور اپنے دوست احباب اور کنبے والوں کو بھی مدعو کرتا، بلگرامی اپنے خاص طلبہ، قاری مستملی (ڈکٹیشن لینے والے) اور منشی کے ساتھ آتے اور ایک اونچی کرسی پر بیٹھ جاتے، پھر ان کا قاری چند قرآنی آیتیں تلاوت کرتا، مستملی پڑھتا، اس کے بعد شیخ (بلگرامی) چند حدیثیں تلاوت کرتے، جیسے بخاری یا دارمی کی ثلاثیات، اس اثنار میں میزبان، اس کے دوست احباب اور رشتے دار حتیٰ کہ پردے کے پیچھے عورتیں اور لڑکیاں یہ ساری ڈرامائی کارروائی دیکھتے اور سنتے اور اس دوران حاضرین کے پاس عنبر اور عطر وغیرہ لائے جاتے اور عرقِ گلاب چھڑکا جاتا، پھر یہ

درس رسول اللہؐ پر مروجہ طریقے پر درود بھیج کر ختم کر دیا جاتا، اس کے بعد حاضرین کے نام لکھے جاتے، عورتوں اور بچوں تک کے اور اس کے نیچے شیخ لفظ صحیح لکھ دیتے۔ لوگ اس طرح کے مذہبی ڈرامے آئے دن دیکھا کرتے اور شیخ کی شہرت کا دائرہ وسیع ہوتا رہتا۔

ازہر کے بعض اساتذہ نے بلگرامی سے حدیث میں اپنی فضیلت کا سرٹیفکیٹ مانگا تو انھوں نے کہا سرٹیفکیٹ اُس وقت دوں گا جب اوائل کتب حدیث آپ لوگ میری نگرانی میں پڑھ لیں گے، طے ہوا کہ اس کام کے لیے شیخوں کی جامع مسجد میں اجتماع ہوا کرے، اجتماع میں اُس نواح کے لوگ اور طالب علم بھی شریک ہوتے تھے، کچھ دن بعد شرکائے درس نے بلگرامی سے درخواست کی کہ احادیث کی تشریح و تفسیر بھی کیا کریں، تو وہ روایت سے درایت کی طرف منتقل ہو گئے۔ یہ درس بھی بہت دن تک جاری رہا، شیخ کی تشریح حدیث میں فقہ، ادب اور تاریخ کی بھی چاشنی ہوتی تھی جس کا مشائخ ازہر کے درس میں فقدان تھا۔

مصر کے کچھ بڑے امیروں سے بلگرامی کے دوستانہ تعلقات استوار ہو گئے۔ جیسے مصطفیٰ بک اِسکندرانی اور الیوب بک دفتر دار، یہ لوگ ان کے گھر آتے تھے اور بڑے بڑے عطیے لاتے تھے، بلگرامی حسین، کنیزیں خرید کر ان مہمانوں کو دیتے اور عمدہ کھانے پکوا کر انھیں کھلاتے، باہر سے جو مہمان آتے ان کی بھی خوب آؤ بھگت کی جاتی۔

بلگرامی کی شہرت ترکی تک پہنچ گئی۔ انھیں عثمانی پایۂ تخت استنبول ..... آنے کی دعوت دی گئی لیکن وہ گئے نہیں انھیں خلیفہ کی طرف سے بڑے بڑے عطیات اور تحفے بھیجے گئے۔ ترکی، حجاز، یمن، ہند، شام، عراق، شمالی افریقہ، سوڈان اور جزائر بحر متوسط کے حاکموں، امرار اور رؤسا اور سالاروں نے ان سے خط و کتابت کی اور ان ملکوں سے بکثرت وفد ان کے پاس آتے عجیب و غریب تحفے لے کر.....

شمالی افریقہ (تونس، الجیریا اور مراکش) میں ان کی شہرت و احترام کا یہ حال تھا کہ جو بڑے لوگ وہاں سے حج کرنے جاتے اور شیخ سے نہ ملتے تو ان کا حج ادھورا سمجھا جاتا تھا۔

اُس دیار کا کوئی بڑا آدمی ان سے ملتا تو اس کا نام، حسب نسب، شہر اور پڑوسیوں کے نام نوٹ کر لیتے، پھر ان اکابر کا کوئی دوست یا رشتے دار ان سے ملنے آتا (حج سے قبل یا بعد) تو وہ کہتے: تمھارا فلاں پڑوسی زندہ ہے؟ تمھارے فلاں دوست کو تجارت میں نفع ہوا؟ تمھارے چچا زاد بھائی کا مکان تعمیر ہو گیا؟ وہ بڑا آدمی یہ سن کر پیکرِ ادب بن کر کھڑا ہو جاتا، شیخ کے ہاتھ اور پیر چومتا، وہ سمجھتا کہ شیخ غیب داں ہیں۔

حج کے زمانے میں ان کے گھر آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، اور ہر نو وارد اپنے ساتھ شیخ کے لیے کوئی تحفہ یا نادر چیز ضرور لاتا، علماء ان سے سوالات پوچھتے اور اگر وہ جواب دیدیتے، چاہے انگلی کے بقدر، تو علماء سمجھتے کہ انھیں جنت کا پاسپورٹ مل گیا۔

شیخ کو بڑے لوگوں سے اپنا احترام کرانے کا گُر معلوم تھا جب حسن باشا (عثمانی خلیفہ کی طرف سے گورنر ہو کر) مصر آیا تو ہر بڑا آدمی اسے سلام کرنے گیا لیکن شیخ نہیں گئے، انھوں نے چند نمائندے بھیجے جنھوں نے حسن باشا کو (شیخ کی عظمت و تقدس سے روشناس کر کے) شیخ کی زیارت کرنے کا مشورہ دیا۔ حسن باشا ان کے گھر آیا، اس موقع پر شیخ نے ایک پوستینی جبہ (جس کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا) بطورِ خلعت، ایک تیز رفتار گھوڑا مع طلائی زین کے اور ایک عبا جس کی قیمت پانچ ہزار روپے (دینار) تھی حسن کو عطا کیا، یہ تحفے لے کر حسن باشا کے دل میں شیخ کی عظمت و احترام کے سوتے کھل گئے۔ ان کی کوئی سفارش وہ مسترد نہیں کرتا تھا۔ شیخ اگر اُسے کوئی کتاب یا خط بھیجتے تو وہ اسے پہلے ادب سے چومتا اور خط میں شیخ کی جو فرمائش ہوتی اسے پورا کر دیتا، ایک بار (شام کے غاصب و آمر) احمد بک جزّار کو انھوں نے خط میں لکھا کہ میں مہدی منتظر ہوں اور بہت بڑی حکومت قائم کروں گا، احمد بک جزّار نے شیخ کی بات باور کر لی اور دوسرے گنڈے تعویذوں کے ساتھ شیخ کے خط کا بھی تعویذ بنا کر گردن میں ڈال لیا اور گنڈے تعویذ کے جو ماہر اس کے پاس آیا کرتے انھیں شیخ کے خط کو تعویذ بنانے کا راز بتا دیتا اور

بڑا آدمی مصر سے آکر احمد جبرار سے ملتا اس سے شیخ کے بارے میں پوچھتا اگر وہ کہتا کہ میں ان سے واقف ہوں، ان کی خدمت میں حاضری دے چکا ہوں اور ان کی تعریف کرتا تو احمد جبرار اس کی آؤ بھگت کرتا اور اسے عمدہ عطیہ دیتا ورنہ اسے دھتکار دیتا چاہے وہ کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہوتا۔

بلگرامی نے جب احیاء العلوم کی شرح لکھنا شروع کی تو اس کے کچھ ابتدائی حصے ترکی، شام اور شمالی افریقہ کے سلاطین کو بھیجے تاکہ اسے بھی وہ شہرت حاصل ہو جائے جو تاج العروس شرح قاموس کو ہوئی تھی۔

بلگرامی پر ایک حادثہ نازل ہوا جس نے ان کی زندگی کا رُخ بدل ڈالا اور انکی اجتماعی زندگی پر جو چہل پہل اور رونق کے باعث ضرب المثل بنی ہوئی تھی، عزلت اور تنہائی کا پردہ ڈال دیا۔ یہ حادثہ ان کی دل کی ملکہ چہیتی بیوی کی موت تھی، اس حادثے نے ان کے شعور و وجدان پر سخت چوٹ لگائی، وہ یہ حدیث بھی بھول گئے جس کی وہ خود روایت و وکالت کیا کرتے تھے کہ "پکی قبریں اور اُن پر گنبد بنوانا مکروہ ہے"۔ انھوں نے بیوی کو اس قبر کے پاس دفن کیا جو قاہرہ کے بلہر سیدہ رُقیہؓ کی طرف منسوب ہے اور بیوی کی قبر پر گنبد بنوایا اور اس سے ملحق (اپنے لیے) ایک کمرہ جس میں پردے اور قندیلیں آویزاں کرائیں اور ایک مدت تک دیوانہ وار قبر کے مجاور بنے رہے، قبر کے برابر ایک گھر بنوا کر انھوں نے اس میں اپنی والدہ کو بسایا، اور ایک بڑا فنڈ قائم کیا جس سے ان شعراء کو عطیات دیئے جاتے تھے جو بیوی کا مرثیہ یا ان کی تعریف میں قصیدے نظم کرتے۔ بلگرامی گھر میں بند ہو کر بیٹھ گئے، لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا، وہ تحائف لینا بند کر دیئے جو ان کے پاس آتے رہتے تھے، ان میں وہ ہدیہ بھی تھا جو ایوب دفتردار نے اور ایک دوسرا بیش قیمت جسے سلطان مغرب نے بھیجا تھا۔

بلگرامی نے بیوی کے ماتم میں بہت سے پھڑکا دینے والے شعر کہے، اگر کسی طالب علم کے

دل میں ایسے شعراء پر ریسرچ کرنے کا داعیہ پیدا ہو جنھوں نے اپنی بیویوں پر مرثیے لکھے ہیں تو میرا مشورہ ہے کہ وہ شارح قاموس کو فراموش نہ کرے۔ ان کے ایک مرثیے کے یہ چند شعر ہیں:

زبیدۃُ شدت للرحیل مطیّہا غداۃ ثلاثاءٍ فی غلائلہا الخُضر

زبیدہ (بیوی) نے منگل کے دن کاہی لباس میں دنیا سے کوچ کیا

تمیس کما ماست عروسٌ بدلّہا وتخطر تیہاً فی البرانس والأُزر

وہ دلھن کی طرح اٹھلا کر اور برانس و غراروں میں اکڑ کر چلتی تھی

سأبکی علیہا ما حییتُ وإن أمُت ستبکی عظامی والأضالع فی القبر

جیتے جی میں اس کا ماتم کرتا رہوں گا اور موت کے بعد میری ہڈیاں اور پسلیاں اس کا ماتم کریں گی

ولستُ بہا مستبقیاً فیضَ عبرۃٍ ولا طالباً بالصبر عاقبۃَ الصبر

میں اس کے سوگ میں سارے آنسو بہا دوں گا اور صبر کر کے بھی کبھی سکون طلب نہیں کروں گا

۱۲۰۵ھ میں طاعون کی وبا آئی، جمعہ کی نماز پڑھ کر وہ گھر لوٹ رہے تھے کہ انھیں طاعون نے آپکڑا اور (اتنا تیز بخار چڑھا) کہ لوگ اٹھا کر انھیں گھر لے گئے۔ بلگرامی کے ہمعصر ایک مصنف نے جس سے شیخ عبد الرزاق بیطار نے اپنی غیر مطبوعہ تاریخ میں بلگرامی کے حالات نقل کیے ہیں، یہ تصریح کی ہے:

میں نے دیکھا کہ ان کی بیوی کے رشتے داروں نے ان کے صندوق اور پیٹیاں کھولیں اور وہ سارے گرانقدر تحائف نکال کر لے گئے، جو اکابر انھیں بھیجا کرتے تھے، ان میں نفیس کپڑے کے تھان، مختلف اقسام کی کشمیری شالیں، پوستینی جبے، عبائیں اور نادر سامان شامل تھا، میں نے قیمتی جیبی گھڑیوں کے ڈبوں کا ڈھیر دیکھا جن سے گھڑیاں کبھی نکالی تک نہیں گئی تھیں شیخ نے آنکھیں کھولیں اور یہ سین دیکھا تو اشارہ کیا گویا کہہ رہے ہوں یہ کیا ہو رہا ہے؟ اس کے بعد ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

الفخری کا تنقیدی مطالعہ

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی - ایم - اے - پی - ایچ - ڈی

پروفیسر وصدر شعبۂ عربی، کالی کٹ یونیورسٹی - کیرالہ

تاریخ اسلام کے ذخیرے میں "الفخری" ایک جامع اور دلکش کتاب ہے جس میں جنگ کے واقعات سے زیادہ بحث نہیں کی گئی ہے بلکہ تاریخ کی روح پیش کردی گئی ہے۔ مؤرخ ابن طقطقا نے اس مختصر سی کتاب میں تاریخ اسلام کے اہم حالات غیر معمولی مؤرخانہ بصیرت کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ اس میں جنگوں کا تفصیلی بیان نہیں مگر نتائج و اثرات پر مفصل اظہار خیال کیا گیا ہے۔ مصنف نے تاریخ اسلام کے ابتدائی دور یعنی خلافت راشدہ سے لیکر عصر عباسی کے آخری خلیفہ مستعصم کے دور تک کی تصویر بڑی وضاحت سے پیش کی ہے۔ سب سے پہلے اس نے تقریباً ۸۰ صفحات پر مشتمل ایک مبسوط مقدمہ تحریر کیا ہے، جس میں امور سلطنت اور سیاست پر تاریخ کی روشنی میں بحثیں کی ہیں، بادشاہوں کو امور خیر پر آمادہ کیا ہے اور وزراء کو معقول مشورے دیئے ہیں۔

الفخری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ابن طقطقا، نادر واقعات بیان کرتے ہیں، ایسے واقعات جو انسانی نفسیات کے آئینہ دار ہیں ان کو پڑھ کر انسان کو عبرت ہوتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ذاتی نفع کے لئے کیا کچھ کر سکتا ہے۔ ابن طقطقا کثرت سے قصے اور دل چسپ حکایتیں نقل کرتے ہیں۔ ان میں اکثر ایسی روایتیں ہوتی ہیں جو انسان کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں۔

فتنۂ مسیلمہ کذاب کے بارے میں ابن طقطقا لکھتے ہیں کہ :

"جس زمانہ میں مسیلمہ نے دعویٰ نبوت کیا اُسی دور میں قبیلۂ بنی تمیم کی ایک عورت "سجاح" نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا۔ پھر وہ مسیلمہ سے جنگ کے لیے نکلی۔ سجاح کا لشکر مسیلمہ سے بہت بڑا تھا، اگر جنگ ہوتی تو وہ یقیناً شکست کھا جاتا، لہذا اس نے اپنی مکاری سے ایک تدبیر سوچی۔ اس نے کہلا بھیجا کہ ہم دونوں ایک جگہ جمع ہوں اور اس وحی کا مطالعہ کریں جو دونوں پر الگ الگ اُتری ہے پھر جو حق پر ہو اس کی پیروی کی جائے۔ مسیلمہ نے ایک خیمہ چمڑے کا نصب کرایا، خوب خوشبو اور عود کا انتظام کیا، جب دونوں تنہائی میں "تلاش حق" کے لیے جمع ہوئے تو مسیلمہ نے اس کو دھوکہ دیا اور ملاقات کو جنسی رُخ دے دیا۔ تعجب اس پر ہے کہ وہ اس امر سے ناخوش نہ ہوئی بلکہ اُس نے کہا جب میں باہر نکلوں گی تو اعلان کردوں گی کہ مسیلمہ برحق نبی ہے اس وقت تم میرے قبیلہ کو پیغام دینا اور میری شادی تم سے ہوجائیگی۔ چنانچہ مسیلمہ نے پیام دیا اور شادی کرلی۔ مسیلمہ نے مہر میں عصر کی نماز معاف کردی۔ کہا جاتا ہے کہ بنی تمیم آمل کے مقام پر آج تک عصر کی نماز نہیں پڑھتے اور کہتے ہیں کہ یہ ہماری محترمہ معززہ "سجاح" کا مہر ہے۔" [۱]

تعجب اس پر ہوتا ہے کہ وہ ایک صاحب بصیرت مؤرخ ہوتے ہوئے توہم پرستانہ قصے نقل کرتے ہیں اور ان کو اس طرح پیش کرتے ہیں گویا کہ وہ من وعن صحیح ہیں مثلاً کہتے ہیں کہ: "جب ایران پر اللہ تعالیٰ نے عربوں کو فتح دلائی تو سب سے پہلے ان کے دلوں پر رعب طاری کردیا، پھر کسریٰ کے ایوان کے کنگورے گر گئے اور ایران کے آتشکدوں میں جو آگ ایک ہزار برس سے جل رہی تھی وہ بجھ گئی موبذان نے کسریٰ سے اپنا خواب بیان کیا کہ میں نے ایک اونٹ کو دیکھا کہ وہ ایک گھوڑے کو ہنکار رہا ہے۔ کسریٰ نے پوچھا کہ تم نے کیا تاویل کی، وہ بولا کوئی حادثہ عربوں کی طرف سے واقع ہونے والا ہے" [۲]

---

[۱] الفخری، مطبوعہ دار صادر بیروت ۱۹۶۶ء ص ۷۵۔ [۲] الفخری ص ۷۷۔

خود سے کنگوروں کا گرنا اور از خود صدیوں کی آگ آتشکدوں میں بجھ جانا خلافِ عقل معلوم ہوتا ہے، اگرچہ اس کا ذکر دوسرے مؤرخین بھی کرتے ہیں۔

ابن طقطقا اسی سلسلے میں ذکر کرتے ہیں کہ جب حضرت سعد بن ابی وقاص قادسیہ کے مقام پر پہنچے تو غذا کی قلت کا احساس ہوا انھوں نے کچھ آدمی بکریوں اور گایوں کی تلاش میں روانہ کیے۔ ان کو ایک آدمی راہ میں ملا، اس سے انھوں نے دریافت کیا کہ یہاں گائیں اور بکریاں کہاں ملیں گی؟ وہ بولا کہ مجھ کو معلوم نہیں، حالانکہ وہ خود چرواہا تھا اور اس نے جانوروں کو ایک جگہ درختوں کے جھنڈ میں چھپا رکھا تھا۔ اتفاق سے ایک جانور بول اٹھا۔ چنانچہ جب انھوں نے اُس جگہ جا کر دیکھا تو بہت سے جانور پائے اور ان کو لاکر حضرت سعد بن ابی وقاص کی خدمت میں حاضر کیا۔[1]

جنگ قادسیہ کے سلسلے میں حضرت عمرؓ کو بڑی فکر تھی، روز مدینہ کے باہر نکل جاتے اور راہ گیروں سے حالات دریافت کرتے رہتے۔ حضرت عمرؓ کو ایک دن ایک شخص نظر آیا وہ گھوڑے پر تھا اور حضرت عمرؓ پیدل۔ آپ نے اس سے دریافت کیا کہ تم کو کچھ خبر سعد اور ان کے لشکر کی معلوم ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں اللہ نے فتح وظفر سے نوازا ہے۔ حضرت عمرؓ اس کے ساتھ پیدل چل رہے تھے اور وہ شخص گھوڑے پر تھا وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ حضرت عمر ہیں جب دونوں مدینہ کے اندر داخل ہوئے اور لوگ حضرت عمرؓ کو امیر المومنین کہہ کر سلام کرنے لگے تو اس بدوی نے جانا کہ یہ حضرت عمر ہیں اور بولا حضرت آپ نے مجھے بتلا دیا ہوتا۔ فرمایا کہ "لا بأس علیک یا اخی" "کوئی حرج نہیں اے میرے بھائی!"۔[2]

اس جنگ کے بارے میں ابن طقطقا نے بعض دلچسپ حکایتیں لکھی ہیں کہ ایک شخص کو کافور کی ایک تھیلی ملی، اس نے اس کو نمک سمجھا اور کھانے میں ڈالا مگر جب کوئی مزا نہ پایا۔ ایک شخص نے کافور کو پہچان لیا اور ایک پرانی قمیص کے بدلے خرید لیا۔

---

[1] الفخری ص ۷۹۔ [2] ایضاً ص ۸۱۔

جنگ قادسیہ میں ایک بدوی کو ایک یاقوت مل گیا وہ اس کی قیمت سے واقف نہ تھا، ایک شخص نے اس کو دیکھ کر پہچان لیا اور ایک ہزار درہم میں اس کو خرید لیا۔ بیچنے کے بعد بدوی کو احساس ہوا اور اس کے دوستوں نے اس کو ملامت کی کہ "ہزار سے زیادہ کیوں نہ مانگا ؟" وہ بدوی بولا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ایک ہزار سے بڑا عدد بھی ہوتا ہے تو میں ضرور مانگتا۔"

"بعضوں کا حال یہ تھا کہ سونا اٹھا کر بولتے کہ کون اس کو چاندی سے بدلے گا ؟ اس لیے کہ وہ چاندی کو سونے سے بہتر تصور کرتے تھے۔"[1]

اس آخری حکایت پر یقین نہیں آتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قصہ گویوں کی طرح ابن طقطقا کو قصہ نویسی کا شوق ہے وہ ہر قسم کے قصے لکھتے چلے جاتے ہیں کہیں لکھ دیتے ہیں کہ اس موقع پر چند قصے لکھنے میں حرج نہیں کسی معتبر اور باوقار مؤرخ کے لیے یہ مناسب نہیں کہ ان عوامی قصوں کو اپنی تصنیف میں بغیر تحقیق جگہ دے جو عقلی طور پر صحیح نہیں معلوم ہوتے۔ مثلاً دنیا میں کوئی بھی صاحب عقل یہ باور نہیں کر سکتا کہ کوئی شخص اتنا بے عقل ہو سکتا ہے کہ چاندی کو سونے سے بہتر سمجھے اور اس سے اس کو بدل لے۔

کتاب میں وزراء کی حیل بازیوں کے بہت سے واقعات ابن طقطقا نے درج کیے ہیں:

"مکتفی باللہ نے اپنے وزیر سے ایسی کتابیں طلب کیں جن سے وہ اپنا وقت گزار سکے اور لطف لے سکے۔ وزیر نے ایک شخص سے کتابیں منگائیں وہ تاریخی کتابیں لے آیا جب وزیر نے ان کو دیکھا تو بولا کہ میں نے ایسی کتابیں لانے کو کہا تھا جن کے قصوں میں بادشاہ خوش رہے اور ہمارے کاموں سے غافل ہو جائے مگر تم ایسی کتابیں لائے ہو جو ہماری ہلاکت کا باعث ہیں، ان کو پڑھ کر وہ وزراء کے طریقے، مال کو دریافت کرنے کی تدبیر اور رعیت کی خوش حالی کی راہیں جان جائے گا۔ یہ سب میری ہلاکت کا سامان بن جائے گا۔

---

[1] الفخری۔ ص ۸۲۔

ایسی کتابیں لاؤ کہ خلیفہ عشقیہ قصوں میں گم ہو جائے اور اشعار پڑھ کر لطف لے[1]

جب مکتفی کا انتقال ہوا تو اس کے وزیر نے ارادہ کیا کہ عبداللہ بن معتز کو خلیفہ بنائے جو کہ مشہور عالم شاعر اور فاضل عصر تھے، اس وقت بعض لوگوں نے اس سے کہا کہ ایسے شخص کو خلیفہ بنانا کہاں کی عقلمندی ہے جو تمام معاملات پہ نظر رکھتا ہے اور نہایت سریع الفہم ہے بہتر یہ ہے کہ کسی بچے کو خلیفہ بناؤ اور اس کے صاحب فہم بننے تک حکومت کرو۔ جب وہ بڑا ہو جائے گا تو حق تربیت کے صلے میں تمہارا شکر گزار رہے گا۔ وزیر نے مشورہ دینے والے کا شکریہ ادا کیا اور عبداللہ بن معتز کے بجائے مقتدر کو خلیفہ بنایا جسکی عمر ۱۳ برس کی تھی[1]

خلیفہ منصور کے بارے میں لکھا ہے کہ: ایک بار اس نے اپنے وزیر سے کہا کہ میرے بیٹے صالح کے پاس کوئی جائیداد نہیں۔ ابوالیوب وزیر بولا کہ اھواز میں زمینیں خالی پڑی ہیں اگر تین لاکھ درہم صرف کیے جائیں تو بڑی آمدنی ہو سکتی ہے۔ منصور نے تین لاکھ درہم دیدیئے۔ وزیر ہر فصل پہ ۲ ہزار درہم جائیداد کی آمدنی کے نام سے خلیفہ کو دیدیتا تھا مگر واقعہ یہ تھا کہ اس نے درہم خود لے لیے اور کھیتی وغیرہ کچھ نہ کرائی۔ دشمنوں نے خلیفہ کو اصل واقعہ بتادیا۔ چنانچہ منصور صالح کے کھیتوں اور باغوں کو دیکھنے نکلا مگر سرکاری باغوں اور کھیتوں کو دکھا کر ابوالیوب نے کہا یہی زمینیں ہیں جو میں نے ٹھیک کرائی ہیں۔ پھر دشمنوں نے صحیح صورتحال سے آگاہ کیا۔ بالآخر تحقیق کے بعد حقیقتِ حال واضح ہو گئی تو منصور نے ابوالیوب کو قتل کرادیا[2]

درحقیقت الفخری کتاب العجائب ہے، اس میں عجیب اور دلچسپ واقعات کو جمع کیا گیا ہے۔ یہاں چند واقعات درج کیے جاتے ہیں۔ ابوعلی محمد بن علی بن مقلہ کا داہنا ہاتھ خلیفہ راضی باللہ نے کٹوادیا تھا وہ بائیں ہاتھ سے بھی اتنا ہی عمدہ لکھتا تھا جیسے کہ داہنے ہاتھ سے۔ عجیب اتفاق اس کی زندگی میں یہ ہوا کہ وہ تین بار وزیر بنایا گیا اور

---

[1] الفخری ص ۸۔ [2] ایضاً ص ۱۷۶۔

تین بار دفن کیا گیا۔ جب وہ قتل کیا گیا تو پہلے خلیفہ کے گھر کے احاطہ میں دفن ہوا پھر اس کے گھر والوں نے کہا کہ ہم اس کی لاش چاہتے ہیں لہذا وہ کھود کر لے گئے اور دفن کیا۔ پھر اس کی بیوی نے مطالبہ کیا کہ میں اپنے گھر میں اس کو دفن کروں گی چنانچہ اس نے اس کی قبر کھدوا کر لاش اپنے گھر منگوائی اور دفن کیا۔[1]

قاہر باللہ کے بارے میں ابن طقطقا لکھتے ہیں کہ ترکوں نے ان کی آنکھوں کو پھوڑا حتٰی کہ وہ پھوٹ کر گالوں پر بہہ گئیں۔ پھر ان کو بار بار قید کیا اور چھوڑا حتٰی کہ وہ مجبور ہو گیا بھیک مانگنے پر۔ وہ جامع دمشق گیا اور صدقہ مانگنے لگا اس پر بعض اہل ہاشم نے ۵۰۰ درہم عطا کیے اور صدقہ مانگنے سے منع کیا۔[2]

میرا خیال ہے کہ کسی ہاشمی کے ۵۰۰ درہم عطا کرنے کی بات ابن طقطقا نے بڑھائی ہے جبکہ احمد امین ظہر الاسلام میں لکھتے ہیں کہ اس نے بھیک مانگتے ہوئے کہا کہ "تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں"۔ انھوں نے پانچسو درہم کا ذکر نہیں کیا۔[3] مگر قاہر خود بھی ظالم تھا اس نے مقتدر کی ماں کو ایک ٹانگ پر معلق کر دیا تھا۔

ابو شجاع بویہ کے ایک خواب کا ذکر ابن طقطقا نے کیا ہے کہ اس نے ایک رات خواب دیکھا کہ اس نے پیشاب کیا جس سے آگ نکلی وہ اتنی بڑھی اور پھیلی کہ آسمان تک پہنچی اور پھر اس سے تین شعلے پیدا ہوئے اور ان شعلوں سے دوسرے شعلے نکلے۔ ایک منجم نے اس کو بتایا کہ تمھاری اولاد بادشاہ ہوگی مگر اس نے کہا کیوں مجھ سے مذاق کرتے ہو، میں تو مفلس ہوں اور میرے بیٹے بھی مفلس ہیں۔ مگر حالات نے خواب کو صحیح ثابت کر دیا۔ اسی بنا پر معزالدولہ کہا کرتا تھا کہ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں اس نعمت پر ــــ ورنہ پہلے لکڑیاں کاٹ کر سر پر لادتا تھا۔[4]

ابن طقطقا نے لکھا ہے کہ مقتدر کا وزیر ابن خصیب عقلمند تھا ایک دن مقتدر نے

---

[1] الفخری ص ۲۷۲۔ [2] ۲۷۳ [3] ایضاً ص ۲۷۶ [4] ایضاً ص ۲۷۶ [5] ایضاً ص ۲۷۷۔

لشکر روانہ کیا مگر اس کو فکر تھی کہ لشکر کا حال جلدی جلدی اس کو ملتا رہے ابن خصیب نے چڑیوں کو ساتھ کر دیا جو جلد جلد خبر رسانی کا فریضہ انجام دیتی تھیں حتیٰ کہ تمام باتیں لشکر کے بارے میں روز معلوم ہوتی تھیں اس لیے کہ اس کے بعض دوست روز حالات لکھ کر چڑیا کے جسم پر باندھ کر روزانہ ایک چڑیا چھوڑ دیتے تھے۔[1]

اگرچہ شعر و ادب میں کبوتر کی نامہ بری معروف ہے مگر چڑیوں کی اس طرح اخبار رسانی درایت کی نظر سے صحیح نہیں معلوم ہوتی۔

یہی مورخ جب آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کا ذکر کرتا ہے تو مکفتی تعصب سے کام لیتا ہے۔ وہ نالائق اور سازشی وزیر اعظم مؤید الدین محمد بن علقمی کی تعریف کرتا ہے اور واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

وکان اصحابہ مستولین علیہ کلھم جھال من ارازل العوام الا وزیرہ مؤید الدین محمد بن العلقمی فانہ کان من اعیان الناس و عقلاء الرجال وکان مکفوف الیہ، مردود العقول، یترقب العزل والقبض صباح مساء

خلیفہ کے جو حاشیہ نشین اس پر مسلط تھے وہ سب جاہل تھے عوام کے کمینے طبقے سے تعلق رکھتے تھے، سوا اس کے وزیر مؤید الدین محمد بن علقمی کے۔ وہ اہم لوگوں میں سے تھا اور نہایت عقل مند تھا مگر اس کے ہاتھ بندھے تھے اور اس کی بات کوئی نہ سنتا تھا بلکہ وہ صبح و شام معزول ہونے یا گرفتار ہونے کا منتظر رہتا تھا۔

وہ مزید لکھتا ہے کہ وزیر علقمی ہلاکو کے خطرے سے برابر خلیفہ کو متنبہ کرتا رہا مگر اس کی غفلت بڑھتی گئی یہاں تک کہ ہلاکو نے حملہ کر دیا اور شکست کے بعد اس نے خلیفہ کو مع خاندان طلب کیا۔ عورتوں کو قید کر دیا اور مردوں کو ۴ صفر ۶۵۶ھ میں شہید کر ڈالا۔

ابن طقطقا کا بیان حقائق کے سراسر خلاف ہے چنانچہ میں یہاں چند مشہور مورخین کے

---

[1] الفخری ص ۲۷۰۔

بیانات تاریخِ اسلام مؤلفہ شاہ معین الدین احمد ندوی کے حوالہ سے نقل کرتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ علقمی نے ہلاکو اس لیے بلایا تھا تاکہ عباسی حکومت کا خاتمہ کر کے علوی حکومت قائم کرلے[1]

ابنِ خلدون لکھتا ہے کہ فوج کو الگ کرنے کے بعد اس نے "اربل" کے ذریعہ تاتاریوں کو بغداد پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا[2]

حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ اس نے عباسی حکومت کو ہٹا کر علوی حکومت قائم کرنے کے لیے تاتاریوں سے خط وکتابت کی[3]

سیوطی کا بیان ہے کہ: "معتصم کو اپنے وزیر مؤید الدین علقمی شیعی پر بڑا اعتماد تھا۔ اس نے ملک کو تباہ کر ڈالا۔ وہ خلیفہ سے جس طرح چاہتا تھا کھیلتا تھا، پوشیدہ تاتاریوں سے ملا ہوا، اور ان کا خیر خواہ تھا۔ اس نے عباسی خلافت کو مٹا کر علوی حکومت قائم کرنے کے لیے تاتاریوں کو عراق پر فوج کشی اور بغداد پر قبضہ کرنے کی طمع دلائی اور ان کی خبریں خلیفہ سے بالکل پوشیدہ رکھتا تھا[4]

علقمی نے شکست کے بعد خلیفہ مستعصم سے کہا کہ ہلاکو آپ کو منصبِ خلافت پر قائم رکھے گا آپ خود چل کر اس سے ملیے چنانچہ خلیفہ مع علماء و فقہاء، اکابر و اعیان کے ہلاکو کے پاس گئے۔ اس نے مستعصم کو ڈنڈوں سے پیٹ پیٹ کر ختم کیا، اس کی لاش کو پیروں سے مسلا اور ان میں سے کسی کو گور و کفن میسر نہ آیا[5]

ابن طقطقا نے ان مسائل میں جن کا مذہبی عقیدت سے تعلق ہے۔ تعصب سے کام لیا ہے، جس کی مثال علقمی کے بارے میں ان کا بیان ہے۔

---

[1] تاریخ اسلام، عصر عباسی حصہ دوم۔ ص ۴۰۰ - ۴۰۱۔ [2] ابن خلدون ج ۳۔ ص ۵۳۷۔ [3] دول الاسلام ج ۲۔ [4] تاریخ الخلفاء ص ۴۷۶۔
[5] ابو الفداء ج ۳ ص ۱۹۴۔

بہر حال مؤرخ اسلام کے لئے اس کتاب میں بڑا قیمتی مواد ہے جس سے وہ کبھی مستغنی نہیں ہو سکتا۔ البتہ علویوں کے بارے میں ان کے بیانات کی تحقیق دوسرے مؤرخین کی کتابوں سے ضروری ہے۔

الفخری میں ابن طقطقا لکھتے ہیں، (۱) لکھتے ہیں کہ "مؤیدالدین علقمی مستعصم کا وزیر اعظم اہل علم کی مجالس پسند کرتا تھا مگر وہ خود زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا"[1]

(۲) پھر دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ "خلیفہ مستعصم کے گرد جہلا اور اراذل عوام جمع تھے صرف اس کا وزیر علقمی نہایت عقلمند اور سربر آوردہ لوگوں میں تھا"[2]

ابن طقطقا کہتے ہیں کہ " وزیر علقمی برابر خلیفہ کو متنبہ کرتا رہا مگر اس کی غفلت بڑھتی چلی گئی اس کے ہم نشینوں نے اس کو یقین دلا دیا تھا کہ کوئی خطرے کی بات نہیں علقمی فوج بڑھانے کے بہانے پیسہ کھانا چاہتا ہے"[3]

حالانکہ معاملہ اس کے برعکس تھا خود علقمی نے اس کو غفلت میں رکھا اور حقیقت حال کی اطلاع نہ ہونے دی۔ ہلاکو پر خلافت کا رعب تھا مگر علقمی نے اس کو دعوت دے کر بلایا جیسا کہ پہلے مؤرخین کے بیانات گزر چکے ہیں۔

خود ابن طقطقا خلیفہ مستعصم کی عظمت، شرافت، علم، اخلاق اور دینداری کے معترف ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ: "اگر خلیفہ کے کتب خانہ میں اس کی مسند تھی جب وہ آیا تو دیکھا کہ ایک چھوٹا ملازم سو گیا ہے اور اس کے پیر مسند پر آگئے ہیں، خلیفہ نے ایک خادم کو چپکے سے بلایا اور کہا کہ اگر میں اس کو جگاؤں گا تو یہ ڈر جائے گا میں باہر باغ میں چلا جاتا ہوں تم اس کو اٹھا دو۔ چنانچہ ایسا ہی اس نے کیا پھر خلیفہ آگئے"[4]

---

[1] الفخری ص ۱۸ ——— [2] الفخری ص ۳۳۳ - [3] الفخری ص ۳۳۵ -
[4] الفخری ص ۳۳۴ -

ابن طقطقا نے ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے جو دلچسپ ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

"۶۵۶ھ میں جب ہلاکو نے بغداد فتح کیا تو مستنصریہ میں علماء کو جمع کیا اور ان کے سامنے ایک مسئلہ پیش کیا اور ان سے فتویٰ طلب کیا مسئلہ یہ تھا: "کہ عادل کافر بادشاہ افضل ہے یا مسلمان ظالم بادشاہ" جب علماء نے مسئلہ سنا تو خاموش ہو گئے اور رائے دینے سے اجتناب کیا۔ رضی الدین علی بن طاؤس ممتاز عالم وہاں موجود تھے، انھوں نے کاغذ اٹھایا اور لکھا کہ کافر بادشاہ اگر عادل ہو تو ظالم مسلمان بادشاہ سے بہتر ہے پھر انھوں نے دستخط کر دیئے۔ اس پر دوسرے علماء نے بھی دستخط ثبت کیے"[۱]

چند تسامحات سے قطع نظر کتاب "الفخری" میں بعض ایسے واقعات اور ایسے تاریخی حقائق موجود ہیں جن کا ذکر دوسری کتابوں میں نہیں ملتا۔ مصنف نے جس مؤرخانہ بصیرت سے مقدمہ تحریر کیا ہے وہ بھی غیر معمولی اہمیت و عظمت کا حامل ہے، اسی بنا پر اس کتاب کو علمی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہو گئی اور بہت سے مدارس میں اس کو درس میں شامل کر لیا گیا۔

[۱] الفخری ص ۱۱

ایلخانی عہد کا تاریخی ادب

ڈاکٹر زہرہ عرشی ایم اے، پی، ایچ، ڈی رام پور

فن تاریخ نویسی کو مسلمانوں کی دنیا میں ہمیشہ سے ہی مقبولیت و اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس فن کو بام عروج پر پہنچانے کے لئے انھوں نے جس جگر کاوی سے کام لیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اپنے تاریخی شاہکاروں میں انھوں نے اس فنکاری کا ثبوت دیا کہ جدید اور ترقی یافتہ دنیا کے مورخین بھی اس پر کوئی نمایاں اور قابل لحاظ اضافہ نہیں کر سکے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان مورخوں نے اپنے آقاؤں کے کارناموں، ان کی سیاسی سرگرمیوں، ان کی داد و دہش، ان کے عدل و انصاف اور ان کی جنگی فتوحات پر زیادہ زور دیا ہے۔ لیکن یہ بھی وقت کا تقاضا تھا اور اس کے لئے وہ مجبور تھے۔ کیونکہ وہ شخصی حکومتوں کا دور تھا اور اس وقت انھیں چیزوں کی اہمیت تھی۔ اس کے نتیجے میں ہمارے مورخ ثقافتی، معاشرتی اور معاشی پہلوؤں پر توجہ نہ دے سکے۔

سرزمین ایران ہمیشہ سے علم و ادب کا گہوارہ رہی ہے اور ایرانی علما کی سرشت میں بھی تاریخ نویسی کا ذوق بدرجۂ اتم موجود تھا۔ چنانچہ ادبیات ایران میں ایسے بے شمار شاہکار موجود ہیں جن کی حیثیت تاریخ میں مسلم ہے۔ تاریخ بیہقی، تاریخ وصاف، تاریخ گزیدہ، طبقات ناصری اور تاریخ جہاں کشا اس کی نمائندہ مثالیں ہیں۔ اس میں سے تاریخ بیہقی کے علاوہ یہ تمام تاریخیں ایلخانی عہد میں تصنیف ہوئیں۔

فارسی کی قدیم نثری کتابوں میں تاریخ جہاں کشائے جوینی کا ایک بلند مقام ہے۔ اس کتاب میں علاء الدین بن عطا ملک بن محمد جوینی نے خاندان چنگیز و ہلاکو کی تاریخ لکھی ہے۔

چونکہ وہ خود اس خاندان سے وابستہ تھا جس کا تذکرہ اس نے اپنی کتاب میں کیا ہے اس لئے تاریخی حیثیت سے یہ کتاب بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ جوینی نے ۱۲۶۰ء میں اسے مکمل کیا اور ۱۲۵۷ء تک کے واقعات بالتفصیل بیان کئے ہیں۔

جوینی کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جو نسلوں سے حکومتوں میں دخیل اور کلیدی عہدوں پر فائز رہا، اس خاندان کے اکثر لوگ صاحب دیوان کے لقب سے مشہور ہوئے۔ خود اس کا باپ بھی اسی نام سے جانا پہچانا جاتا تھا۔ جوینی نے بہت کم عمری سے انتظام حکومت میں حصہ لینا شروع کیا تھا۔ یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ نثر فارسی کے اس عظیم مصنف کو جو سب سے پہلا عہدہ تفویض ہوا وہ کاتب کا تھا۔

علاالدین کو دشمنوں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا لیکن یہ اس کا تدبر و اقتدار تھا کہ جس نے اپنے تمام مواقع پر فتح و کامرانی کے پھول جوینی کے دامن میں بھر دیئے۔ وہ اپنے زمانے کے صاحبان علم وفن اور خدایان شعروادب کے نزدیک قابل احترام اور لائق تعظیم ہستی تھا۔ وہ خود بھی عالم و فاضل تھا اور ماہرین علوم وفنون کا ہمیشہ حامی و ناصر رہا۔

وہ ایک بلند پایہ ادیب تھا اور اس کی جو تحریریں ہمارے سامنے آئی ہیں ان میں تاریخ جہاں کشا ہر لحاظ سے نمایاں، اہم اور قابل توجہ تصنیف ہے اس کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ مصنف نے اپنے دور کے حالات بالتفصیل بیان کئے ہیں۔ اس کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ اس دور سے متعلق کوئی اور اہم تصنیف موجود نہیں اور مابعد کی جو تاریخیں ملتی بھی ہیں وہ سب کی سب جوینی کی خوشہ چین ہیں یہاں تک کہ تاریخ وصاف، جامع التواریخ، تاریخ گزیدہ اور حبیب السیر جیسی گراں قدر تصانیف میں بھی اس سے استفادہ کیا گیا ہے۔

یہ کتاب اس لئے بھی اہم ہے کہ اس کے ایک بڑے حصے کا عینی شاہد خود جوینی ہے۔ اس کی آنکھوں نے زمانے کے انقلابات کو جس طرح دیکھا ہے۔ بلا کم و کاست پیش کر دیا۔

یہ کتاب صرف تاریخی واقعات پر مشتمل نہیں بلکہ اس میں منگولوں کے اخلاق وعادات طورطریق رہن سہن اور آداب و رسوم کی بڑی سچی تصویریں ملتی ہیں۔ اس کتاب میں آئین جہاں بانی سے متعلق وہ ساری تفصیلات ملتی ہیں، جس کی تنزل و ترقی کا سہرا جوینی نے منگولوں کے سر باندھا ہے اس طرح منگولوں سے متعلق تاریخ جہاں کشا بیک وقت فتوحات رسومات اور طرز آئین حکومت کے بارے میں ایک ایسی کتاب ہے جسے ہر لحاظ سے ادبیت کا درجہ حاصل ہے۔ اس لئے کہ وہ جس دور سے متعلق ہے اس کے بارے میں اور کوئی بھی کتاب ان ساری خصوصیات کا دعویٰ نہیں کر سکتی جو جوینی کی اس تصنیف کے ساتھ وابستہ ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی نے بھی اسے سب سے اہم اور مستند تاریخ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "خواجہ شمس الدین کا دوسرا بھائی علاء الدین ہلاکو کی طرف سے بغداد کا حاکم تھا اور نہایت صاحب فضل و کمال تھا، تاتاریوں کی سب سے مفصل اور مستند تاریخ جہاں کشا اسی کی تصنیف ہے"

(شعر العجم صدگ)

اس کی تلاش و تحقیق اور جانفشانی کے پیش نظر ملک الشعرا بہار نے اپنی تصنیف سبک شناسی کی جلد سیوم میں جوینی کے بارے میں لکھا ہے کہ " فارسی بلکہ عربی تاریخ میں بھی سوائے ابن خلدون کے کوئی شخص خوارزم شاہیوں کی شکست اور انقراض مدنیت ایرانیہ وغیرہ کے متعلق اس تلاش و تحقیق کے ساتھ جیسی کہ ابن عطا ملک کی ہے ایسے فلسفیانہ نتائج پر کوئی نہیں پہنچا"۔

ڈبلیو بارتھولڈ نے بھی اس کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے "یہ کتاب تاریخی اعتبار سے اول درجہ کی اہمیت رکھتی ہے اس کا مصنف غالباً واحد فارسی مورخ ہے جس نے منگولیا کا سفر کیا تھا۔ اور مشرقی ایشیا کے ممالک کے حالات خود اپنے تجربے سے لکھے تھے"۔

اس کی تاریخی اہمیت سے قطع نظر جہاں کشا کی ادبی خصوصیات نے بھی اس کی قدر و منزلت میں اضافہ کیا ہے۔ اس میں مصنف نے اپنی بہترین ادبی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ

کیا ہے۔ اس کی عبارت انتہائی صاف، سلیس اور گہرائی و گیرائی کی حامل ہے۔ وہ سادہ اور مختصر الفاظ میں پیچیدہ دقیق اور اہم خیالات کے اظہار کی زبردست قدرت رکھتا تھا۔ کبھی کبھی اس سادگی میں رنگینی کی آمیزش بھی پائی جاتی ہے اور اس طرح عبارت کا روپ کچھ اور نکھر جاتا ہے۔ لیکن مصنف نے اس اعتدال کو کہیں بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔

اس کی عبارت میں تجنیس، سجع اور اشتقاق جیسی صنعتیں بھی مل جاتی ہیں قرآن وحدیث سے استدلال بھی ہوتا ہے، فارسی و عربی شواہد اور امثال کا استعمال بھی ملتا ہے اور جا بجا تلمیحات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے تاہم ملک الشعرا بہار کے الفاظ میں "نثرش خستہ کنندہ نیست۔"

اس نوع بنوع حسن کا تقاضہ تو یہ ہے کہ عبارت شاید ہی کہیں بوجھل اور ناگوار ہوئی ہے۔ سلاست اور لطافت کے ساتھ ساتھ خال خال پر تکلف اور تعقید سے بھری پری عبارتیں بھی آجاتی ہیں۔ لیکن اس کی عمومی دلکشی کے پیشِ نظر کتاب کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

بہرحال عطا ملک جوینی کی تاریخ جہاں کشا فارسی نثر کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کا مقام تاریخ ادب میں نمایاں اور جس کی ادبی حیثیت مسلم ہے سیاست نامہ کی سادہ ترین عبارت سے جہاں کشا کے قدرے رنگین اور پر تکلف اسلوب تک جو سفر فارسی زبان نے کیا ہے اور اس کو جو بلاغت عربی الفاظ کے تحت ملی اس کے لحاظ سے یہ تاریخ ہر دور میں اپنی جانب متوجہ کرتی رہے گی

تاریخ وصاف ایلخانی عہد کی دوسری اہم تصنیف ہے۔ اس کا مصنف شہاب الدین عبداللہ شیرازی اپنے عہد کے زبردست عالموں اور فاضلوں میں اہم مقام رکھتا تھا۔ وہ وصاف حضرۃ کے لقب سے مشہور تھا۔

براون نے خود مصنف کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ تاریخ تاریخ جہاں کشا کے تعقیب کے

خیال سے لکھی گئی تھی۔ شفق نے بھی اسے جہاں کشا کا نتیجہ قرار دیا ہے۔

وصاف نے اپنی اس تاریخ میں ۱۲۵۷ء سے لے کر ۱۳۲۸ء تک کے واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس طرح اس کے تاریخی واقعات کی کڑی جہاں کشا سے مل جاتی ہے۔ بلاشبہ یہ ایک گراں قدر تاریخی کارنامہ ہے جس میں مصنف نے اپنے عہد کے واقعات کا تذکرہ سچائی اور صداقت کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن اس کی پر تکلف اور تعقید سے بھری بھری عبارت نے اس کی افادیت میں قدرے کمی کر دی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کی پیچیدہ عبارت اور تصنع آمیز طرز کے پیش نظر اس کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا۔ "بڑا زور مارا مگر فقط لغاظی اور لغت بازی ہے۔ عربی فارسی ترکی لفظوں کا حشر برپا ہے۔"

ہمیں بغیر کسی پس و پیش کے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وصاف کی زبان دقیق اور پر تکلف اس کی تشبیہیں اور استعارے پیچیدہ اور اس کا انداز بیان گنجلک ہے۔ جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے کہ اس کا مقصد بہترین اور شاندار اسلوب تحریر کا مظاہرہ کرنا ہے۔ اس کے باوجود بھی اس کی مفید، اہم تاریخی تفصیلات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ براون نے اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ کتاب جتنی ملال انگیز ہے اتنی ہی اہم بھی ہے۔"

ڈاکٹر ریو نے اس تاریخ کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے "اس کی تاریخ میں ایک اہم دور کی مستند معاصر روداد ملتی ہے لیکن اس کے لاریب افادے میں ترتیب کی بے اصولی سے ناحد ے فرق آگیا ہے۔"

المعجم فی آثار العجم ایک مختصر تاریخ ہے جس میں ساسانی عہد کے اہم تاریخی واقعات کا تذکرہ کیا گیا ہے اسکا مصنف فضل اللہ حسینی ہے۔ اس تاریخ کی بھی سب سے اہم خصوصیت طرز تحریر ہے جس میں مصنف نے وصاف کی طرح پیچیدہ، دقیق اور ثقیل عبارت کا التزام کیا ہے۔ براون نے اس تصنیف کا بڑے پرشکوہ الفاظ میں تذکرہ کیا ہے اور اس کے مختلف نسخوں کی نشاندہی بڑے مشرقی کتب خانوں میں کی ہے۔

ایلخانی عہد کا ایک اور تاریخی کارنامہ جامع التواریخ ہے جس کا مصنف رشید الدین فضل اللہ اپنے عہد کا عظیم مدبر، قابل اعتماد مورخ، زبردست طبیب اور جید عالم تھا۔ اس عظیم تصنیف کا محرک غازان خاں تھا جس نے رشید الدین فضل اللہ کو اس اہم کام پر آمادہ کیا۔ جامع التواریخ فضل اللہ کی عالمانہ بصیرت اور مدبرانہ صلاحیتوں کا کامیاب ترین نمونہ ہے۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ تیسری جلد دست برد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکی۔

مصنف نے پہلی جلد میں تاتاریوں کی تاریخ لکھی ہے جس کی وجہ سے اس کے تاتاری آقاؤں کے کارناموں کو حیات نو مل گئی ہے۔ یہ کتاب شتارنج عالم، مغلوں کی سلطنت اور خصوصیت سے غازان کی حکومت پر تفصیلی روشنی ڈالتی ہے۔ دوسری جلد ایک عمومی تاریخ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس عہد کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے لئے جامع التواریخ کے بغیر کوئی اپنے موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔ پروفیسر براؤن نے اپنی موقر تصنیف میں ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے "فارسی نثری تصانیف اور کم سے کم شعبۂ تاریخ میں شاید ہی کوئی کتاب اپنی منفعت کے لحاظ سے اس کے مقابلے پر آسکے۔"

فضل اللہ کی یہ اہم تاریخ نہایت صاف، سادہ، سلیس اور شستہ زبان میں لکھی گئی ہے۔ اور ایک مخصوص اور لطیف ادبیت کی حامل ہے۔

عطا ملک جوینی کی طرح فضل اللہ بھی حکومتوں میں دخیل اور کلیدی عہدوں پر فائز رہا۔ اور یہ بھی اتفاق ہے کہ جوینی کی طرح وہ بھی دشمنوں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا شکار رہا۔ سر انجام ۱۸ء میں ایک سازش کے تحت سلطان ابو سعید کے حکم پر تبریز میں قتل کر دیا گیا۔

اس کی دوسری تصانیف میں توضیحات، مفتاح التفاسیر الرسالۃ السلطانیہ اور لطائف الحقائق ہیں جو اس کی عالمانہ بصیرت اور مختلف علوم و فنون پر اس کی دسترس کا ثبوت ہے۔

تاریخ گزیدہ، جہاں کشا اور جامع التواریخ کے بعد کی تصنیف ہے جو ضخامت کے اعتبار سے مختصر ہے لیکن اس میں مصنف نے کثیر معلومات کا احاطہ کیا ہے۔ شفق کے مطابق یہ جہاں کشا اور جامع التواریخ کا چربہ ہے۔ لیکن یہ ۷۳۰ھ میں تحریر کی گئی ہے اس لئے اس میں تازہ واقعات بھی ملتے ہیں۔ براؤن کے مطابق یہ معاصر واقعات پر اہم تصنیف ہے۔ اور چونکہ مختصر تصنیف ہے۔ اس لئے مفصل واقعات کا مطالبہ بے سود ہے۔ لیکن اس میں قابل اعتماد واقعات، عبارت کی شگفتگی، انداز بیان کی رعنائی اور زبان کی شائستگی ایسی خصوصیات ہیں جسے کسی دور میں بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر آر۔ اے۔ نکلس نے تاریخ گزیدہ کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کا ترجمہ مفصل اشاریات کے ساتھ شائع کیا۔

مستوفی کا دوسرا اہم کارنامہ ظفرنامہ ہے۔ جو اس نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقائع عمری سے شروع کیا اور ابو سعید کے دور حکومت تک کے مستند واقعات بے لاگ طور پر نظم کیے۔ براؤن نے اس کے اشعار کی تعداد ۷۵۰۰۰ لکھی ہے لیکن شفق کے مطابق اس میں کل ۷۵۰۰ شعر ہیں۔

مستوفی کے اس کارنامے کی تاریخی حیثیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت واقعات کی صداقت ہے۔ وہ اپنے عہد کا اہم مورخ ہی نہیں عظیم اور قابل اعتماد محقق کی بھی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر ریو نے اس کے بارے میں لکھا ہے "مصنف واقعات اور تاریخوں کے معاملے میں بڑا تحقیق پسند واقع ہوا ہے۔ اس کا تیسرا دفتر مغولی عہد کی تاریخ کے لئے مفید پایا جائے گا۔"

ظفرنامہ میں واقعات انتہائی سادگی، روانی اور فصاحت کے ساتھ نظم کئے گئے ہیں۔ مثلاً ذیل کے اشعار جس میں تاتاریوں کے ہاتھوں قتل و غارتگری کا نقشہ پیش کیا گیا ہے:

از یں رو بقزوین سپتای جنگ — در آمد بکردار غران پلنگ

بدانگہ کہ شد شہر دریای خون — دہ و ہفت جودی زششصد فزون

زشعبان گزر کردہ بد ہفت روز — کہ پیدا شد آں محنت و درد و سوز

در آں وقت بد حاکم ایں دیار — مظفر لقب ہنری نام دار

ظفرنامہ اب نایاب ہے اس کا واحد نسخہ عجائب خانۂ برطانوی میں محفوظ ہے۔ اس کا مصنف ۷۵۰ھ میں قزوین میں فوت ہوا۔

قاضی نصیر الدین البیضاوی کی تصنیف نظام التواریخ ۶۹۴ھ/۱۲۹۴ تک کے عام واقعات پر محیط ہے۔ یہ ایک مختصر تاریخ ہے ۱۹۳۵ء میں تہران سے شائع کی گئی۔

اسی عہد کی ایک اور مختصر تاریخ تاریخ بناکتی ہے۔ یہ مختصر تاریخ ابو سلیمان داودی نے رشید الدین کی لازوال تاریخ کے "تتبع میں لکھی ہے اور براون کے مطابق" اس میں رشید الدین کے وسیع تر تصور تاریخ کا اثر صاف طور پر نظر آتا ہے"۔

لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی معلومات کو جس کی بنیاد رشید الدین کی تاریخ پر کتی زیر بحث اقوام کے نمایندوں سے زبانی معلومات حاصل کرکے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ اور بعض ایسی معلومات بھی فراہم کیں کہ جن کا مغولی دور سے پہلے کسی بھی تاریخ میں تذکرہ نہیں کیا گیا۔

اس عہد کی آخری تاریخی تصنیف مجمع الانساب ہے۔ یہ اگرچہ کم مایہ کتاب ہے لیکن اس میں کچھ ایسے واقعات کا مصنف نے تذکرہ کیا ہے جو اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ ایک عام تاریخ ہے جس کا مصنف محمد ابن علی شبانکاری شاعر اور مورخ دونوں حیثیتوں کا مالک تھا۔۔۔۔

نعت

جناب محمد ایوب صاحب ایم، اے، بمبئی

معبودِ حقیقی سے بہت دور تھا انسان
گرداب بلا میں تھی پھنسی کشتیٔ ایمان

انسانیت افسردہ تھی اخلاق تھا پامال
انسان کے دشمن تھے خود انسان کے اعمال

اخلاق و محبت کے عوض عام تھی نفرت
بغض و حسد و کینہ تھی انسان کی فطرت

اللہ کی مخلوق کی یہ حالت بد تھی!
گمراہیٔ انسان کی دنیا میں نہ حد تھی

پھر خالقِ عالم نے کرشمہ یہ دکھایا
باطل کی زمیں سے شجرِ نور اُگایا!

تاریک فضاؤں میں نئی روشنی آئی
گلزارِ براہیم میں پھر فصلِ گل آئی

حق اور صداقت کا کھی چرچا ہوا ہر سو
الحاد جو سرگرم تھا پسپا ہوا ہر سو

یہ معجزہ اک بندۂ کامل نے دکھایا
توحید کا پرچم علی الاعلان اٹھایا

شمشیر تھی پاس اس کے نہ سپر تھی نہ کماں تھی
پاس اس کے فقط پیار محبت کی زباں تھی

ہر ظلم کے بدلے میں وہ دیتا تھا دعائیں
دشمن پہ تھیں اس کی محبت کی نگاہیں

افلاس سے پائی نہ کبھی اس نے رہائی
قربان مگر اس پہ تھی سلطانی و شاہی

اس کا دلِ پُرسوز ہر اک کے لیے دھڑکا
رحمت کا وہ بادل جہاں پہنچا وہاں برسا

اللہ کا محبوب، دوعالم کا اُجالا
نبیوں کا وہ سرتاج تھا دنیا کا سہارا

قرآن کے فرمان پہ رہتا تھا وہ عامل
اللہ کا ہمراز تھا وہ بندۂ کامل!

کیا درجہ تھا کیا مرتبہ تھا کیا آن تھی کیا شان
دُنیا کا وہ انسان بنا عرش کا مہمان

یہ بندۂ و آقا کی ملاقات تو دیکھو
اک خاک نشیں کے یہ کمالات تو دیکھو

یہ واقعہ تاریخ کا اک بابِ گراں ہے
انسان کی عظمت کا درخشندہ نشاں ہے

جلد ۸۲ ربیع الثانی ۱۳۹۹ھ مطابق مارچ ۱۹۷۹ء شمارہ ۳

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

سیاسی انقلابات اب روزمرہ کی چیز ہو گئے ہیں اس لیے ان میں کوئی ندرت نہیں رہی، لیکن ابھی حال میں ایران میں جو عظیم الشان انقلاب ہوا ہے یہ عصر حاضر کا سب سے بڑا اور اہم انقلاب ہے جس نے دنیا کے بڑے بڑے فہرمانوں کو حیرت واستعجاب کے ساتھ اضطراب وتشویش میں مبتلا کر دیا ہے، اس انقلاب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ایک سن رسیدہ ملائے بوریہ نشین نے جلاوطنی کے عالم میں اپنے ملک سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر اسلام کے نام پر ملوکیت وشہنشاہیت اور اس کے غیر اسلامی کردار کے خلاف ایک تحریک اس خاموشی سے شروع کی کہ نہ اخبارات میں کہیں اس کا چرچا تھا۔ اور نہ کہیں پبلک لائف میں اس کا شور وغوغا ایک دھیمی دھیمی آگ تھی جو سینہ بسینہ ہر ایرانی پیر وجوان مرد وعورت میں منتقل ہوتی اور سلگتی بڑھتی رہی، آخر وہ وقت بھی آگیا جبکہ دلوں کی یہ آگ برق خاطف بن کر گری اور کوکبۂ خسروی و دبدبۂ شہنشی کو دم کے دم میں بھسم کر گئی شاہ ایران اور ان کے اندرونی اور بیرونی اعوان وانصار نے کونسا حربہ تھا جو استعمال نہیں کیا شہنشاہیت کے حفظ وبقا کے لیے کونسی تدبیر تھی جو اختیار نہیں کی گئی لیکن جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ کے مصداق دنیا نے کیا دیکھا؟ شاہ مع اپنے خاندان کے ملک بدر اور وہی سن رسیدہ ملائے بوریہ نشین مملکت ایران کا سربراہ تھا۔

ایران کا انقلاب اس حقیقت کا اعلان ہے کہ ایشیا اور افریقہ میں جہاں امیری غریبی اور طبقاتیت وسرمایہ داری کے جراثیم موجود ہیں جو کمونزم کو فروغ دیتے ہیں جس کی بنیادوں پر عوامی

تحریکیں پیدا ہوتی اور نشو و نما پاتی ہیں۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے عوامی تحریک کی قیادت جس قوت و شدت کے ساتھ اسلام کر سکتا ہے، کمیونزم، وسوشلزم جیسی آئیڈیا لوجی ہرگز نہیں کر سکتی، ایران کی تحریک میں اگرچہ کمونسٹ بھی اپنی غرض کو مجاہدین اسلام کے ساتھ لگے رہے ہیں، لیکن عنان قیادت صرف علامہ خومینی کے ہاتھ میں رہی ہے، اس بنا پر جب انقلاب آیا تو اقتدار مذہب کی طرف منتقل ہوا، کسی مسلمان ملک میں ملٹری کے سہارے کمونزم برسر اقتدار آسکتا ہے جیسے پچھلے دنوں کابل میں اور اس سے پہلے یمن میں اور بعض عرب ملکوں میں ہوا لیکن کسی عوامی تحریک کے ذریعہ کسی ملک میں کوئی انقلاب اس وقت تک ہرگز برپا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی بنیاد خالص اسلام پر نہ ہو، مسلمان ملکوں میں ایک دو نہیں بیسیوں تحریکیں چل رہی ہیں۔ ان تحریکوں کے قائدین کو اس سے سبق لینا چاہئے، بہرحال ایران میں اسلامی جمہوریت تو قائم ہو گئی، لیکن اس جمہوریت کی شکل کیا ہو گی اور اس میں کہاں تک استحکام اور استقلال ہو گا؟ ان سوالات کا جواب ابھی تک پردۂ خفا میں ہے۔ کیونکہ ملک کے حالات ابھی تک اتھل پتھل ہیں کمونسٹ جماعت نے علامہ خومینی کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ شاہ کے حامیوں کا بہرحال ایک طبقہ موجود ہے، پھر دنیا کی بڑی طاقتیں بھی اس انقلاب سے خوش نہیں ہیں، وہ اس کو اپنے سیاسی مفادات کے خلاف سمجھتی ہیں، اس لیے صحیح صورتِ حال کا اندازہ انتخابات کے بعد ہی ہو گا، البتہ یہ ضروری ہے کہ اسلامی ملکوں پر اس انقلاب کا اثر ہو گا۔

افسوس ہے گذشتہ مہینہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں بھی راہی ملک بقا ہو گئے، مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کے برادر خورد تھے اور ان کی طرح بڑی خوبیوں اور کمالات کے بزرگ تھے، جامعہ ملیہ اسلامیہ سے گریجویٹ ہونے کے بعد فرانس گئے اور پیرس یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، ان کا اصل مضمون تاریخ اور سیاست تھا اور اسی کے وہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں پروفیسر تھے، لیکن ان کا انگریزی فرنچ اور فارسی و اردو کے ادب و شعر کا مطالعہ نہایت وسیع اور تنقیدی ذوق اعلیٰ اور پختہ تھا، چنانچہ ان کی کتابیں اردو غزل، روحِ اقبال، اور اقبال و حافظ اردو لٹریچر میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں،

فرانسیسی ادب اور غالب پر بھی ان کی کتابیں ہیں۔ دو کتابیں ہندوستان کے اسلامی عہد پر انگریزی میں ہیں۔ اب آخر میں غالب کے کلام کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے تھے، کرنل بشیر حسین زیدی علیگڑھ کے وائس چانسلر ہوئے تو انھوں نے مرحوم کو پرو وائس چانسلر کے عہدہ پر علی گڑھ بلالیا، لیکن ۱۹۶۵ء میں نواب علی یاور جنگ سے نہ بنی تو مستعفی ہو کر دہلی چلے آئے۔ اور نظام الدین اولیا میں ایک فلیٹ کرایہ پر لے کر رہنے لگے، چند سال شملہ انسٹی ٹیوٹ میں بھی فیلو رہے، عقائد کے معاملہ میں کٹر مسلمان تھے، طبعاً نہایت شریف، خوش اخلاق اور سنجیدہ و ملنسار بزرگ تھے، اللہ تعالیٰ مغفرت و بخشش کی نعمتوں سے نوازے۔

بیان ملکیت وتفصیلات متعلقہ برہان دہلی

فارم چہارم قاعدہ ۔ ۸

(۱) مقام اشاعت :۔ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ (۴) ناشر کا نام :۔ حکیم مولوی محمد ظفر احمد خاں

(۲) وقفۂ اشاعت :۔ ماہانہ (۵) اڈیٹر کا نام : مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم اے

(۳) طابع کا نام :۔ حکیم مولوی محمد ظفر احمد خاں قومیت :۔ ہندوستانی

قومیت :۔ ہندوستانی سکونت :۔ نزد بال برادری سول لائن علی گڑھ

سکونت ۱۳۶ ۱۴ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ (۶) ملکیت :۔ ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی ۶

میں محمد ظفر احمد خاں ذریعہ ہذا اقرار کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں (دستخط ناشر)

محمد ظفر احمد خاں

اسلامی نظامِ معیشت

(از: جناب محمد افتخار الدین صاحب)
بی کام - یل یل یم (عثمانیہ) حیدرآباد

اسلامی نظام معیشت میں مشترکہ سرمایہ دار کمپنیوں اور شراکتوں کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں شراکتی کاروبار عام طور پر بہت مقبول تھے یہاں تک کے زراعت میں بھی شراکت کا رواج تھا۔ رسول اکرمؐ نے شراکت ہی کے ذریعہ بے روزگار مہاجرین کو کاروبار سے لگائے[1] یا تھا۔ چنانچہ انصار رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپؐ ہمارے اور ہمارے بھائیوں (مہاجرین) کے درمیان باغ تقسیم فرما دیجیے۔ آپؐ نے فرمایا نہیں۔ انصار نے مہاجرین سے کہا تم محنت اپنے ذمہ لے لو اور ہم میوے میں شریک کرلیں گے۔ انھوں نے کہا۔ ہاں ہم نے اس کو مانا۔[1]

فقہی اصطلاح میں اگر شرکت زراعت کے متعلق ہو تو اسے مزارعۃ اور درختوں یا گلاب وغیرہ کی کیاریوں سے متعلق ہو تو اسے مساقات کہتے ہیں۔[2]

شرکت[3] کے کاروبار میں دو یا دو سے زیادہ اشخاص مل کر سرمایہ فراہم کرتے ہیں اور

---

[1] بخاری پ کتاب الشروط [2] ہر ایک فقہ اور حدیث کی کتاب میں قراض اور شرکت کے مثل مزارعۃ اور مساقاۃ سے متعلق بھی علیحدہ ابواب پائے جاتے ہیں۔

[3] اسلامی قانون کی اصطلاح میں شرکت کو شرکۃ العقود (PARTNERSHIP OF CONTRACT) کہتے ہیں یعنی ایسی شرکت جو معاہدے کے ذریعہ عمل میں آئی ہو۔

نفع ونقصان میں شریک ہوتے ہیں۔ دنیا کے اور حصوں کی طرح شغل اصل کا یہ طریقہ اسلام سے پہلے عرب کے قدیم معاشی نظام میں بھی جاری تھا اور اسلام کے معاشی نظام میں بھی اس کو برقرار رکھا گیا۔ کسی بڑی تجارتی یا صنعتی مہم کو انجام دینا ایک فرد سے ممکن نہیں اس لیے چند افراد مشترکہ سرمایہ اور محنت کے ساتھ اس مہم کو پورا کرنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ مثلاً دو برابر دولت والے کسی بڑے کاروبار کے لیے شریک ہو جاتے ہیں[۱] شرکت کے ذریعے کاروبار اسلام میں جائز ہے کیونکہ جس وقت آنحضرتؐ مبعوث ہوئے تو لوگوں میں شرکت کا معاملہ جاری تھا پس آپؐ نے لوگوں کو اس پر برقرار رکھا[۲] اور رسول اکرمؐ کے بعد سے لے کر آج تک لوگ شرکت کے ذریعے کاروبار کرتے آتے ہیں[۳]۔

تمام علمائے اسلام ایسی شرکت کے جواز کے قائل ہیں جس میں ہر ایک شریک دوسرے شریک ہی کی طرح اس قسم کا مال یعنی درہم و دینار کاروبار میں لگا دیتا ہے اور انھیں اسی طرح خلط ملط کر دیتا ہے کہ وہ مل کر ایک ہی مال بن جاتے ہیں اور تمیز باقی نہیں رہتی کہ کس کا مال فروخت ہوا اور کس کے مال سے تجارت کا سامان خریدا گیا۔ اگر نفع ہوتا ہے تو سب کو نفع میں حصہ رسدی ملتا ہے اور نقصان ہو تو سب کا حصہ ہوتا ہے[۴]۔

شرائط :- (ا) شرکت ایک معاہدہ ہے۔ اسی لیے اس کے لیے ایجاب و قبول لازمی ہے[۵] (ب) معاہدہ شرکت درہم۔ دینار۔ اور رائج الوقت سکّہ سے منعقد ہوتا ہے[۶] لیکن امام ابو حنیفہؒ اور قاضی ابو یوسفؒ کی یہ رائے ہے کہ صرف دینار (سونے کے سکّے) اور درہم (چاندی کے سکّے) سے ہی شرکت کا معاہدہ ہو سکتا ہے اور تانبے کا سکہ فلوس سے

---

[۱] PRINCIPLES OF ECONOMICS مصنف MARSHAL صفحہ ۳۰۱
[۲] ہدایہ ج ۲ کتاب الشرکتہ [۳] مبسوط السرخسی ج ۱۱ کتاب الشرکتہ [۴] بدایۃ المجتہد
[۵] ہدایہ ج ۲ کتاب الشرکتہ [۶] ہدایہ ج ۲ کتاب الشرکتہ۔

مارچ ۱۹۸۲ء [illegible]

نہیں ہوتا کیونکہ ان کی قیمت ہر وقت بدلتی رہتی ہے اور ان کی نوعیت مثل دوسرے سامان کی ہو جاتی ہے[1]۔

اگر مال اشیاء کی شراکت کی شکل میں ہو تو شراکت کا کاروبار شروع کرنے سے پہلے اس کی قیمت کا تعین زر کی صورت میں ہونا ضروری ہے یا ایک شریک اپنا نصف مال دوسرے کے نصف مال سے تبادلہ کرلے اور اس طرح سامان ہی کو سرمایہ قرار دیا جائے تو اس میں عذر باقی نہیں رہتا اور نہ مالیت کے متعلق جھگڑا ہو سکتا ہے۔

(ج) امام شافعیؒ نے شراکت کے لیے ایک اور شرط بڑھاتی ہے۔ چنانچہ امام شافعیؒ کہتے ہیں جب تک مال خلط ملط نہ ہو جائے اور شریک کے مال اور دوسرے شریک کے مال میں امتیاز نہ رہے شرکت صحیح نہیں ہوتی[2]۔ چنانچہ انھوں نے شرکت کے لیے سرمایہ کو ضروری قرار دیا ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ شرکت کے کاروبار کے لیے سرمایہ ضروری نہیں ہے اور شراکت کے کاروبار بغیر سرمایہ کے صرف ساکھ اور وجاہت (اعتبار) سے ہوتے ہیں۔

شمس الائمہ سرخسی شراکت کے معاہدے کے لیے دستاویز کا لکھا جانا ضروری قرار دیتے ہیں شرکت ایسا معاہدہ ہے جو ایک مدت تک جاری رہتا ہے لہٰذا اسکے لیے دستاویز کا لکھا جانا ضروری ہے تاکہ اگر کبھی جھگڑا پیدا ہو جائے تو اس دستاویز کے ذریعہ سے فیصلہ کیا جا سکے۔ خدائے تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ۚ	مسلمانو! جب تم ایک مدت کے لیے قرض لو تو اس کو لکھ لیا کرو۔

(پ ۳ سورۂ بقرہ ع ۳۹)

نیز دستاویز کا مقصد توثیق اور احتیاط ہے پس اس کے لیے لازمی ہے کہ دستاویز

---

[1] ہدایہ ج ۲ کتاب الشرکتہ [2] بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۲۱۱ کتاب الشرکتہ

لکھی جائے تاکہ ہر ایک کے لعن طعن سے بچے رہیں۔ انھوں نے اس خاص معاملے میں دستاویز کا فارم بھی بتا دیا کہ فارم اس طرح لکھا جائے۔

هٰذَا مَا اشْتَرَاكَ عَلَيْهِ فُلَانٌ وَفُلَانٌ — یہ وہ (دستاویز ہے) ہے جس میں فلاں فلاں نے اشتراک کیا ہے۔

بعض اصحاب الشروط نے اس پر اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ :-

هٰذَا اِشَارَةٌ اِلَى الصَّكِّ — اس سے تو چک کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

پس احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کو یوں لکھا جائے کہ :-

هٰذَا كِتَابٌ فِيْهِ ذِكْرُ مَا اشْتَرَكَ فُلَانٌ وَفُلَانٌ — یہ وہ دستاویز ہے جس میں فلاں فلاں شخص نے جو اشتراک کیا ہے اس کا تذکرہ ہے۔

اور یوں جب کبھی رسول اکرمؐ نے کوئی غلام خریدا تو آپؐ نے اس کے لکھنے کا حکم دیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ یوں لکھا گیا کہ " یہ وہ دستاویز ہے جس میں محمد اللہ کے رسول نے علاد بن خالد بن ہوزہ یہودی سے جو غلام خریدا اس کا تذکرہ ہے اسی طرح رسول اکرمؐ نے حدیبیہ کے دن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو صلح نامہ لکھنے کا حکم دیا کہ :-

هٰذَا مَا اصْطَلَحَ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ وَسُهَيْلُ بْنُ عَمْرٍو عَلٰى اَهْلِ مَكَّةَ — یہ وہ صلح نامہ ہے جو محمدؐ بن عبد اللہ اور سہیل بن عمر کے درمیان مکّہ والوں کے لیے ہوا۔

اور یہ شرکت کا معاہدہ تو امانت کا معاہدہ ہے اور اس کا مقصد نفع کمانا ہوتا ہے۔

پھر اس دستاویز میں ہر ایک کے سرمایہ کی مقدار کا معلوم ہونا ضروری ہے تاکہ اس سے نفع کی مقدار معلوم ہو سکے اس لیے اس کا شرکت کی دستاویز میں لکھا جانا ضروری ہے کہ جھگڑے کے وقت اس کی طرف رجوع کیا جا سکے اس دستاویز میں یہ بھی لکھے کہ :-

وَذٰلِكَ كُلُّهُ فِيْ اَيْدِيْهِمَا — اور یہ (سرمایہ) ان کے ہاتھ میں (نقد) موجود ہے۔

اور اس طرح لکھنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ سرمایہ غائب نہیں ہے اور نہ قرض

ہے بلکہ وہ زر ہے جو ان کے ہاتھ میں موجود ہے پھر اس شرکت کی دستاویز میں ہر ایک کو ان کی مقدار سرمایہ کے موافق جو نفع ملے گا اس کا تذکرہ کیا جائے نیز یہ بھی لکھا جائے کہ انھوں نے فلاں مہینے اور فلاں سال میں اشتراک کیا اور تاریخ کا تعین ہو جانے سے جھگڑے ہونے نہیں پاتے۔ اور ان میں سے کوئی ایک اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس تاریخ سے پہلے اس نے مال خریدا اور اس میں اس کا حق ہے[1]۔

شرکت کے اقسام :- بلحاظ نوعیت اور سرمایہ فقہا اسلام نے شرکت کی چار قسمیں قرار دی ہیں :-

(۱) شرکت المفاوضہ (۲) شرکت العنان

(۳) شرکت الصنائع (۴) شرکت الوجوہ

ان سب کی وضاحت سے پہلے یہ معلوم کرنا بے محل نہ ہوگا کہ اجتماعی کاروبار یا چند آدمیوں کے مل کر کاروبار کرنے کی حالت میں ظاہر ہے کہ یہی چند احتمالات ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے پاس کچھ سرمایہ ہے یا کسی کے پاس کچھ نہیں ہے یا بعضوں کے پاس ہے بعضوں کے پاس نہیں، پہلی صورت یعنی اگر ہر ایک شریک کاروبار میں سرمایہ اگر لگا سکتا ہے تو یہی دیکھنا چاہیئے کہ سب افراد برابر لگا سکتے ہیں یا کسی شخص میں کم یا کسی شخص میں زیادہ سرمایہ لگانے کی صلاحیت ہے۔ عقلاً یہی صورتیں ممکن ہیں اور اسلامی معاشیات نے اجتماعی کاروبار میں، اس سے استفادہ کی راہیں کھول دی ہیں۔ اگر شرکاء برابر سرمایہ لگا کر کاروبار کریں تو اس کا نام شرکت مفاوضہ ہے۔ اگر کاروبار میں کسی شریک کا کم اور کسی شریک کا زیادہ سرمایہ ہو تو وہ شرکت عنان ہے اس صورت میں نہ سب کے سرمایہ کا برابر ہونا ضروری ہے نہ نفع کا۔

اسی طرح اگر کسی شریک کے پاس سرمایہ نہیں ہے تو پھر یہ دیکھا جائے گا کہ کسی قسم کے ہنر و دستکاری یا صنعت وغیرہ سے واقف ہے یا نہیں اگر ہنرمندوں اور دستکاروں کا گروہ ہے جو مل کر کاروبار کو اس طرح چلانا چاہتے ہیں کہ لوگوں سے اپنے متعلقہ پیشے کے

---

[1] مبسوط السرخسی ج ۱۲ صفحہ ۱۵۶ کتاب الشرکۃ۔

کے سلسلہ میں کام لیا کریں اور جو نفع ہو وہ باہم تقسیم کرلیں۔ مثلاً دھوبیوں کا اگر کوئی گروہ چاہے تو واشنگ کمپنی بنا کر دھونے کے لیے لوگوں سے کپڑے لے سکتا ہے اور کمپنی کا جو نفع ہوگا وہ باہم تقسیم ہوتا رہے گا اسی کا اصطلاحی نام شرکت تقبل و شرکت صنائع ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تو اس میں اتنی وسعت ہے کہ دو مختلف پیشے یا ہنر والے جیسے درزی اور رنگریز چاہیں تو مل کر شرکت کا معاملہ کرسکتے ہیں یعنی جسے جو کام آتا ہے وہ انجام دے گا اور کمپنی کو جو نفع ہوگا بانٹا جائے گا۔ اگر شرکت قایم کرنے والوں کے پاس نہ سرمایہ ہی ہو اور نہ وہ کسی قسم کے ہنر سے واقف ہوں تو اپنی ساکھ یعنی وجاہت اور امانت کا اعتماد دلاکر لوگوں سے چیزیں لے کر اجتماعی طور پر کاروبار کرسکتے ہیں اور کاروبار کے اس طریقے سے جو نفع ہو بانٹ سکتے ہیں اور اسی کا نام شرکت الوجوہ ہے۔

شرکت شراکت کے بیان میں یہ بات باعث دلچسپی ہوگی کہ امام مالکؒ اور ان کے شاگرد نے مُدوّنہ نامی فقہ کی مستند کتاب میں شراکتی کاروبار کی بہت سی مثالیں بیان کی ہیں ان میں سے چند اہم شراکتوں کا تذکرہ یہاں بے جا نہ ہوگا۔

طبی شراکت دو یا دو سے زائد ڈاکٹر مل کر مشترکہ طور پر علاج معالجے کے لیے دواخانہ (ہسپتال) قایم کرسکتے ہیں نیز مشترکہ سرمایہ سے ادویات خرید کر ہسپتال چلاسکتے ہیں اور اخراجات کی مہنائی کے بعد جو خالص آمدنی ہو اس کو آپس میں حسب تصفیہ تقسیم کرسکتے ہیں۔[1]

تعلیمی شراکت طبی شراکت کی طرح دو یا دو سے زیادہ اساتذہ مل کر بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے مشترکہ تعلیمی ادارے کھول کر آمدنی کما سکتے ہیں۔[2]

زرعی شراکت یا مشترکہ کاشت اوپر مزارعت کا تذکرہ ہوچکا ہے۔ مزارعت میں ایک شخص زمین مہیا کرتا ہے اور دوسرا محنت کرتا ہے اور کھیت کی پیداوار میں دونوں شریک رہتے ہیں۔ لیکن آج کل روسی طریقے کی اجتماعی کاشت اور ڈنمارک وغیرہ میں مروجہ اتحادی کاشت کا بہت

---

[1] و [2] المدونۃ الکبریٰ لامام مالک بن انسؒ ج ۴ صفحہ ۳۶ شرکۃ الاطباء والمعلمین مطبع خیریہ مصر۔

چرچا ہے۔ امداد باہمی کے اصول پر زرعی شراکت قائم کی جا کر سائنٹفک طریقے پر زراعت کو ترقی دی جا سکتی ہے۔ قبل ازیں بتایا جا چکا کہ عہدِ رسالتؐ اور عہدِ خلافتِ راشدہ میں شراکتی کاروبار کافی مقبول تھے حتیٰ کہ زراعت میں بھی ان کا رواج تھا۔ امام مالکؒ بیان کرتے ہیں کہ مشترکہ سرمایہ سے مویشی، آلاتِ زراعت اور بیج وغیرہ خرید کر مشترکہ عمل سے زراعت کریں تو جائز ہے[۱]

شراکت حمل و نقل (TRANSPORT COMPANY) دو یا دو سے زیادہ اشخاص مل کر حمل و نقل اور باربرداری کے کام کے لیے تجارتی اصول پر حمل و نقل کی شراکت (ٹرانسپورٹ کمپنی) قائم کر سکتے ہیں[۲] کتاب مدونہ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ مشترکہ سرمایہ سے بری، بحری اور ہوائی کمپنیاں بنا کر حمل و نقل کے لیے شراکت قائم کر سکتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ تمام شرکاء کا ایک ہی شہر کے باشندے ہونا لازمی نہیں ہے کتاب مدونہ میں بتایا گیا ہے کہ مختلف شہروں کے باشندے مل کر کثیر سرمایہ سے شرکتی کاروبار کر سکتے ہیں[۳]

انفساخ شرکت ذیل کی صورتوں میں ہر قسم کی شراکت کے کاروبار منسوخ قرار پائیں گے۔

(۱) جب کہ کوئی شریک معاہدے کو فسخ کرنے کا اختیار کام میں لاتا ہے واضح ہو کہ ہر ایک شریک کو معاہدۂ شرکت فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہے لیکن جب ایک شریک معاہدہ فسخ کرے تو اس وقت تک انفساخ جاری نہ ہوگا جب تک کہ دوسرے شریک کو اس کی اطلاع نہ ہو جائے[۴]

(۲) جبکہ کوئی شریک مر جائے چونکہ شرکت کے معاہدے میں ہر شریک دوسرے کی جانب سے نمائندگی (وکالت) کرتا ہے اس لیے موت نمائندگی کو باطل کر دیتی ہے۔

فاذا بطلت الوکالۃ بطلت الشرکۃ[۵] جب نمائندگی (وکالت) کالعدم ہو جائے تو شرکت بھی کالعدم قرار پاتی ہے۔

البتہ اگر ورثاء چاہیں تو شریک کے معاہدے کی از سرِ نو تجدید کر سکتے ہیں۔

---

[۱] المدونۃ الکبریٰ ج ۴ صفحہ ۲۹ الشرکۃ فی الزرع۔ [۲] المدونۃ الکبریٰ ج ۴ صفحہ ۲۷ الشرکۃ الحمالین
[۳] المدونۃ الکبریٰ ج ۴ صفحہ ۳۰ فی الشریکین فی البلدین۔ [۴][۵] ہدایہ ج ۲ کتاب الشرکۃ۔

مشترکہ سرمایہ دار کمپنی شغل اصل کا ایک اور طریقہ مشترکہ سرمایہ دار کمپنیوں کے حصوں کی خریداری ہے نئے زمانہ کے اکثر حوصلہ مندانہ کاروبار اتنی زیادہ مقدار میں اصل چاہتے ہیں کہ کوئی ایک شخص اس کی بہم رسائی تنہا نہیں کرسکتا نیز ہر حوصلہ طلب کاروبار میں کچھ نہ کچھ خطرہ مول لینا پڑتا ہے. خاص کر اس کی ابتدائی مرحلوں میں نیز کارخانے کے مکمل ہو کر چلنے کے لیے کم از کم سال ڈیڑھ لگتا ہے اور بعض بڑے کاربار کی تیاری کے لیے کئی سال کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ اس لیے کوئی ایک فرد یا چند اشخاص اس طرح کا بڑا کاروبار انجام نہیں دے سکتے اور نہ اس طرح سرمایہ لگانا پسند کرتے ہیں اسی بنا پر مشترکہ سرمایہ کے کاروبار کا طریقہ اختیار کیا گیا۔

یہ کہنا درست نہیں ہے کہ مشترکہ سرمایہ دار کمپنیاں عہد جدید کی پیداوار ہیں بلکہ قدیم سے اس کا رواج رہا ہے۔ جاہلی عرب میں بھی یہی طریقہ رائج تھا چنانچہ عرب کے قدیم معاشی نظام کا مطالعہ کریں تو پتہ چلے گا کہ قریش کے تجارتی کارواں مشترکہ سرمایہ سے چلتے تھے۔ خاص کر بدر کے کارواں میں مختلف اشخاص کا سرمایہ لگا ہوا تھا[1] البتہ عصر حاضر میں ان سے بیش از بیش فائدہ اٹھایا گیا اور متعلق قوانین میں وسعت اور لچک پیدا کی گئی۔

الغرض مشترکہ سرمایہ دار کمپنیوں میں سرمایہ دار اپنے سرمایہ کی وجہ سے اور منتظم کاروبار اپنی تنظیمی محنت کی بنا پر نفع پانے کا مستحق ہوتا ہے اور مزدور اپنی محنت کی وجہ سے اجرت کا مستحق ہوتا ہے مشترکہ سرمایہ دار کمپنی ایک حیثیت سے شرکت العنان سے مشابہ ہے۔

ڈبنچرس (DEBENTURES) مغربی دنیا میں شغل اصل کا ایک اور طریقہ رائج ہے جو ڈبنچرس کی خریدی ہے۔ ایک کمپنی ڈبنچرس اجرا کر کے مقررہ شرح سود پر عام لوگوں سے قرض حاصل کرتی ہے اور عام طور پر کمپنی کے اثاثے کی کفالت پر اس کا تحفظ کیا جاتا ہے۔ حاملین ڈبنچرس کو یہ اختیار ہے کہ اگر ان کا سود کمپنی ادا نہ کرے تو اثاثے کو ضبط کر لیں۔ حاملین ڈبنچرس کی حیثیت منتظمین۔ کاروبار کی نہیں ہوتی بلکہ ان کی حیثیت قرض خواہوں کی ہوتی ہے کیونکہ وہ صرف سود کے مستحق قرار

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (ENCYCLOPEDIA OF ISLAM) عنوان "مکہ"

پاتے ہیں چاہے نفع ہو کہ نہ ہو۔[1] چونکہ اسلام نے سود کو ممنوع قرار دیا ہے اس لیے ڈبنچرس بالکل اسلامی اسپرٹ کے خلاف ہیں اس لیے وہ ناجائز ہیں۔ اس زمانے میں لوگ بنک سے قرض لے کر صنعتی او تجارتی کاروبار کرتے ہیں اور بنک کو مقررہ سود ادا کرتے ہیں جو خلاف اصول اسلام ہے۔ خلافت راشدہ کے درخشاں عہد میں بنک کا بہتر بدل خود سرکاری خزانہ یا بیت المال تھا۔ مسلمان بیت المال سے قرض لیکر بڑے پیمانے پر تجارتی کاروبار کرتے تھے۔ اور منافع کا کچھ حصہ بیت المال میں داخل کرتے تھے۔

مختصر یہ کہ اسلامی معاشیات نے ہر قسم کے نفع آور کاروبار کو جائز قرار دیا ہے بلکہ اس کا سارا رجحان کاروبار کرنے پر زور دینا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ہر قسم کے سودی کاروبار کو ناجائز قرار دیا ہے۔ بہر حال اجتماعی طور پر کاروبار اور سرمایہ و محنت سے مل جل کر بڑے سے بڑے پیمانہ پر نفع اٹھانے کی جتنی صورتیں ہو سکتی ہیں ان میں سے کسی صورت کو بھی اسلامی معاشیات نے نظر انداز نہیں کیا ہے اور یہ تو گزر ہی چکا ہے کہ مساقاۃ یا مزارعۃ شرکت ہو یا حکومتی کاروبار سب میں اجتماعی کاروبار کے دروازے اسلام کے نظام معیشت میں کھلے ہوئے ہیں۔

گذارش

(۱) ادارہ کی فیس ممبری یا برہان کا سالانہ چندہ ارسال فرماتے وقت منی آرڈر کوپن پر مکمل پتہ اور خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیے جو رسالہ کے پتہ کی چیٹ پر طبع ہوتا ہے۔

(۲) جن حضرات کی خدمت میں برہان پہنچتا ہے وہ جب بھی خط تحریر فرمائیں تو اپنے شہر کا پن کوڈ پتہ میں ضرور تحریر فرما دیا کریں۔

نیاز مند

(منیجر)

---

[1] بنہام - اکنامکس (ECONOMICS BY BENHEM) باب ۴ صفحہ ۱۶۴

قصیدہ بُردہ

از جناب ڈاکٹر ابو النصر محمد خالدی صاحب

رسول اللہ صلعم کی بعثت سے قبل جزیرۂ عرب میں جتنے شاعر گزرے ہیں ان میں بحیثیت مجموعی پہلے درجہ میں شمار ہونے والے شعراء امراء القیس، زہیر، نابغہ، ذبیانی، اور اعشی بعیر ہیں۔ فنی خوبیوں کے اعتبار سے عربوں نے اپنے شاعروں کے چار درجے مقرر کئے ہیں۔ سب سے پہلے درجہ والے کو فحل خندید کہتے ہیں (۱) فحول اور بھی ہوئے ہیں مگر امراء القیس، اعشی، زہیر و نابغہ کے مرتبہ تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ یہ فیصلہ تو نہیں ہو سکا کہ ان چاروں میں کون سب سے بڑا ہے۔ اپنے اپنے رنگ میں یہ سب ایک دوسرے کے برابر ہیں یہ اور بات ہے کہ اپنے جغرافیائی و تہذیبی ماحول کے زیر اثر یمنیوں اور بحریوں کو امراء القیس۔ اہل کوفہ کو اعشی اور حجازیوں کو زہیر و نابغہ زیادہ پسند تھے۔

قریش تو پورے عرب کے سردار مانے جاتے تھے۔ یہ سبھوں کو اپنا اپنا حصہ برابر دیتے رہے۔ ایک مرتبہ امیر المومنین عمرؓ (م ۶۴۴ء) سے امراء القیس کے بارے میں پوچھا گیا تو کہا، "اس کو تو اولیت حاصل ہے" گویا شعر کا چشمہ اسی سے رواں ہوا۔ معنی کی گہرائی تک رسائی کا راستہ بھی اسی نے دکھایا۔ بعد کے بہت سے شاعروں نے اس کی پیروی کی۔ (۲) ایک اور موقع پر آپ نے نابغہ کا شعر

ولست بمستبقٍ اخاً لا تلمّہ ۔۔۔ علی شعث ای الرجال المھذّب

سنا تو فرمایا:- یہ سب شاعروں سے بڑا شاعر ہے۔ (۳) لیکن عمرؓ کو زہیر سب سے زیادہ پسند تھا۔ ایک دفعہ تو ایسا بھی ہوا کہ آپ نے رات بھر زہیر کے شعر سنتے سنتے فجر کر دی (۴)

یہ زہیر ہی ہے جو نزول وحی سے پہلے ہی حیات بعد موت اور اللہ کے یہاں عقائد و اعمال کی

جواب دہی کا قائل ہو چکا تھا۔ شاید اہل کتاب کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کا نتیجہ تھا کہ نبی کی آمد کا منتظر تھا۔ زہیر کے حالات میں لکھا ہے: اس نے خواب میں آسمان سے ایک رسّی لٹکتی دیکھی۔ اس نے رسّی کا سرا پکڑنا چاہا مگر وہ اس کی دست رس سے باہر رہی۔ زہیر نے اس خواب کی تاویل کی کہ وہ اپنی زندگی میں نبی کی ہدایت سے فیضیاب نہیں ہو سکے گا۔ چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی۔ بعثت سے ایک سال ڈیڑھ سال قبل فوت ہو گیا۔ مرنے سے پہلے اپنے دو بیٹوں۔ بجیر و کعب کو وصیت کر گیا کہ دیکھو! اگر کوئی حق کا پیغام لائے تو اس کو قبول کر لو۔ (۵)

یہ واقعہ نجد کا ہے جہاں بنو غطفان اور اس کی شاخ مُزنیہ کی چراگاہیں اور ان کے کنوئیں تھے۔ حجاز میں زہیر کی وفات کے سال ڈیڑھ سال بعد ارسل اللہ رسولہ بالھدیٰ۔ ہادی حق جب تک مکہ میں رہے قریش کی مخالفت کی وجہ سے دعوت کے اثر کا دائرہ شہر اور اس کے قرب و جوار تک محدود رہا۔ ہجرت کے بعد بدر کے میدان میں قریش کو شکست ہوئی۔ قریش کی شکست نظر بظاہر ایک اَن ہونی بات تھی۔ صحرائی عرب "یوم الفرقان" کو صرف ایک وقتی حادثہ سمجھتے رہے۔ یوم بدر کے بعد احد و خندق کے علاوہ دوسری چھوٹی چھوٹی جنگوں میں قریش اور ان کے حلیفوں کو مسلسل پسپائیاں بلکہ شکستیں اور ہزیمتیں ہونے لگیں تو اسلامی دعوت کا دائرہ سال بسال وسیع تر ہونے لگا۔ تاآں کہ سنہ سات ہجری کے آخر میں حُدَیْبیہ کی عارضی صلح (ھدنہ) ہوئی۔ قریش اپنی صدیوں پرانی نسلی سیادت سے عملاً دست بردار ہو گئے۔ جب وہ نئی ملّی سیادت سے مفاہمت پر مجبور ہو گئے تو پھر اُمّ القریٰ سے نسبتاً قریب رہنے والے بادیہ نشینوں میں شاید ہی کوئی ایسا عرب سردار ہو گا جو داعی اسلام کو قریب سے دیکھنے کا خواہشمند نہ ہو۔ ان حالات میں ناممکن تھا کہ بنو مُزنیہ کے چشم و چراغ زہیر کے فرزندوں بُجَیر و کعب کو اپنے شفیق باپ کی نصیحت و وصیت یاد نہ آئی ہو۔

اصحاب رسول کے تذکروں کا متفقہ بیان ہے کہ زہیر کے بیٹوں میں کعب ہی نے اپنے بھائی بُجَیر سے یہ خواہش کی کہ وہ مدینہ جائے داعی اسلام سے ملے اور خود اُن کی زبان سے اُن کی دعوت کے بارے میں آگاہی حاصل کرے کعب نے یہ بھی کہا کہ وہ بجیر کے غیاب میں اپنے قبیلہ اور اس کی بھیڑ بکریاں لئے اپنی قیام گاہ اُبْرَقُ العُزاف واقع نجد میں اِن کی واپسی کے منتظر رہیں گے۔

اپنے بھائی کے فرستادہ کی حیثیت سے بُجیر کے مدینہ آنے کی ٹھیک تاریخ کا پتہ نہیں لگتا۔ قرائن سے

ایسا متبادر ہوتا ہے کہ بجیر کی آمد کے وقت رسول اللہ صلعم غزوۂ خیبر کی تیاری کر رہے تھے یا غزوہ میں مصروف تھے یہ سنہ سات ہجری کا واقعہ ہے۔ یہ البتہ ثابت ہے کہ بجیر مکہ کی فتح سے قبل مدینہ آچکے تھے۔

بہرطور بجیر مدینہ آئے رسول اللہ صلعم سے ملے۔ اسلام قبول کیا اور فتح مکہ میں ایک مومن و مجاہد کی حیثیت سے شریک رہے۔ مدینہ میں بجیر کا اتنا زیادہ دل لگا اور اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے اتنا سازگار ماحول ملا کہ بینے گزر کر برسوں کی نوبت آنے لگی مگر اپنے بھائی کا خیال آیا اور نہ مدینہ آنے کا ابتدائی مقصد یاد رہا۔ نندہ شدہ کعب کو اطلاع ملی کہ بجیر نے اسلام قبول کرلیا اور مدینہ ہی میں اقامت پذیر ہوگیا ہے۔ اس اطلاع پر کعب کا سخت بر افروختہ ہونا بالکل بجا تھا شاعری تو بوٹی ہڈی میں بسی رسی تھی۔ اپنی برہمی کے اظہار میں کئی شعر کہہ ڈالے۔ کعب نے یہ اشعار اپنے بھائی کی ہجو میں کہے تھے ان میں داعی اسلام کا ذکر ضمناً تھا۔ یہ جس سیاق میں آیا تھا اس سے رسالت کی شان میں گستاخی ظاہر ہوتی ہے۔ بجیر کو اس کا احساس تھا۔ انھوں نے یہ شعر سنے تو مناسب بلکہ ضروری خیال کیا کہ لوگوں میں مشہور ہونے سے پہلے خود ہی آپ صلعم کو سنادیں اور دیکھیں آپ کیا فرماتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ تک وہ کسی دوسرے ذریعہ سے پہنچیں اور ان پر اپنے بھائی کی بے جا خطاپوشی کا الزام عائد ہو۔ چناں چہ مناسب موقع پر بجیر نے رسول اللہ صلعم کو اپنے بھائی کے یہ پانچ ابیات سنائے۔

من مبلغ عنّی بجیرًا رسالۃ	فھل لک فیما قلت بالخیف ھل لکا
شربت مع المامون کاسًا رویۃً	فانھلک المامون منھا وعلّکا
وخالفت اسباب الھدیٰ واتّبعتہٗ	علیٰ ایّ شیئٍ ویب غیرک دلّکا
علیٰ خُلقٍ لم تلف امًّا ولا ابًا	علیہ ولم تدرک علیہ اخالکا
فان انت لم تفعل فلست بآسفٍ	ولا قائلٍ امّا عثرت لعًا لکا

ان ابیات کا اردو میں خلاصہ مطلب غالباً کچھ اس طرح ہوگا۔ کاش کوئی شخص بجیر کو میرا یہ پیغام پہنچادے تم نے مکہ میں منیٰ کی وادی خیف میں جو کچھ کیا (اسلام لے آئے) کیا اس میں کوئی بھلائی ہے؟ تم المامون کے ساتھ ایسے پیالے پی کر سیراب ہوئے ہو جو انہوں نے تم کو پلائے اور بار بار پلائے۔ تم نے ہدایت کے اسباب کی مخالفت کی اور المامون کی پیروی کی دوسروں کی طرح تم بھی ہلاک ہوئے۔ بتاؤ تو سہی انھوں نے جو رہبری کی کیا وہ درست

ہے! تم نے تو وہ روش اختیار کی جو تمہاری والدہ کی تھی اور نہ تمہارے والد کی۔ تمہارے بھائی نے بھی وہ راہ نہیں چلی اگر تم اپنی حرکت سے باز نہ آئے تو مجھے کچھ افسوس نہ ہوگا۔ تمہیں اگر ٹھوکر لگی تو یہ تک نہ کہوں گا کہ اللہ تمہیں سلامت رکھے (حال آنکہ عربی ادب کا یہ ایک معمولی اظہار ہے مگر میں یہ بھی نہیں کروں گا)

رسول اللہ صلعم نے یہ بیتیں سنیں پھر فرمایا اب کعب کا خون معاف ہے یعنی اگر کوئی شخص اس کو قتل کر دے تو قاتل سے بدلہ نہیں لیا جائے گا۔ یہ سنتے ہی بجیر کے ہوش ٹھکانے نہیں رہے۔ ایک عرب وہ بھی خالص بادیہ نشین! اس کو اپنے ماجائی بھائی کا اس طرح خون ہونا کس طرح گوارا ہو سکتا تھا۔ عجب نہیں کہ بجیر نے یہ سوچتے سوچتے رات بھور کر دی ہو کہ: میرے بھائی کعب ہی نے تو مجھے رسول اللہ صلعم کی خبر لانے کے لئے بھیجا تھا کاش کعب کی برزگی سے پہلے ہی میں کلام اللہ و رسول اللہ کے اوصاف سے اُسے باخبر کر دیتا۔ مجھ سے کوتاہی نہ ہوئی ہوتی تو اس کا خون بھی ناجیز نہ ہوتا۔ غرض کسی نہ کسی طرح صبح ہوئی۔ برجستہ نکلے ہوئے چار شعر اپنے کسی دوست کے ذریعہ کعب تک پہونچائے۔

مَن مُبلغٌ کعباً فھل لکَ فی التی ۔۔۔ تلوم علیھا باطلاً وھی أحزم

الی اللّٰہ، لا العزّی و اللات وحدہ ۔۔۔ فتنجو اذا کان النجاءُ وَتَسلَمُ

لدی یوم لا ینجو ولیسَ بمُفلِتٍ ۔۔۔ مِنَ النّاسِ الّا طاھرُ القلبِ مُسلِم

فدینُ زُھیر ھُوَ لا شئٌ دینہ ۔۔۔ ودین ابی سلمی علی محرّمُ

کعب کو معلوم ہونا چاہیئے: مجھ پر تمہاری ملامت بالکل بے جا ہے۔ تم جس بات پر ملامت کر رہے ہو فی الواقع وہی حق ہے۔ تمہیں چاہیئے کہ اللہ کی طرف رجوع ہوں، جس کا کوئی شریک نہیں، نہ کہ ان پتھروں کی طرف جنہیں نادان لات و عزّی کے نام سے پکارتے ہیں۔ اگر تم دنیا و آخرت کی بھلائی چاہتے ہو تو اسلام قبول کرو۔ روز رستگاری سوائے پاک باطن مسلم کے کسی اور کا چھٹکارا نہیں ہوگا۔ ہمارے والد کے دین (توحید بے رسالت) کی کوئی حیثیت نہیں۔ رہا ہمارے دادا ابو سُلمی کا دین جاہلی سو اس پر قائم رہنے کا تو کوئی جواز باقی ہی نہیں رہا ــــ میں اس دین جاہلی سے بے زار ہوں۔

ان ابیات کے ساتھ ساتھ برائے تاکید و تخویف بُجیر نے کعب کو یہ بھی کہلا بھیجا: بھائی جان! اچھی طرح

کان کھول کر سن لیجئے۔ اب مکہ فتح ہو چکا۔ قریش نے ہتھیار ڈال دیئے۔ رسول اللہ نے ان بدزبانوں کو جو آپ کو دُکھ دیتے اور دینِ حق سے بیر رکھتے تھے قتل کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ جیسے مثلاً عبداللہ بن خنظل وغیرہ ازآں جملہ عبداللہ ابن زبعریٰ سہمی اور ہبیرہ بن ابی وہب مخزومی جان بچا کر بھاگ گئے ہیں۔ اب تمہاری بھی خیر نہیں۔ تمہارا خون ہدر ہو گیا ہے۔ جان کی امان چاہتے ہو تو فوراً رسول اللہ صلعم کے یہاں چلے آؤ۔ اپنے کہے گئے سے توبہ کرو۔ آپ رؤف و رحیم ہیں توبہ کرنے والے کو سزا نہیں دیتے۔ تائب کی توبہ قبول کرتے بلکہ انعام دیتے ہیں۔ خبردار۔ اگر ایسا نہ کروگے تو پھر کہیں امان نہ پا سکوگے۔ چاہو تو کہیں بھاگ کر دیکھو۔

کعب کو اپنے بھائی کا یہ دھمکی نامہ ملا تو اوسان خطا ہو گئے چوڑا چکلا صحرا تنگ و تاریک دکھائی دینے لگا۔ کعب کا خون ہدر ہونے کی خبر عام ہوئی تو بنو مزینہ کے پُرانے دشمنوں کو موقع ملا کہ وہ ان کے خلاف جھوٹی خبریں پھیلائیں۔ ان لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ کعب عن قریب کسی نہ کسی طرح مارا جائے گا۔

بنو مُزینہ کے بنو جہینہ سے برادرانہ تعلقات بہت پُرانے تھے قبائلی قانون کے مطابق کعب نے جہینہ کی پناہ ڈھونڈی۔ مگر ان لوگوں نے صاف انکار کر دیا۔ یہ قبیلہ اسلام قبول کر چکا تھا۔ جدید قانون میں رسول اللہ صلعم کے صاف وصریح حکم کا استثنیٰ ممکن نہیں تھا۔ بنو جہینہ کی پناہ نہ ملنے سے کعب پر زمین تنگ ہو گئی کیوں کہ اب کعب کی حیثیت طرید کی ہو گئی تھی۔ عرب قبائلی قانون میں طرید (نکال باہر کیا ہوا) کا کوئی پرسان حال نہیں ہو سکتا تھا۔ غرض کچھ تو جان کا خوف اور کچھ اپنے سگے بھائی کی قولی وعملی ترغیب غرض سبب خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو کعب غائبانہ ہی رسول اللہ پر ایمان لے آئے۔ آپ کی مدح میں قریباً ساٹھ ابیات کا ایک قصیدہ کہا۔ اپنی قیام گاہ سے نکلے اور مدینہ کی راہ لی۔ رات میں لبادہ اوڑھے مدینہ پہنچے۔ یہاں اپنے ایک جہنی دوست سے درخواست کی۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ رسول اللہ کے دوستوں اور ساتھیوں میں سب سے زیادہ نرم دل کون ہے۔ غالباً اسی جہنی نے یا کسی اور نے ابوبکر بن ابی قحافہ کی نشاندہی کی۔ کعب دارِ ابی بکر پہنچے۔ صبح منہ اندھیرے ابوبکر کے پیچھے پیچھے مسجد نبوی میں حاضر ہوئے۔ فجر کی صلوٰۃ ختم ہوتے ہی اپنا تعارف کرائے بغیر آگے بڑھ کر رسول اللہ صلعم سے کہا ایک شخص بیعت کرنے حاضر ہوا ہے۔ رسول اللہ صلعم نے اپنا

ہاتھ آگے بڑھایا۔ کعب نے آپ کا ہاتھ تھامے ہوئے کہا: اگر کعب اپنے قول و فعل پر پشیمان و مطیع ہو کر آپ پر ایمان لے آئے تو کیا آپ اس کو معاف کر دیں گے؟ آپ نے کہا: ہاں۔ یہ سنتے ہی کعب نے اپنا ڈھاٹا کھولا اور کہا: میں ہی کعب بن زہیر بن ابی سُلمٰی ہوں! آپ نے پوچھا: کیا وہی جس نے ایسا اور ایسا کہا ہے؟ ہاں! ابوبکر، تم سناؤ کیا کہا تھا اس نے؟ ابوبکر نے سنایا۔

سقا بہا المامون کاساً رویۃ : و انھلک الخ کعب بولے: یوں نہیں، میں نے تو کہا تھا:

سقاک بہا المامون کاساً رویۃ۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا: المامون! واللہ المامون۔ یعنی میں امین و مامون ہی ہوں۔ یہی لفظ درست ہے (۶) ابھی یہ گفتگو پوری نہیں ہونے پائی تھی کہ انصار سے بعض نے کعب کو رسول اللہ صلعم کے سابقہ فرمان کے بموجب قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو آپ نے انہیں ایسا کرنے سے منع فرمایا اور کہا: کعب نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اب اُسے اسلام نے بچا لیا۔ انصار خاموش ہو گئے۔ کعب نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں نے آپ کی مدح کی ہے۔ ارشاد ہو تو سناؤں۔ آپ نے اجازت دی۔ دو ایک لمحوں کے بعد کعب نے کہا:

بَانَتْ سُعَادُ فَقَلْبِی الْیَوْمَ مبتول   مُتَیَّمٌ اِثْرَھَا لَمْ یُفْدَ مکبول

سُعاد بچھڑ گئی۔ اب میرا دل ٹوٹ گیا۔ میں حیران و حواس باختہ ہوں۔ میرا دل ایک قیدی ہے کہ اس کو کوئی آزاد کرنے والا نہیں۔ تشبیب و گریز کے بعد دوسرے مدحیہ شعر سناتے سناتے جب کعب نے کہا:

اِنَّ الرَّسُوْلَ لَسَیْفٌ یُسْتَضَاءُ بِہٖ   مُھَنَّدٌ مِنْ سیوف اللہ مَسْلُوْلُ

یہ رسول تو ایک روشن و چمکدار تلوار ہے۔ اس سے اندھیرے میں اجالا ہو جاتا ہے۔ یہ میان سے نکلی ہوئی اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے تو رسول اللہ صلعم نے اپنی بُردہ (چادر) اپنے جسم سے اتاری۔ اور کعب کو اتعادی۔ پھر اپنے ساتھیوں کو وہ شعر سُننے کی طرف توجہ دلائی جو اس بیت کے بعد ہی تھے۔

فی عُصْبَۃٍ من قریش قال قائلُھُمْ   ۵۲   ببطن مَکَّۃَ لَمَّا اسلموا زولوا

زالوا فما زال انکاسٌ ولا کُشُفٌ   ۵۳   عند اللقاء ولا میلٌ معازیلُ

لیسو مفاریح ان نالت رماحھم   ۵۶   قوماً ولیسوا مجازیعاً اذا نیلوا

يمشون مشي الزهر يعصمهم ۵۷ ضرب اذا عرّد السود التنابيلُ
لا يقع الطعنُ الّا في نحورهم ۵۸ وما لهم من حياض الموت تهليلُ

حاصل کلام: رسول اللہ صلعم قریش کے ایسے جتھے میں ہیں کہ جب ان سے ایک سوجھ بوجھ رکھنے والے نے مکہ سے نکل جانے کے لئے کہا تو وہ چل پڑے۔ یہ لوگ قوی تن ہتھیار سجائے ہوئے میدان ضرب وپیکار کے یکہ تاز ہیں۔ یہ ایسے اوچھے نہیں ہیں کہ ان کے نیزے دشمنوں کے سینے چھید دیں تو دُون کی لیں اور اگر خود ان کے زخم لگ جائیں تو ہائے واے کرنے لگیں۔ یہ میدانِ جنگ میں اس طرح جاتے ہیں معلوم ہوتا ہے قوی ہیکل سفیدی مائل اونٹوں کا گلہ چھاں چھاں رواں ہے۔ ایسے سمے جبکہ کالے کلجلے کوتاہ قد لوگ معرکہ کارزار سے بھاگ کر گھروں میں پناہ لینا چاہتے ہیں تو ان کی شمشیر زنیاں کے پے درپے وار ہی ان کی پناہ گاہیں ہوتی ہیں۔ نیزے ٹوٹتے ہیں تو انہیں کے سینوں میں ٹوٹتے ہیں کیوں کہ وہ مقابلہ میں ڈٹے رہتے ہیں۔ اُن کے لئے ممکن ہی نہیں کہ وہ میدانِ جنگ سے منہ موڑ سکیں

ماقبل آخر بیت میں انصار کے نسبتاً چھوٹے قد کی طرف تعریض تھی۔ مہاجروں نے کہا: کعب! اگر تم نے انصار کی ہجو کی تو گویا ہماری مدح کی ہی نہیں۔ رسول اللہ نے بھی فرمایا: کعب! اگر تم انصار کی مدح کرو تو مناسب ہے وہ ہر طرح تمہاری مدح کے اہل ہیں۔ کعب نے حکم کی اتباع کی۔

مَنْ سَرّہ کرم الحیاۃ فلا یزل فی مقنبٍ من صالحی الانصار

جو زندگی کی بھلائی چاہتا ہے وہ ہمیشہ انصار ہی میں گزر بسر کرنا پسند کرے گا۔ انصار کی مدح میں کہے ہوئے اس رائیہ کے تینتیس ابیات دیوان کعب نیز معیاری عربی ادب کی بعض اہم کتابوں میں بھی موجود ہیں[۷]

(۲)

رسول اللہ صلعم نے کعب بن زہیر بن ابی سلمی کا لامیہ قصیدہ شروع سے آخر تک سماعت فرمایا۔
شاہ بیت: انّ الرّسول لسیفٌ الخ پر بُرد یعنی چادر اپنے جسم پر تھی وہی کعب کو اڑھا دی۔
رسول اللہ صلعم کی اس حدیث فعلی کی روایت متعدد عربی ادبی کتابوں اور سیر و مغازی کے دفتروں میں مسلسل نقل ہوتی آرہی ہے۔ اس حدیث کو اصحاب رسول اللہ صلعم کے تذکرہ نگار کعب بن زہیر

کے ترجمہ میں ثبت کرتے رہے ہیں۔ سند کے سلسلے اسی مقالہ کے حاشیہ میں درج ہیں۔ (۸)

اسلامی قانون (= شریعت) کے چار مصادر یا مآخذ (= ادلہ تشریعیۃ) میں حدیث دوسری دلیل (یا ماخذ) ہے۔ بشرط صحت اس حدیث سے کیا قانون وضع ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب اصول فقہ کے کم از کم ایک مذہب کے مبادیات کا ذکر کئے بغیر دشوار ہے اگر اختصار سے کام لیں تو غلط فہمی کا احتمال اور تفصیل میں جانا غالباً یہاں بے محل ہوگا۔ شعر و شاعری کے شرعی احکام جاننے کے خواہش مند تفسیری و حدیثی کتابوں سے رجوع ہو سکتے ہیں (۹) البتہ یہاں اتنا ثبت کرنے میں کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا کہ اللہ کے رسول نے حق اور داعی حق کی ستائش کرنے والے شعر و شاعر کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ اس لئے حق و صداقت کی تائید و حمایت کرنے والے ایسے شعر و ادب کی ترغیب و تحریص اور اس کی تحسین، جو کسی معروف شرعی حد سے متجاوز نہ ہو نہ صرف مباح بلکہ مستحب ہے۔

(۳)

کعب بن زہیر کے سب ہی تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے۔

رسول اللہ صلعم نے کعب کو جو بردہ دی تھی اسے معاویہ بن ابی سفیان (م ۶۸۰ء) نے دس ہزار دینار میں خریدنا چاہا۔ کعب نے فروخت کرنے سے انکار کیا۔ کہا: مجھے جو کپڑا رسول اللہ صلعم نے دیا اس پر میں کسی کو ترجیح دینا نہیں چاہتا۔ کعب کی وفات کے بعد معاویہ نے کعب کے وارثوں سے یہی بردہ دوگنی رقم، بیس ہزار دینار میں خرید لیا۔ (۱۰)

امیر المومنین معاویہ یہ بردہ غالباً صرف عیدوں میں خطبہ و امامت صلوٰۃ کے موقعہ پر استعمال کرتے تھے۔ خلیفہ کے اس عمل کی وجہ سے یہی بردہ خلافت کی رسمی (= قانونی) علامت سمجھی گئی۔ بردہ و قضیب (عصا، سونٹا، چھڑی، چوب دستی) کے علامت خلافت ہونے کی ہم عصر اور ہر طرح قابل وثوق شہادت ولید بن یزید بن عبد الملک (م ۷۴۴ء) کے شعر ہیں۔ ہشام (م ۷۴۳ء) کی موت کے فوراً بعد اس کے ولیعہد ولید کو خلیفہ ہونے کی اطلاع دی گئی تو اس نے کہا۔

طال لیلی فبت أسقی المدامہ إذ أتانی البرید ینعی ھشاما

واتانی بحُلّۃٍ و قضیب　　واتانی بخاتمٍ ثُمّ قاما

رات لمبی تھی، میں نشہ کرتے وقت گزاری کر رہا تھا، اتنے میں ہشام کے مرنے کی اطلاع آئی۔ غلام "حُلّہ"، قضیب اور خاتم لایا (۱۱)

ولید کے ندیم کی شہادت اِن لفظوں میں ملتی ہے: کُنّا عند الولید ابن یزید اذ جاء نا خصیّ فبشّرہٗ جُبنہٗ دَعزّاہ عن عمّہ ھشام وھنّاہ بالخلافۃ وفی یدہٖ قضیب وخاتم وطومار۔ ۔ ۔ ۔ (۱۲) ہم ولید کی محفل میں تھے کہ غلام آیا۔ ہشام کے مرنے کی خبر سنائی اور اس کو خلافت کی تہنیت دی۔ اس وقت غلام کے ہاتھ میں قضیب و خاتم (مُہر) اور جو غیذ تھا اس میں بُردہ شریف محفوظ تھا۔ اس شہادت میں بردہ شریف کے علاوہ مُہر و عصا کا بھی ذکر ہے۔ مہر و عصا کس کو کہاں سے کب ملا معلوم نہ ہو سکا۔ بہرطور اتنا تو یقینی ہے کہ بُردۂ مبارک کے ساتھ ساتھ یہ چیزیں بھی خلافت کی علامت مانی گئی تھیں۔

سنہ سات سو پچاس عیسوی میں خلافت بنو اُمیّہ سے بنی عباس کی طرف منتقل ہوئی۔ دار الخلافت کے سرکاری مخزنوں پر قبضہ ہوا نقد و جنس بہت کچھ ملا مگر بُردہ و عصا نہیں پایا گیا۔ یہ چیزیں خلافت کی سب سے زیادہ قیمتی متاع سمجھی جاتی تھیں۔ چناں چہ جب مروان شام سے مصر گیا تو انہیں اپنے ساتھ رکھنا ضروری سمجھا۔ زندگی کی اُمید نہیں رہی تو دفن کرا دیا۔ مروانی غلام نے اپنی جان کے بدلے یہ متاع عباسی سالار کے حوالے کر دی۔

اس واقعہ کی قدیم ترین تحریری شہادت جاحظ متوفی آٹھ سو اڑسٹھ عیسوی کی کتاب البیان والتبیین میں ثبت ہے (۱۳)

بنو اُمیّہ کا آخری خلیفہ مروان بن محمد بن مروان بن حکم شام سے نکل کر مصر کے ایک مقام بوصیر الملق آیا۔ یہاں ایک گرجا گھر میں اُسے عباسی سپاہیوں نے گھیر لیا۔ مروان لڑتا ہوا فوت ہو گیا۔ وفات سے پہلے اس نے اپنے ایک غلام کو بُردہ و قضیب حوالے کرتے ہوئے کہا کہ وہ ان دونوں چیزوں کو ریت میں گاڑ دے۔ یہ غلام گرفتار ہوا۔ مارا جانے والا تھا اس لئے کہا: اگر مجھے قتل کر دئے گئے

.. تو پھر رسول اللہ صلعم کی میراث ضائع ہو جائے گی۔ عباسی سالار نے اماں دی تو اس نے بھی بردہ وقضیب سالار کے حوالے کر دی۔ کان مروان حین اُحیط بہ دفع البردۃ والقضیب الی خادم لہ، وَ اَمَرَہ ان یدفنھا فی بعض الرمال فلمّا اُخذ الخادم فی الاسری قال اِن قتلتُمُونی ضاع میراث النبی صلعم۔ فامنوہ علیٰ ان یسم ذالک لھم۔

عباسی سالار نے بُردہ وعصا حاصل کر لیا۔ بردہ عباسی سالار ہی کے یہاں رہا۔ خلیفۂ وقت سے ابوالعباس عبداللہ سفاح کو (م ۷۵۴ء) اس کا کچھ پتہ نشان نہیں لگا۔ سفاح کے جانشین ابوجعفر منصور دانقی (م ۷۷۵ء) کو البتہ اس کا سراغ مل گیا۔ جبراً حاصل کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ معاویہ کے زمانہ پر اب اسّی سال سے زائد گزر چلے تھے سکّہ کی قدر، قوتِ خرید گھٹ گئی تھی۔ عوام پر اپنی دینی عقیدت کا اظہار بھی وقت کا تقاضی تھا۔ چنانچہ منصور دانقی نے یہ بردہ وعصا جس کسی کے پاس تھا اس سے چالیس ہزار دینار میں خرید لیا۔ (۱۴)

اس روایت میں اور اس کے بعد ہی کے شعری شاہد میں مُہر کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔ بردہ وعصا موجود ہے۔ اول الذکر تو وہی ہے جس سے رسول اللہ صلعم نے کعب کو نوازا تھا۔ رہا عصا سو اس کے متعلق کچھ ایسا گمان ہوتا ہے کہ وہ بھی رسول اللہ صلعم ہی کا ہو۔

عباسی خلفاء بھی یہ بُردہ وعصا صرف عیدوں کے خطبوں میں استعمال کرتے اور اس کو خلافت کا امتیازی نشان سمجھتے رہے۔ ابو شیص نے ہارون رشید (م ۸۰۹ء) کی مدح میں کہا تھا۔

یا بنی ہاشم اَفیقُوا فانّ الی　　ملک منکم حیث العصا والرداءٗ

اے بنو ہاشم! اپنے دشمنوں سے خبردار رہو، عصا و رداء جس کے قبضہ میں ہیں اقتدار بھی اسی کے یہاں ہوگا۔ اور یہ فی الواقع تمہارے ہی پاس ہیں (۱۵)

ابن قُتیبہ (م ۲۷۶ھ) ابن دُرید (م ۳۲۱ھ) وغیرہ نے بھی لکھا ہے کہ یہ بُردہ عباسی خلفاء کے یہاں ہے۔ ابن اثیر (م ۶۳۰ھ) کے بعد اس بردہ کا ذکر نہیں ملتا۔ "بانت سعاد" کے ایک شارح احمد بن محمد بن حداد بغدادی کے الفاظ ہیں: بقیت ھذہ البردۃ فی

خزائن بنی العباس إلی أن وصل المغول وجری ماجری واللہ اعلم بحقیقۃ الاحوال - یہ بُردہ عباسی خلفاء کے مخزن میں محفوظ تھا۔ تا آں کہ تاتاری سیلاب آیا۔ بغداد برباد ہوا عباسی ذخیرے تباہ ہوئے۔ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس بردہ شریفہ کا کیا ہوا۔

(۴)

ابوعبداللہ شرف الدین متوفی چھ سو چھیانوے ہجری مصری بوصیری کا میمیّۃ قصیدہ ہندوستان خصوصاً جنوبی ہند میں نہ معلوم کیوں "بردہ شریف" کہلانے لگا۔ کعب بن زہیر کے قصیدہ سے اس کا دور دور تک کوئی تعلق نہیں۔ کعب کا قصیدہ سرتاسر معنیً و مزاجاً حجازی و نجدی۔ سادہ و پرکار جلالت و عظمت کا ہو بہو عکاس۔ ہندیوں کو محض والہانہ شیفتگی کا اظہار زیادہ پسند آتا ہے۔ ان کے لئے جلال کے ساتھ جمال کا تصور کرنا شاید دشوار ہے غرض وجہ خواہ کچھ ہو بوصیری کے قصیدہ کو "قصیدہ بردہ" کہنا خلاف واقعہ ہے۔

مرحوم مولانا ذوالفقار علی دیوبندی نے ٹھیک لکھا ہے کہ: قصیدۃ کعب ھی التی حقہا أن تسمی بالبردۃ واما قصیدۃ البوصیری فحقہا أن تسمی بالبراءۃ۔ قصیدہ کعب ہی بردہ کہلانے کا مستحق ہے نہ کہ بوصیری کا قصیدہ۔ بوصیری کے قصیدہ کو قصیدہ براءۃ کہنا مناسب ہے۔ کیوں کہ بوصیری کو فالج ہو گیا تھا۔ اپنا میمیّہ قصیدہ سرانجام دینے کے بعد انہوں نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلعم ان کے جسم پر اپنا ہاتھ پھیر رہے ہیں۔ بوصیری خواب سے جاگے تو اپنے کو بالکل چنگا پایا۔ (براء کے معنی چنگا ہونا۔ بیماری کا زائل ہونا یا تندرست ہونا ہیں) خود بوصیری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے اپنا دستِ مبارک اُن کے جسم پر پھیرا (نہ کہ آپ صلعم نے اپنی چادر اُڑھائی)

کعب بن زہیر کے لامیہ قصیدہ بُردہ کی حسب توقع بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ عربی شرحوں میں سب سے زیادہ مفصّل شرح شہاب الدین احمد دولت آبادی متوفی آٹھ سو انچاس ہجری کی ہے۔ اس طرح کہ (۱) لغت (۲) صرف (۳) نحو (۴) معانی (۵) بیان (۶) بدیع (۷) عروض پر سیر

حاصل توضیح ہے۔ پھر ہر ہر بیت کا حاصل کلام علیحدہ علیحدہ لکھا ہے۔ نام ہے مصدق المفضل۔ دائرۃ المعارف حیدر آباد سے سنہ تیرہ سو تیئیس ہجری میں چھپی تھی۔

" عربی میں نعتیہ کلام " کے مصنّف نے عربی کی چند مشہور شرحوں کے نام سے اسماء شارحین نقل کئے ہیں۔ ان میں مصدق المفضل کا حوالہ نہیں ملا۔

ص۔ ۱۵۰ اور آگے۔ لکھنؤ۔ ۱۹۷۵ء

توضیحات مع مصادر و مآخذ

۱۔ دوسرے درجہ کا شاعر "مفلق" کہلاتا ہے۔ تیسرے درجہ والا "شاعر" اور سب سے آخر رہنے والا "شعرور" ہے۔ ج البیان والتبیین۔ جاحظ م ۲۵۰ھ ج ۲۔ ص ۹۔ مصر۔ ۱۳۶۷ھ

۲۔ الشعر والشعراء۔ عبداللہ بن قُتَیبَہ م ۲۷۶۔ ص ۷۶۔ مصر۔ ۱۳۶۴ھ

- النهاية في غريب الحديث۔

لسان العرب۔ ابن منظور۔ ابن مکرم۔ م ۷۱۱ھ۔ مادۃ۔ خ س ف۔

۳۔ طبقات فحول الشعراء۔ محمد بن سلام الجمحی۔ م ۲۳۱ھ ص ۴۷ مصر۔ ۱۳۷۱ھ۔ اس بیت کا مطلب کچھ اس طرح ہوگا: کسی کی لغزش نظر انداز کئے بغیر تم اس سے اپنی دوستی برقرار نہیں رکھ سکتے۔

ہے کوئی ایسا جو ہمیشہ ہی شائستہ و سنجیدہ رہ سکے؟

۴۔ الشعر والشعراء ص ۹۳۔

۵۔ شرح بانت سعاد۔ جمال الدین، ابن ہشام الانصاری م ۷۶۱ھ

۶۔ السیرۃ النبویۃ۔ عبدالملک بن ہشام الحمیری ۲۱۳ھ مصر۔ ۱۳۵۵ھ ج/۴ ص ۱۴۴ تا ۱۵۸

کعب بن زہیر کا واقعہ جن جن مصادر میں آیا ہے ان کے حوالے برمحل دیئے گئے ہیں یہاں پر جس طرح بیان ہوا ہے اس میں کسی ایک ہی مصدر کی اتباع نہیں کی گئی۔ صورت واقعہ میں فسخ

یا مَسخ بالکل نہیں ہوا۔ مقالہ نگار کا نسخ دنظم برائے نام ہے۔ یہاں بقولِ سلف "دخل حدیث بَعضِہم فی بعض" پر عمل کیا گیا ہے۔ ان مصادر میں قابلِ ذکر اختلاف صرف دو نظر آئے۔ الف/ کعب نے "بانت سعاد" مکہ میں بمقام بیت الحرام سنایا نہ کہ المدینہ میں۔

بطور تطبیق اختلاف کہہ سکتے ہیں کہ غالباً دو بار سنایا ہو۔ ب/ رسول اللہ صلعم تک کعب کی رہبری جُھنیہ کے ایک شخص نے کی نہ کہ ابوبکر نے۔

ان دو روایتوں کے بغور مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جُھنیؔی نے ابوبکرؓ کا پتہ دیا اور ابوبکرؓ کی ہمراہی میں کعب نے رسول اللہ صلعم کے یہاں رسائی پائی اور یہ کہ کعب نے ابوبکر سے اپنا تعارف کرا دیا اور یہ بھی کہ ابوبکرؓ کو قوی توقع تھی آپ صلعم کعب کو معاف کر دیں گے۔

الکامل فی التاریخ کے مولف نے کعب کا واقعہ سنہ نو (۹) ہجری کے حوادث میں درج کیا ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے لفظ ماموُر (آخر میں راءِ مہملہ) اس لئے ناپسند کیا کہ اس زمانہ میں اہل عرب ایسے شخص کو المامور کہتے تھے جو صرف اپنے جی سے کوئی بات کہنا "کیوں" کے جواب میں چُپ سادھ لیتا۔ توہّم پسند لوگ خیال کرتے یہ جن کی طرف سے کہنے پر مامور ہے۔

آپ صلعم یقیناً اللہ کی طرف سے اللہ کا پیغام پہنچانے پر مامور تھے مگر وقت کی چلی ہوئی اصطلاح سے مامور من اللہ کو ممتاز کرنا ضروری تھا۔ چناں چہ آپ صلعم نے مامور کی بجائے المامون پسند فرمایا۔ اللہ نے آپ کو اپنے پیغام کا امین بنایا تھا۔ آپ نے امانت میں کوئی تصرف نہیں کیا امانت کا حق ادا کیا۔

۷۔ خزانۃ الادب ۴/ سمط اللآلی۔ ج ا ص ۴۹۱۔ اور الشعر والشعراء لابن قتیبہ

۸۔ یہاں صرف وہ حوالے درج ہیں جن میں سلسلہ سند بیان ہوا ہے۔

الف/ قال عبد الملک بن ھشام قال ابن اسحاق: حدثنی عاصم بن عمر بن قتادہ الدوسی (م ۱۲۰) + وقال ابن ھشام: ذکرلی علی بن زید بن جدعان۔

ب/ مجالس ثعلب۔ ابوالعباس احمد بن یحیی ثعلب م ۲۹۱۔ حدثنا ثعلب ثنا عمر بن شبّہ ثنا ابو ھیثم بن المنذر الحزامی ثنا الحجّاج بن ذی الرقیۃ ابن عبد الرحمن

بن مضرب بن کعب بن زہیر بن ابی سلمہ عن ابیہ عن جدہ۔

ثعلب کا دوسرا عنعن / قال ثعلب ثنا ابن شبہ قال: حدثنی ابراہیم ابن المنذر الحزامی، قال / حدثنی معن بن عیسی أنبأنا محمد بن عبد الرحمن الاوقص عن ابن جدعان

ج/ الاصابہ فی معرفۃ الصحابۃ۔ احمد بن علی ابن حجر م ۸۵۲ھ / قال ابن ابی عاصم فی الاحاد والمثانی۔ حدثنا یحیی بن عمر بن جریج حدثنا ابراہیم بن المنذر حدثنا الحجاج بن ذی الرقیبۃ بن عبد الرحمن بن کعب ابن زہیر عن ابیہ عن جدہ

وقال ابن حجر وقعت لنا بعلوٍ فی جزء (؟) ابراہیم بن دیزل الکبیر واخرج ابن قانع من طریق الزبیر بن بکار عن بعض اہل المدینۃ عن یحیی بن سعید بن المسیب۔

د/ الاغانی - ابو الفرج علی م ۳۵۶ - طبع الدار - بالکل وہی عنعن جو ثعلب کا ہے۔

۹۔ تنزیل میں لفظ شعر اور شعراء صرف ایک ایک مرتبہ اور شاعر چار بار آیا ہے۔ بعض مفسر شعر کے فقہی احکام سورۃ الانبیاء میں بیان کرتے ہیں اور بعض سورۃ الشعراء یا سورۃ یاسین میں۔ ان سورتوں کی تفسیر میں مطلوبہ بحث کہیں نہ کہیں انشاء اللہ مل جائے گی۔ مزید تفصیل کے لئے مفتاح کنوز السنۃ۔ مصر۔ ۱۳۵۲ھ مادہ ش ع ر سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

۱۰۔ امیر المومنین معاویہ بن ابی سفیان کے بردہ خریدنے کا واقعہ جن قدیم مصادر میں آیا ہے ان میں سے چند یہ ہیں۔ بترتیب حرف تہجی۔

۱-۱ اسد الغابۃ۔ عز الدین ابو الحسن علی م ۶۳۰ھ تذکرۂ بجیر و کعب

۲-۱ الاشتقاق۔ محمد بن الحسن بن درید م ۳۲۱ - مصر - ۱۳۷۹ھ ص ۱۸۲

۳-۱ الاصابۃ - احمد بن علی ابن حجر م ۸۵۲ھ -

۴۔ شرح بانت سعاد۔ جمال الدین بن ہشام م ۷۶۱ھ

۵۔ الشعر والشعراء۔ ابن قتیبة م ۲۷۶ھ تذکرۂ کعب

۶۔ الکامل فی التاریخ۔ ابن الاثیر م ۶۳۰ھ حوادث سنہ تسع

۷۔ مجالس ثعلب۔ ابو العباس احمد بن یحیٰی ثعلب م ۲۹۱ھ مصر۔ ۱۳۶۸ھ ص ۴۰۸

۸۔ معجم الشعراء: ابو عبد اللہ محمد المرزبانی م ۳۸۴ھ تذکرۂ کعب

۱۱۔ الاغانی۔ ج ۱۹/۷

۱۲۔ ایضاً۔ ص ۱۷

۱۳۔ البیان۔ ج ۳۔ ص ۶۹

۱۴۔ خزانة الادب۔ عبد القادر م ۱۰۹۳۔ بولاق۔ ۱۲۹۹۔ ج/۴/ص ۱۲
نقلاً عن شرح بانت سعاد لاحمد بن محمد بن الحداد۔ تاریخ الشرح
سنہ ۷۴۴ھ۔

۱۵۔ البیان۔ ج ۲۔ ص ۱۲۴

۱۶۔ الکامل فی التاریخ۔ طبع یورپ/۱۸۶۶۔ ج ۲۔ ص ۲۱۰

۱۷۔ کتاب الزینة: ابو حاتم احمد بن حمدان م ۳۲۲ھ ج ۱ ص ۵۳ مصر۔ ۱۹۵۶

شیخ عبدالرحمٰن چشتیؒ

از

(جناب ڈاکٹر محمد عمر ریڈر شعبۂ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی - علی گڑھ)

شیخ عبدالرحمٰن چشتیؒ کی تصانیف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک جیّد عالم تھے جن کو عربی، فارسی اور سنسکرت زبانوں پر قدرت حاصل تھی اور بحیثیت صوفی ان کا شمار اس عہد کے مشایخ میں ہوتا تھا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ابھی تک اُن کے بارے میں کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا ہے - اِس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اُن کا ذکر مراۃ عالم مصنفہ بختاور خاں کے سوا کسی دوسری ہم عصر کتاب میں نہیں ملتا - اِس لئے ان کی زندگی اور حالات کے بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں اور معلومات کا واحد ذریعہ وہ سرسری بیانات ہیں جو ان کی تصانیف میں کہیں کہیں ملتے ہیں -

شجرۂ نسب : عبدالرحمٰن چشتی نے اپنا شجرۂ نسب اِس طرح بیان کیا ہے - عبدالرحمٰن بن عبدالرسول بن قاسم بن شاہ بدھ عباس العلوی چشتی[1] آخرالذکر شیخ بدھ چشتی سلسلے

---

[1] عمدۃ اولیاء عرف شیخ بدھ بن شیخ محمد بن شیخ عارف ابن شیخ احمد عبدالحق ردولوی اپنے والد کے جانشین ہوئے تھے - شیخ بدھ صوری اور معنوی کمالات کے حامل تھے - شیخ عبدالرحمٰن قدوائی، جن کی عمر تقریباً سو سال کی تھی، بلا واسطہ ان کے مرید تھے - آخری عمر میں شیخ بدھ نے پیران چشت کی امانت اپنے نیک بخت بیٹے شیخ پیر کے سپرد کی اور انھوں نے رحلت فرمائی -

عبدالرحمٰن چشتی نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت شیخ بدھ نے خرقۂ خلافت اپنے چھوٹے بیٹے شیخ منصور کو تفویض کیا تھا - شیخ منصور ایک بزرگ تھے اور انھوں نے دور دراز مقامات کی سیر و سیاحت کی تھی - انھوں نے حضرت شیخ جلال الدین تھانیسری وغیرہ مشایخ کی خدمت میں حاضر ہو کر روحانی فیضان حاصل کیا تھا - شیخ منصور کے بیٹے شیخ عالم تھے جن کی خدمت میں عبدالرحمٰن چشتی حاضر ہوا کرتے تھے - مرآۃ الاسرار، ص ۳۳۶ الف

میں بیعت تھے۔ اسٹوری نے لکھا ہے کہ وہ شیخ احمد عبد الحق ردولوی کی اولاد میں سے تھے۔ اپنے بھائی کی وفات پر ۱۶۲۲ء میں ردولی کی مقامی چشتی شاخ کے سربراہ ہوئے تھے[1]

وطن اور ابتدائی زندگی: شیخ عبد الرحمن چشتی کی ولادت دھنیٹھی یا دھنٹی نامی گاؤں میں ۱۰۰۵ھ / ۱۵۹۵ - ۱۵۹۶ء میں ہوئی تھی جو لکھنؤ سرکار میں واقع تھا۔ بعد میں اس گاؤں کا نام رسول پور پڑ گیا کیوں کہ اُن کے والد، عبد الرسول نے وہاں سکونت اختیار کرلی تھی۔ شیخ عبد الرحمن چشتی کی ابتدائی تعلیم و تربیت کا کہیں ذکر نہیں ملتا جو غالباً گھر ہی میں ہوئی ہوگی۔ بعدہٗ انھوں نے قصبہ امیٹھی جا کر کسبِ علوم کیا۔ یہ قصبہ علم و ادب کا مرکز تھا۔ بعد میں انھوں نے راہِ طریقت اختیار کرلی[2]

سلسلۂ طریقت: اپنے بیان کے مطابق عبد الرحمن چشتی نے متعدد سلسلوں کی تعلیمات سے فیضان حاصل کیا تھا۔ انھوں نے ان سلسلوں کی تفصیل نہیں بتائی ہے۔ لیکن درحقیقت انھوں نے چشتی سلسلہ کے اذکار و اشغال کے ذریعہ طریقت کی منزلیں طے کی تھیں۔ طریقۂ صوفیہ کی تعلیم انھوں نے شیخ حمید[3] سے پائی تھی جو اپنے زمانہ میں قطب

---

[1] C.A. STOREY. PERSIAN LITERATURE VOL. I. LONDON. 1953. P. 1005-

[2] بختاور خاں: مرآۃ عالم (قلمی) ص ۲۲۱ الف و ب - نیز شیخ محمد بقار، بقا سہارنپوری، مرآۃ جہاں نما: ص ۳۲۳ ب - بختاور خاں، عبد الرحمن چشتی کا ہم عصر تھا - عہد اورنگ زیب کے امرا میں اس کا شمار ہوتا تھا - عبد الرحمن چشتی سے اس کے ذاتی مراسم تھے - بختاور خاں نے اُن کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ اپنی ذاتی معلومات کی بنیاد پر لکھا ہے - بختاور خاں کا انتقال ۱۶۸۵ء میں ہوا تھا -
ڈاکٹر نور الحسن انصاری - فارسی ادب بعہدِ اورنگ زیب (دہلی ۱۹۶۹ء) ص ۴۶۳ - ۴۶۶

[3] شیخ حمید الدین بن شیخ قطب الدین انسانی کمالات سے آراستہ تھے اور علوم ظاہری و باطنی میں پوری قدرت رکھتے تھے۔ والد کے انتقال کے تیسرے دن ان کی رسم جانشینی ادا کی گئی اور فاتحہ سوم کے بعد وہ اپنے حجرے میں مقید ہوگئے اور ایک سال تک باہر نہ نکلے، ریاضت شاقہ اور یادِ الٰہی میں مصروف رہے قلتِ طعام کے ذریعہ روحانی مدارج طے کئے۔ دنیا داروں سے دور رہتے تھے۔ آخری عمر میں قرآن پاک حفظ کیا۔ وہ اکثر تفسیر زاہدی کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ توحید وجودی مسلک کے پیرو تھے۔ سماع کو جائز سمجھتے تھے۔ خوش الحان قوال ہمہ وقت ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ ان کی خانقاہ میں دیوانِ حافظ اور دیوان مغربی سے غزلیں اور شیخ شرف الدین بو علی قلندر کے اشعار پڑھے جاتے تھے۔ عبد الرحمن چشتی (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

کا مرتبہ رکھتے تھے۔ حضرت شیخ حمید کا روحانی سلسلہ اس طرح تھا۔
شیخ حمید نے اپنے والد بزرگوار شیخ قطب الدین[۱] سے تربیت پائی تھی اور انھوں نے اپنے والد شیخ اولیا عرف شیخ بدھ سے، شیخ بدھ نے شیخ محمد سے، انھوں نے اپنے والد شیخ عارف[۲] سے، انھوں نے اپنے والد شیخ احمد عبد الحق ردولوی[۳] سے سلوک طے کیا تھا جو عبد الرحمٰن چشتی کے مرشد معنوی تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کا بیان ہے کہ انھوں نے شیخ حمید سے خرقۂ خلافت پایا تھا۔ شیخ حمید کا انتقال ۱۶۲۲ء میں ہوا تھا۔ مزار سوولی میں واقع ہے۔
برائے تفصیل ملاحظہ ہو، مرآۃ الاسرار۔ ص ۳۳۷ الف و ب

[۱] شیخ میر نے اپنے بیٹے شیخ قطب الدین کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ شیخ قطب الدین حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے تھے۔ مریدوں کی روحانی تربیت میں خاصی دلچسپی لیتے تھے۔ قصبہ پانی پت کے ساکن، شیخ معروف مجذوب (دیکھیے۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی۔ اخبار الاخیار (اردو ترجمہ پاکستان ایڈیشن) ص ۴۷۹) ان کے مرید تھے۔ شیخ قطب الدین نے حضرت شیخ علاء الدین علی احمد صابر کلیری کے مزار پر حاضری دی اور روحانی فیضان حاصل کیا۔ اکبر بادشاہ کے امیروں میں رحمت خان، شیخ موصوف سے بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ مرآۃ الاسرار ص ۳۳۶ ب

[۲] شیخ محمد بن شیخ عارف بن شیخ احمد عبد الحق ردولوی صاحب کمالات بزرگ تھے۔ اور دینی علوم میں ان کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ شیخ عبد القدوس گنگوہی بن اسمٰعیل حنفی نے ان سے بیعت کر کے روحانی تربیت حاصل کی تھی اور خرقۂ خلافت بھی پایا تھا۔ آخری عمر میں جب شیخ محمد علیل ہوئے تو انھوں نے اپنے بڑے بیٹے شیخ بدھ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ شیخ محمد۔ سلطان بہلول لودی (۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۹ء) کے زمانے میں اپنے مریدوں کی تربیت میں مصروف تھے۔ مرآۃ الاسرار: ۳۳۵ ب۔ ۳۳۶ الف۔ مولانا غوثی شطاری۔ گلزار ابرار (اردو ترجمہ، مطبع مفید عام آگرہ۔ ۱۹۰۹ء) ص ۵۸۲، اخبار الاخیار۔ ص ۳۴۰۔

[۳] شیخ احمد عبد الحق ردولوی کے بیٹے تھے اور اُن کے جانشین بھی ہوئے تھے۔ تقریباً چالیس سال کی عمر پائی۔ ان کی ولادت ۱۴۱۲ء میں ہوئی تھی اور انھوں نے ۱۴۵۱ء میں وفات پائی۔ لیکن خزینۃ الاصفیا میں ان کے انتقال کا سنہ ۱۴۴۳ء لکھا ہے ملاحظہ ہو۔ اخبار الاخیار۔ ص ۳۴۰، مرآۃ الاسرار: ص ۳۳۵ ب، مولوی غلام سرور۔ خزینۃ الاصفیا (مطبع منشی نول کشور کانپور، ۱۸۹۴ء) جلد اول۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷

[۴] شیخ احمد عبد الحق بن شیخ عمر کی ولادت ۱۳۶۲ء میں اور ان کا انتقال ۱۴۳۳ء میں ہوا تھا۔ وہ شیخ جلال الحق والدین پانی پتی کے مرید و خلیفہ اور صاحب تصرف و کرامات بزرگ تھے۔ عبد الرحمٰن چشتی نے مرآۃ الاسرار میں ان کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ شیخ احمد عبد الحق ریاضت شاقہ میں مصروف رہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ چھ ماہ تک وہ ایک . . . . . . قبر میں بند ہو کر عبادت الٰہی میں مصروف رہے۔ اِس ریاضت کے صلے میں اُنھیں عبد الحق کا خطاب ملا تھا۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ الہداد چشتی۔ سیرۃ قطاب (مطبع نول کشور لکھنؤ۔ ۱۹۱۳ء)

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

شیخ احمد عبد الحق ردولوی نے شیخ جلال الحق والدین پانی پتی[1] سے اور انھوں نے حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پتی[2] سے استفادہ کیا تھا۔ اس طرح یہ سلسلہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری تک پہونچتا ہے۔

حضرت شیخ احمد عبد الحق ردولوی سے غائبانہ کسب فیض کرنے کی وجہ سے عبد الرحمن چشتی خود کو اویسی تصور کرتے ہیں۔ مزید برآں ابتدائی دور میں راہ سلوک میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ص ۲۱۵ - ۲۲۲؛ اخبار الاخیار - ص ۳۳۳ - ۳۳۷؛ مرآۃ الاسرار ص ۳۳۵ ب - ۳۳۸ الف - گلزار ابرار - ص ۵۸۲ - ۵۸۶؛ خزینۃ الاصفیا جلد اول - ص ۳۸۴ - ۳۸۷

[1] آپ کا اصلی نام محمد بن محمود پانی پتی گازرونی تھا لیکن ان کے پیر و مرشد، شیخ شمس الدین ترک پانی پتی نے انھیں جلال الدین کا لقب دیا تھا۔ وہ حضرت جلال الدین محمد کبیر الاولیا کے نام سے بھی یاد کئے جاتے تھے۔ ہندوستان میں وہ شیخ جلال الدین پانی پتی کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے مریدین اور خلفاء کثیر تعداد میں تھے۔ فقر و فاقہ کی زندگی گذارتے تھے اکثر صحرا میں جاکر تنہائی میں یاد الٰہی میں مصروف رہا کرتے تھے۔ اس عہد کے علماء و مشایخ ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ انھیں سماع سے دلچسپی تھی۔ ان کی مشہور تصنیف زاد الابرار ہے۔ انھوں نے ۷۶۵ھ/۱۳۶۳ء میں وفات پائی۔ مزار پانی پت میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

سیر الاقطاب: ۱۹۷ - ۲۱۵؛ مرآۃ الاسرار - ۲۹۹ ب - ۳۰۲ الف، خزینۃ الاصفیا - جلد اول - ص ۳۶۱ - ۳۶۵؛ پانی پت اور بزرگان پانی پت (مطبوعہ الجمعیۃ پریس، دہلی) ص ۱۹۹، ابعد

[2] شیخ شمس الدین ترک، شیخ احمد یسوی کے پوتوں میں سے تھے۔ چند واسطوں سے ان کا سلسلۂ نسب حضرت محمد بن الحنفیہ بن حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ تک پہونچتا ہے۔ اصلی وطن ترکستان تھا۔ وطن میں ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد طلب حق میں اپنے وطن سے روانہ ہوئے؛ ماوراء النہر پہونچے، وہاں کے علماء و مشایخ سے استفادہ کیا۔ آخر میں ہندوستان کا رخ کیا اور اجودھن آئے جہاں حضرت بابا فرید گنج شکر کی خانقاہ میں روحانی تربیت کا سلسلہ جاری تھا۔ شیخ شمس الدین ترک، حضرت خواجہ علاء الدین احمد صابر کلیری کے دامن سے وابستہ ہوئے اور ان کے خاص الخاص خلیفہ ہونے کا بلند مرتبہ حاصل کیا۔ پانی پت میں سکونت اختیار کی، قلندرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ۷۱۵ھ/۱۳۱۵ء میں آپ نے رحلت فرمائی۔ مزار پانی پت میں ہے۔

سیر الاقطاب: ۱۸۴ - ۱۹۷؛

مرآۃ الاسرار: ۲۶۶ الف - ۲۶۷ ب،

خزینۃ الاصفیا - جلد اول - ص ۳۲۱ - ۳۲۵؛ پانی پت اور بزرگان پانی پت ص ۱۷۱ - ۱۹۷

(یعنی ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۶ء) تک انھیں روحانی فیضان حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری سے پہنچا تھا[1]

ایک موقع پر عبدالرحمن چشتی نے لکھا ہے کہ راہِ سلوک کے وسط میں صوفیہ کی واردات کا علم حاصل کرنے کی غرض سے چند مرتبہ چلّہ کشی کی ۔ اس کے باوجود دلی تمنا پوری نہ ہوئی یعنی وہ کیفیت طاری نہ ہوئی جس سے روحانی تسکین ہوتی ۔ اس لئے انھوں نے تذکرۃ الاولیا کا لفظاً لفظاً مطالعہ کیا ۔ اِس میں جب وہ سلطان العارفین حضرت خواجہ بایزید بسطامی کی معراج کے بیان پر پہنچے تو وہ کیفیت جس کے وہ متمنی تھے خود بخود جلوہ گر ہوگئی ۔ اس سلسلے میں عبدالرحمن نے یہ بھی دلیل پیش کی ہے کہ دورِ ماضی کے بزرگوں سے اگر روحانی فیضان حاصل نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں گزشتہ انبیاؑ کا ذکر نہ کرتا[1]۔

اپنے بیان کے مطابق عبدالرحمن کو سالار مسعود غازی بہرائچی سے بھی روحانی فیض پہنچا تھا ۔ غالباً اِسی لئے انھوں نے مرآۃ مسعودی کے نام سے ایک رسالہ ان کی سوانح عمری کے بیان میں لکھا تھا ۔ بہرائچ کے قرب وجوار میں سالار مسعود غازی کے رفقاء کے مزارات تھے جہاں جاکر اکثر عبدالرحمن روحانی فیضان حاصل کیا کرتے تھے ۔[2] اسی طرح وہ دوسرے بزرگوں کے مزاروں پر بھی حاضری دیا کرتے تھے[3]

شیخ عبدالرحمن چشتی ۔ حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ[4] کے مزار پر جاکر بھی معتکف

---

[1] مرآۃ الاسرار ۔ ص ۶ ب

[2] مرآۃ مسعودی ۔ ص ۶۱

[3] مرآۃ الاسرار ۔ ص ۱۲۱ ب

[4] ان کی ولادت ۱۳۶۵ء میں ہوئی اور انھوں نے ۱۴۶۶ء میں وفات پائی ۔ حضرت اشرف جہانگیر سمنانی، شیخ علاء الحق بن اسعد لاہوری بنگالی کے مرید تھے (ملاحظہ ہو ۔ اخبار الاخیار ۔ ص ۲۵۶ ۔ ۲۵۷ ؛ خزینۃ الاصفیا ۔ جلد اول ۔ ص ۳۶۸ ۔ ۳۷۰) توحید وجودی کے قائل تھے کشف وکرامات ۔ منازل اور مقامات کے آپ مالک تھے ۔ آپ کے مکتوبات بھی مرتب ہوئے تھے ۔ لیکن اب دستیاب نہیں ہیں ۔ برائے تفصیل دیکھئے ۔ اخبار الاخیار ۔ ص ۲۹۴ ۔ ۲۹۷ ؛ گلزار ابرار ۔ ص ۱۴۵ ۔ ۱۴۶ ؛ خزینۃ الاصفیا ۔ جلد اول ۔ ص ۳۷۱ ۔ ۳۷۲

ہوتے[1] ان بزرگوں کے علاوہ وہ شیخ عبدالرحمٰن چشتی، حضرت میر سید معزالدین[2]، ساکن امیٹھی، خلیفہ شیخ احمد عیسیٰ تاج جونپوری[3] کی خدمت میں دس بارہ سال کی عمر میں حاضر ہوئے تھے اور انھیں نعمتِ معنوی کی بشارت نصیب ہوئی تھی[4]۔

شیخ عبدالرحمٰن نے شیخ عبدالغفور صدیقی اجمیری، خلیفہ میر سید محمد محقق (متوفی ۹۶۵ھ/۱۵۵۸ء) سے بھی فیضان حاصل کیا تھا۔ شیخ عبدالغفور ایک مرتاض بزرگ تھے اور انھوں نے ساٹھ سال تک ایسا مجاہدہ کیا تھا کہ وہ مشاہدہ میں بدل گیا تھا۔ ان کا وصال ۱۰۳۳ھ/۱۶۲۳ء میں ہوا تھا۔ عبدالرحمٰن چشتی پر وہ خاص عنایت فرماتے تھے[5]۔

---

[1] مرآۃ الاسرار۔ ص ۳۴۰ ب۔ ۳۴۱ الف

[2] میر سید معزالدین امیٹھوی کا شیخ محمد عیسیٰ تاج جونپوری کے خلفاء میں شمار ہوتا تھا۔ وہ صاحبِ کمالات تھے اور ان سے خوارقِ عادات ظاہر ہوتے تھے۔ قصبۂ امیٹھی کے سادات خود کو اُن کی اولاد بتاتے ہیں۔ مرآۃ الاسرار۔ ص ۳۴۶ الف۔

[3] شیخ محمد عیسیٰ تاج، جونپور کے مشہور بزرگ تھے۔ آپ کے والد بزرگوار، شیخ احمد عیسیٰ کا دہلی کے عزت داروں میں شمار ہوتا تھا۔ دہلی پر امیر تیمور کے قیامت خیز حملے کے وقت وہاں کے اکثر اکابر جونپور چلے گئے جن میں شیخ احمد عیسیٰ بھی تھے۔ اُس وقت شیخ محمد عیسیٰ کی عمر تقریباً سات آٹھ سال کی تھی۔ کم عمری میں ہی آپ نے شیخ فتح اللہ اودھی (متوفی ۸۱۸ھ/۱۴۱۵ء) کے دستِ مبارک پر بیعت کی (برائے حالات دیکھئے۔ اخبار الاخیار، ۲۹۷-۲۹۹؛ خزینۃ الاصفیا جلد اول۔ ص ۳۸۰) پیر و مرشد کے حسب الارشاد ایک مدت تک ملک العلماء قاضی شہاب الدین سے مذہبی اور عقلی علوم کسب کئے۔ قاضی صاحب نے انھیں بحث امر تک اصول بزدوی پڑھائی تھی جس کی انھوں نے شرح لکھی تھی۔ اس کے بعد پیرِ طریقت کی خدمت میں رہ کر باطنی علوم حاصل کئے۔ شیخ محمد عیسیٰ ہمیشہ مراقبے میں رہا کرتے تھے جسم کی تمام ہڈیوں کے ساتھ گردن کی ہڈیاں تک اُبھر آئی تھیں اور سینہ اندر کی طرف گھس گیا تھا۔ آپ کا مزار جونپور میں ہے مرجع خاص و عام ہے آپ نے ۸۵۰ھ/۱۵۰۵ء میں رحلت پائی۔ مرآۃ الاسرار۔ ۳۴۵ ب۔ ۳۴۶ الف، اخبار الاخیار۔ ص ۳۲۰؛ خزینۃ الاصفیا۔ جلد اول ص ۴۱۱۔

[4] مرآۃ الاسرار۔ ص ۳۴۶ الف

[5] ایضاً ص ۳۵۵ ب

[6] ایضاً۔ ص ۳۵۵ ب

شیخ عبد الرحمن نے شیخ عبد الرحمن قدوائی سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔ وہ شیخ بدھ کے مرید تھے لیکن انھوں نے شیخ منصور بن شیخ بدھ سے روحانی استفادہ کیا تھا۔ شیخ عبد الرحمن چشتی نے اُن سے بھی بہت سے فیوض حاصل کیے۔ شیخ عبد الرحمن قدوائی فقر اور گمنامی کی زندگی بسر کرتے تھے[۱]

شیخ عبد الرحمن چشتی، حضرت شیخ حسن صیاف[۲] کے بھی مرید تھے جو شیخ عبد الجلیل لکھنوی[۳] کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اپنے پیر و مرشد شیخ حسن کی معیت میں شیخ عبد الرحمن چشتی نے چالیس سال تک قیام کیا تھا اس کے بعد ہی وہ سید حسن شریف کچھوچھوی اور اور شیخ حمید بن شیخ قطب چشتی ردولوی کے توسط سے چشتیہ سلسلہ میں داخل ہوئے تھے۔ شیخ حسن نے خواجہ معین الدین چشتی، شیخ احمد عبد الحق ردولوی اور سید سالار مسعود غازی سے غائبانہ روحانی فیضان حاصل کیا تھا۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ شیخ عبد الرحمن چشتی ایک بلند پایہ صوفی اور عالم تھے۔ بختاور خاں وہ پہلا معاصر ہے جس نے اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر اُن کا تعارف مرآۃ عالم میں کرایا ہے شیخ عبد الرحمن چشتی عمدہ اخلاق، اور پسندیدہ اطوار کے حامل تھے۔ وہ بلند ہمت تھے۔ فقرا اور اغنیا میں سے جو کوئی بھی ان کی خدمت میں حاضر

---

[۱] مرآۃ الاسرار ص ۱۳۳۶ الف

[۲] حسن بن مراد انبالوی کی ولادت ۱۵۷۰ء میں ہوئی تھی۔ اُن کا انتقال ۱۶۵۶ء میں ہوا تھا۔ اُن کا دفن لکھنؤ میں ہے۔ سید عبد الحی حسنی: نزہۃ الخواطر (حیدر آباد ۱۹۵۵ء) جلد پنجم۔ ص ۱۳۲-۱۳۳؛ نیز مرآۃ جہاں نما۔ ص ۳۲۳ ب

[۳] شیخ عبد الجلیل چشتی لکھنوی کا شمار اس عہد کے مشایخ میں ہوتا تھا اور روحانی طریقے میں وہ اویسی سلسلے کے پیرو تھے۔ بظاہر انھوں نے کسی شیخ سے باقاعدہ بیعت نہیں کی تھی بلکہ خواجہ معین الدین چشتی سے غائبانہ روحانی فیوض حاصل کیے تھے۔ اپنے مریدوں کو جو وہ شجرہ دیتے تھے اس میں اپنے نام کے بجائے بطور واسطہ خواجہ صاحب کا نام لکھتے تھے۔ بلا واسطہ وہ اپنی نسبت خواجہ صاحب سے منسوب کرتے تھے۔ انھوں نے ۱۶۳۳ء میں وفات پائی۔ خزینۃ الاصفیا ج ۱ ص ۴۶۹؛ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۰-۲۰۱

ہوتا، شیخ موصوف اس کی خدمت کرتے اور اُس کی دلجوئی کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتے آخری زمانے میں شیخ عبدالرحمٰن نے قصبہ دھنتی میں جو دریائے گومتی کے کنارے پر واقع تھا، عالی شان عمارتیں تعمیر کرائیں، چوں کہ ان کی آمدنی قلیل اور خرچ زیادہ تھا اس لئے عوام میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ کیمیا گری کے ذریعہ دولت حاصل کرتے تھے۔ اس کے برعکس اُن کے مریدین اور ارادت مند اُنھیں عالم الغیب کے خزانے کا خازن تصور کرتے تھے۔ دربارِ جہانگیری سے اُنھیں بارہا گراں قدر مالی امداد ملی تھی۔ ۱۰۴۳ھ/۱۶۸۳ء میں وہ اپنی خانقاہ دھنتی میں درویشوں اور طالبانِ حق کی روحانی تربیت میں مصروف تھے۔[۱]

شیخ عبدالرحمٰن چشتی اور جہانگیر بادشاہ کے تعلقات

شاہانِ مغلیہ میں اکبر بادشاہ اپنی وسیع المشربی کی وجہ سے ہر مذہب و ملّت کے عالموں اور دینی پیشواؤں سے ملتا تھا اور اُن سے اُن کے ادیان کے بارے میں بحث و مباحثہ کے ذریعہ معلومات حاصل کیا کرتا تھا۔ چوں کہ ملا عبدالقادر بدایونی، شیخ ابوالفضل، شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے اکبر کے مذہبی عقائد کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی ہے اس لئے اس بحث کا اعادہ کرنے کی یہاں ضرورت نہیں معلوم ہوتی[۲]۔ جہانگیر بادشاہ نے اپنے والد کے مذہبی عقائد اور اُس کے مسلک کو بہت سراہا ہے[۳] اور اپنے والد کے اصولوں کی پیروی کو اُس نے اپنا نصب العین بنا لیا تھا۔ اس لئے خود وہ بھی مختلف مذہبی فرقوں کے علماء و صلحاء سے ملتا اور ان کے دینی اور روحانی موضوعات پر گفتگو کیا کرتا تھا۔ اس نے خود لکھا ہے کہ اُسے جوگیوں اور سنیاسیوں سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے بالخصوص جدروپ گسائیں کا ذکر کیا ہے جو اُجین شہر سے باہر

---

[۱] مرآۃ عالم۔ ۲۲۱ الف و ب۔ مرآۃ جہاں نما۔ ۳۲۳ ب۔ مولوی اسلم بن حفیظ اللہ۔ فرحت الناظرین مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ) ص ۱۹۵ الف و ب

[۲] تفصیلی مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو۔ پروفیسر محمد اسلم۔ دینِ الٰہی اور اس کا پس منظر (مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء)

[۳] تزک جہانگیری (سرسید احمد خاں ایڈیشن) ص ۱۶

[۴] برائے تفصیل دیکھئے تزک جہانگیری، ص ۱۷۵-۱۷۶

جا کر ریگستان میں دور ایک کونے میں سوراخ نما ایک غار میں عبادتِ الٰہی میں مصروف رہا کرتا تھا۔ جب جہانگیر کو جدروپ کے بارے میں علم ہوا تو اس کے دل میں اس سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ پہلے تو اس نے انھیں اپنے دربار میں بلانا چاہا لیکن اس خیال سے کہ انھیں زحمت ہوگی، ارادہ ترک کر دیا، سیر و سیاحت کے موقع پر جب جہانگیر اجین پہنچا تو وہ جدروپ سے ملنے گیا۔ جہانگیر نے جدروپ کی قیام گاہ[۱] اس کے حلیہ اور اس کی ریاضتِ شاقہ کے بارے میں روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بیان کے مطابق جدروپ صرف ایک لنگوٹی باندھے رہتا تھا ورنہ اس کا سارا جسم برہنہ ہوتا تھا۔ موسمِ سرما میں بھی وہ الاؤ نہیں جلاتا تھا بلکہ روزانہ دو مرتبہ غسل کیا کرتا تھا[۱]۔ دوسری باتوں کے علاوہ جہانگیر جدروپ کے بارے میں لکھتا ہے:

"خالی از دانش نیست۔ علم بیدانت را کہ علم تصوف باشد خوب ورزیدہ۔ تا شش گھڑی با و صحبت داشتم، سخنان خوب مذکور ساخت چنانچہ خیلی در من اثر کرد۔ او را ہم صحبت من در افتاد"[۲]

چوں کہ پہلی ملاقات میں جہانگیر کی تشفی نہ ہوئی اس لئے وہ دوسری مرتبہ جدروپ کی خدمت میں حاضر ہوا[۳] اس کے بعد بھی وہ مطمئن نہ ہوا اور تیسری مرتبہ پھر اس سے ملنے گیا اور جدروپ کی زبانی حقائق اور معارف کے کلمات سنے۔ اس کے بعد جدروپ نقلِ سکونت کر کے متھرا چلا آیا تھا۔ جمنا ندی کے کنارے ایک کٹی میں وہ سکونت پذیر تھا اور یادِ الٰہی میں منہمک رہتا تھا۔ چوں کہ جہانگیر جدروپ کی ذات سے بہت متاثر ہوا تھا اس لئے وہ اس سے ملنے متھرا گیا اور تخلیہ میں کافی دیر تک اس سے فیوض حاصل کرتا رہا۔ جدروپ کے بارے میں جہانگیر نے اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ

---

[۱] برائے تفصیل دیکھیے تزکِ جہانگیری۔ ص ۱۷۶۔
[۲] ایضاً۔ ۲۵۱۔ ۲۵۲
[۳] ایضاً۔ ص ۲۵۲۔ ۲۵۳

میں کیا ہے۔

"الحق کہ وجودش بغایت مغتنم است۔ در مجلس او محظوظ و مستفید می تواں شد[1]"

چار مرتبہ گوسائیں کی خدمت میں حاضر ہو کر بھی جہانگیر کو قلبی سکون نصیب نہ ہوا اور روز بروز اس کے دل میں اس سے ملنے کی خواہش بڑھتی ہی رہی۔ اس لئے جہانگیر پانچویں بار پھر اس کی خدمت میں حاضر ہوا[2]۔ اس ملاقات کے علاوہ جہانگیر نے جدروپ سے ایک بار اور ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ اس نے خود لکھا ہے:

"دباز بملاقات گسائیں رفتہ از وداع شدم۔ بی تکلف جدائی از صحبت او بر خاطر حقیقت گزیں گرانی نمود[3]"

جہانگیر، جدروپ کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ اس کے کہنے پر اس نے ایک سیر کا وزن ۳۶ دام کے برابر مقرر کیا تھا۔ جہانگیر رقم طراز ہے:

"در عہد دولت حضرت عرش آشیانی انار اللہ برہانہ وزن سیر سی دام بود مقارن ایں حال بخاطر گذشت کہ خلاف ضابطہ ایشاں چرا باید کرد۔ اولی آنکہ بدستور سابق سی دام باشد۔ روزی گسائیں جدروپ بتقریبی گفت کہ کتاب بید کہ احکام دین ما در آنجا مثبت است وزن سیر را سی و شش دام نوشتہ اند۔ چوں از اتفاقات غیبی حکم شما نیز کہ در کتاب ماست مطابق افتاد۔ اگر ہماں سی و شش دام مقرر فرمایند۔ بہتر خواہد بود۔ حکم شد کہ بعد ازیں در تمام ممالک سی و شش دام معمول باشد[4]"

[عرش آشیانی (اکبر بادشاہ) کے عہد میں ایک سیر کا وزن تیس دام کے وزن کے برابر تھا۔ اس کے لحاظ سے دل میں یہ خیال آیا کہ ان کے ضابطے کی خلاف ورزی کیسے کی جائے۔ بہتر تو یہی ہو تاکہ پہلے کی طرح ایک سیر کا وزن تیس دام کے برابر ہی رہنا چاہیئے۔ دوران گفتگو ایک دن جدروپ نے کہا کہ بید میں، جس میں ہمارے دین کے احکام

---

[1] تزک جہانگیری۔ ص ۲۷۹ [2] ایضاً۔ ص ۲۷۹۔ ۲۸۰ [3] ایضاً۔ ص ۲۸۰

[4] ایضاً۔ ص ۲۸۱

قلم بند ہیں، ایک سیر کا وزن ۳۶ دام کے برابر لکھا ہے۔ چوں کہ اتفاقِ غیبی سے آپ کا حکم اُسی کے مطابق صادر ہوا ہے جیسا کہ ہماری کتاب میں ہے، اگر ۳۶ دام مقرر کر دیں تو بہتر ہوتا۔ (اس لئے) شاہی حکم صادر ہوا کہ آج سے سارے ملک میں ایک سیر کا وزن ۳۶ دام کے برابر ہو گا)۔

جہانگیر صوفیہ کرام اور علماء سے بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا، ان کا احترام کرتا اور ان کی خدمت کرنا اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتا تھا۔ وہ دینی معاملات میں ان سے گفتگو کیا کرتا تھا۔ میاں میر قادری (متوفی ۱۶۳۵ء) سے جہانگیر کے اچھے تعلقات تھے۔ لاہور میں وہ میاں میر کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ بادشاہ نے دو خط اُنھیں لکھے تھے[۵]۔ جہانگیر نے چار عالموں پر مشتمل ایک بورڈ بنایا تھا جن سے وہ دینی مسائل میں رجوع کیا کرتا تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی رقمطراز ہیں۔

"شنیدہ شد کہ بادشاہِ اسلام از حُسنِ نشاء مسلمانی کہ در نہاد خود دارند بایشاں (مرتضیٰ خاں شیخ فرید بخاری) فرمودہ اند کہ چہار کس از علماء دیندار بیدا کنند کہ ملازم باشند و بیانِ مسائل شرعیہ میکردہ باشند تا خلافِ شرع امری واقع نشود"[۲]۔

جہانگیر نے آخری زمانے میں حضرت مجدد صاحب سے بھی اپنے تعلقات استوار کر لئے تھے اور تخلیہ میں ان سے دینی اور باطنی مسائل کے بارے میں گفتگو کیا کرتا تھا[۳]۔ اسی طرح جہانگیر، قاضی نصیر الدین برہانپوری کا بڑا احترام کرتا تھا اور جب قاضی موصوف دربارِ شاہی میں پہنچے تو جہانگیر اس بات کا خیال کئے بنا کہ وہ بادشاہِ وقت ہے قاضی صاحب کو گلے سے لگا لیا[۴]۔

---

[۱] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ دارا شکوہ۔ سکینۃ الاولیا (مطبوعہ ایران) ص ۴۷ - ۴۸
[۲] مکتوباتِ امام ربانی (نول کشور۔ لکھنؤ ۱۸۷۷ء) مکتوب ۵۳ ص ۷۰ (جلد اول)
[۳] ایضاً، جلد سوم۔ مکتوب ۴۳۔ "در مخدوم زادہ حضرت خواجہ محمد معصوم و خواجہ محمد سعید در بیان مکالماتے کہ در وقت محفلِ سلطانِ وقت گذشتہ" ص ۷۶ نیز مکتوب ۴۷۔ ص ۹۲
[۴] مرآۃ عالم۔ ص ۲۲۵ الف و ب۔ نیز رحمان علی۔ تذکرہ علمائے ہند (مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۱۴ء) ص ۲۲۸ - ۲۲۹۔

جہانگیر ایسے صوفیہ کی بھی سرپرستی کیا کرتا تھا جو ہندوستانی تصوف اور ادیان کا علم رکھتے تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ شیخ عبدالرحمن چشتی کو جہانگیر کے دربار میں رسائی حاصل تھی اور بارہا انھیں دربار شاہی سے مالی انعامات ملتے تھے[1]۔ قرین قیاس ہے کہ جہانگیر نے شیخ عبدالرحمن چشتی کو اسلامی اور ہندو تصوف کے بارے میں معلومات حاصل کرنے اور اُن کی علمی کتابوں کے مطالعہ کی خدمت پر مامور کیا تھا۔ شیخ عبدالرحمن نے خود لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جہانگیر نے اُنھیں کوہ شمالی (کمایوں) کی طرف بھیجا تھا۔ عبدالرحمن چشتی نے وہاں جانے کے اپنے مقصد کے بارے میں خاموشی سے کام لیا ہے لیکن اگر جہانگیر کی سیاسی حکمت عملی کے پس منظر میں اس وفد کے مقصد کو تلاش کیا جائے تو اس کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں۔ جہانگیر نے یہ حکمت اپنائی تھی کہ راجپوتوں کی فوجی طاقت کو کمزور کیا جائے اور مغلیہ سلطنت میں ان کے اثرات کو کم کیا جائے۔ کیوں کہ ان کے بڑھتے ہوئے اثرات کی بنا پر ایرانی اور تورانی امرا میں بے اطمینانی پھیل رہی تھی۔ اس لئے اس نے بندیلہ سرداروں کی سرپرستی کی اور اُنھیں اعلیٰ مناصب دیئے۔ مثلاً بیر سنگھ بندیلہ کو اس نے سہ ہزاری منصب عطا کیا تھا[2] یہ وہی بیر سنگھ بندیلہ تھا جس نے جہانگیر کی ایما پر شیخ ابوالفضل کو قتل کیا تھا۔ دوسری طرف اس نے کمایوں کے زمینداروں اور راجاؤں سے خوش گوار تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ اسی مقصد کے تحت جہانگیر نے عبدالرحمن چشتی کو اُن راجاؤں میں سے کسی راجا کے دربار میں بحیثیت سفیر بھیجا ہو۔ یہی بات زیادہ قرین قیاس ہے اور یہی مقصد بھی ثابت ہوتا ہے۔ ساتھ ساتھ عبدالرحمن چشتی نے اس موقع پر لجاریہ مُنی بھدرہ ایک ہندو برہمن سے بھی ملاقات کی تھی[3] جو ایک ہندو راجا کے دربار سے وابستہ تھا۔ عبدالرحمن چشتی نے لکھا ہے

---

[1] مرآۃ جہاں نما۔ ص ۲۲۳ ب

[2] تزک جہانگیری۔ ص ۱۰

[3] عبدالرحمن چشتی۔ مرآۃ مسعودی۔ ص ۵۰-۵۱

کہ وہ راجا شہر دیو کی اولاد میں سے تھا جس سے جنگ کرتے ہوئے سلطان الشہدا سالار مسعود غازی شہید ہوتے تھے۔

شیخ عبدالرحمٰن چشتی اور اچاریہ منی میں جو گفتگو ہوئی تھی وہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے اس لئے اس کا یہاں مجملاً ذکر کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا۔ شیخ عبدالرحمٰن نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے اس وقت تک مہابھارت نامی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ دورانِ گفتگو میں حسنِ اتفاق سے اچاریہ سے سلطان الشہدا سالار مسعود غازی کا تذکرہ آگیا۔ چوں کہ اچاریہ کو مہابھارت کے علوم پر پوری قدرت حاصل تھی۔ اس لئے اس نے سلطان الشہدا کی ہندوستان میں آمد سے ان کی شہادت تک کے حالات اور ان تمام جنگوں کا جو انھوں نے کافروں سے لڑی تھیں، اپنی تواریخ کی روشنی میں تفصیل سے ذکر کیا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ جب رائے شہر دیو[1] سالار مسعود غازی کو شہید کرنے میں کامیاب ہوگیا اور واپس اپنے پڑاؤ میں آیا تو آدھی رات کو سالار مسعود غازی خواب میں اُسے نظر آئے اور اس سے کہا کہ "تم نے تو مجھے قتل کر دیا، کیا تم اور زندہ رہنا چاہتے ہو۔؟ یہ مردوں کا کام نہیں ہے"۔ اس خواب کی گفتگو سے رائے شہر دیو کو بڑی غیرت آئی۔ دوسرے دن وہ پھر میدانِ جنگ میں گیا اور سالار مسعود غازی کے رفقا سے جنگ کرتا ہوا کام آیا۔

چند دنوں کے بعد جب شیخ عبدالرحمٰن چشتی کو ملا محمد غزنوی کی نوشتہ تواریخ دستیاب ہوئی تو مطالعہ کے دوران اس نے اس کتاب میں سلطان الشہدا کی کافروں سے جنگوں کی ہو بہو وہی تفصیل قلم بند پائی جیسی کہ اس برہمن نے ہندوستان کی تواریخ کی روشنی میں بیان کی تھی[2]۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ عبدالرحمٰن چشتی کو غالباً ایام شہزادگی میں شاہ جہاں

---

[1] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ تاریخ سالار مسعود غازی (مطبع مجتبائی، لکھنؤ) ص ۶۹ مابعد

[2] مرآۃ مسعودی۔ ص ۵۰۔۵۱

کی سرپرستی بھی حاصل تھی - اس لئے وہ شہزادے سے بڑی دلچسپی رکھتا تھا اور اس کے دل میں یہ خواہش کارفرما تھی کہ اُسے جہانگیر کا جانشین ہونا چاہئے - شیخ عبدالرحمن نے اس واقعہ کا یوں ذکر کیا ہے کہ ۱۶۲۷ء میں وہ سید اشرف جہانگیر سمنانی کے مزار پر حاضر ہوا اور وہاں معتکف ہوگیا - اس حالت میں اس نے خضر علیہ السلام اور امیرالمومنین حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ کو دیکھا کہ انھوں نے ایک بالا قد اور خوبرو نوجوان کو حضرت رسالت پناہ کے قدموں پر ڈال دیا - اور عرض کیا "ہندوستان کے بادشاہ جہانگیر کو مرض لاحق ہوگیا ہے اور چند دنوں میں وہ اس دنیا سے رخصت ہوجائے گا - اس کے بیٹوں میں صرف یہی نوجوان ایسا ہے جس میں حکومت کرنے کی صلاحیت اور قابلیت پائی جاتی ہے"۔ حضرت رسالت پناہ نے اس نیک بخت نوجوان کی پشت پر اپنا دستِ مبارک پھیرا اور فرمایا - "تم اپنے والد کے قائم مقام ہوگے" اس طرح حضرت رسالت پناہ نے اپنی انتہائی مہربانی سے شاہ جہاں کو خواجگانِ چشت کے حوالے کردیا تاکہ وہ اس اقبال مند شہزادے کو اپنی حفاظت میں رکھیں اور اس فقیر (شیخ عبدالرحمن چشتی) کو اس معنوی خدمت کے لئے مقرر فرمایا - اس موقع پر خواجگانِ چشت[1] نے اس نوجوان کی مملکت اور اس کی جان کے تحفظ کے لئے اس فقیر کو نامزد کیا - اور اس نوجوان کی محافظت کے لئے سات ابدالوں میں سے ایک ابدال کو مقرر کیا جو کوہِ شمال میں رہتا تھا اور اس کا نام شیخ فیروز

---

[1] چشتی سلسلے کے بزرگوں اور بالخصوص خواجہ معین الدین چشتی اجمیری سے شاہ جہاں بڑی عقیدت رکھتا تھا اور خواجہ صاحب کے مزار پر زیارت کے لئے جایا کرتا تھا اور مراسم زیارت و شرائط نیازمندی سے ادا کرنے کے بعد مزار فائض الانوار کے معتکفوں، مجاوروں اور وہاں کے تمام مستحقوں کو نذور اور صدقات دیا کرتا تھا - خواجہ صاحب کی برکت سے دارا شکوہ کی ولادت ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں شاہ جہاں، قادری سلسلے کے بزرگوں سے بھی عقیدت رکھتا تھا اور دو مرتبہ میاں میر کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔

برائے تفصیل ملاحظہ ہو - سکینۃ الاولیا - ۴۸ - ۴۹؛ محمد صالح کنبوہ عمل صالح موسوم شاہ جہاں نامہ (مجلس ترقی ادب، لاہور) جلد سوم، ص ۱۹۰ - ۱۹۱ / ۳۵۷ - ۳۶۰ - میرزا محمد عرف معتمد خاں - اقبال نامہ جہانگیری (اردو ترجمہ) نفیس اکیڈیمی، کراچی (۱۹۶۳ء) ص ۲۶۷ - ۲۶۸

درویش تھا۔ تین سال بعد ۱۶۲۷ء میں جہانگیر نے وفات پائی۔ اور حضرت شہاب الدین محمد شاہ جہاں صاحب قرآن کے لقب سے اس نوجوان نے تخت شاہی پر جلوس فرمایا[1]

وفات | شیخ عبدالرحمن چشتی نے ۱۶۸۲ء یا ۱۶۸۳ء میں وفات پائی تھی اور دھنتی نامی قریہ میں اپنے ہی مسکن کے احاطے میں اُن کو دفن کیا گیا تھا[2]۔

تصانیف | شیخ عبدالرحمن چشتی کی سات تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔ اُن میں سے بیشتر صوفیہ کرام کی سوانح عمریوں پر مشتمل ہیں اور بعض مقامات پر تصوف کے اسرار و معارف پر بحث بھی کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ کتابیں اہمیت رکھتی ہیں اور اس دور میں ہندوستان کے صوفیہ کرام کے دوسرے مذاہب کے بارے میں رجحانات کا بھی علم ہوتا ہے۔ شیخ عبدالرحمن نے مرآۃ المخلوقات کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اُس دور میں صوفیہ کرام دوسرے مذاہب کی اچھی باتوں کو اپنا لینے میں گریز نہیں کرتے تھے۔

(۱) مرآۃ الحقائق : یہ رسالہ بھگوت گیتا کا خلاصہ فارسی زبان میں ہے اور اس تصنیف کی وضاحت اسلامی نقطۂ نظر سے کی گئی ہے۔ مرآۃ الحقائق کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں موجود ہے اور ہندوستان میں ایک نسخہ آصفیہ لائبریری، حیدرآباد میں بھی ہے۔

(۲) نفائس الرحمانی یا انفاس رحمانی | یہ رسالہ طبع ہو چکا ہے۔ سنہ طباعت ۱۸۹۶ء یا ۱۸۹۰ء ہے ایک قلمی نسخہ آصفیہ لائبریری حیدرآباد میں ہے

(۳) اوراد چشتیہ | جیسا کہ اس رسالہ کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے اس میں چشتی سلسلے

---

[1] شیخ عبدالرحمن چشتی نے شاہ جہاں کا سنہ جلوس روز دوشنبہ ہشتم جمادی الثانی ۱۰۳۷ھ لکھا ہے۔ مرآۃ الاسرار ص ۳۰۶ الف و ب۔ عبدالحمید لاہوری نے بھی ہشتم ماہ جمادی الثانی سنہ جلوس لکھا ہے۔ بادشاہ نامہ۔ (کلکتہ۔ ۱۸۶۷ء) جلد اول ص ۱۲۹۔

[2] نزہۃ الخواطر۔ جلد پنجم ص ۲۱۳-۲۱۴

میں مروجہ وظائف اور اوراد کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ آصفیہ لائبریری حیدرآباد میں موجود ہے۔ ایک ناقص نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں بھی ہے۔

(۴) مرآۃ الاسرار۔ دور اول سے مولانا حسام الدین مانکپوری[1] تک بہت سے صوفیہ کرام کے حالات قلم بند ہیں۔ اس کتاب کی تصنیف کی ابتدا ۱۰۴۵ھ / ۱۶۳۵ء - ۱۶۳۶ء میں ہوئی تھی اور اختتام ۱۰۶۵ھ / ۱۶۵۴ء میں ہوا تھا۔ اس کتاب میں ایک دیباچہ ہے جس میں تصوف کے موضوع پر بحث کی گئی ہے، اس کے علاوہ روحانی معرفت کے مدارج اور سبب تالیف کتاب اور مشمولہ مضامین کے عنوانات درج ہیں۔ ایک مقدمہ بھی ہے جس میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جن چار افراد کو خرقۂ خلافت پہنچا تھا انھیں چہار پیر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ حضرت امام حسن، حضرت امام حسین، حضرت کمیل بن زیاد[2] اور خواجہ حسن بصری[3]۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن چشتی نے ابتدائی اور بنیادی صوفی خانوادوں کے ساتھ ساتھ بعد کے فروعی سلسلوں کا بھی مجملاً ذکر کیا ہے اُن کے علاوہ حضرات غوث، اقطاب اور دوسرے صوفیوں کے حالات قلم بند ہیں۔ یہ کتاب خاتمہ کے علاوہ ۲۳ طبقات پر مشتمل ہے اور ہر طبقے میں بعض اولیاء اللہ کے حالات درج ہیں۔ اور بعض مقامات پر ایک ہی جگہ پر چند بزرگوں کا اجمالی ذکر کر دیا گیا ہے اس کتاب کے قلمی نسخے ہندوستان کے کتب خانوں میں ملتے ہیں۔ ایک قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں بھی موجود ہے جس سے میں نے استفادہ کیا ہے۔ بقیہ صفحہ ۱۸۹ پر

---

[1] مولانا حسام الدین مانکپوری کی ولادت ۸۲۳ھ / ۱۴۲۰ء اور ان کا انتقال ۱۴۴۹ء میں ہوا تھا۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ گلزار ابرار۔ ص ۱۰۶-۱۰۷؛ اخبار الاخیار۔ ۲۱۳-۲۱۶؛ خزینۃ الاصفیا: جلد اول۔ ص ۴۰۰-۴۰۱

[2] حضرت علی بن ابی طالب کے ساتھیوں میں تھے۔ اپنی قوم میں شریف اور قابل اطاعت لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ جنگ صفین میں حضرت علی کے ساتھ شریک تھے عرصہ تک کوفہ میں رہے اور حدیثیں بھی روایت کیں۔ حجاج نے انھیں قتل کروا دیا تھا۔ ان کی ولادت ۱۲ھ / ۶۳۳ء میں اور ۸۲ھ / ۷۰۱ء میں وہ قتل ہوئے۔ دیکھئے۔ الاعلام۔ الزرکلی (مصر۔ ۱۹۵۵ء) جلد ششم۔ ص ۹۳

[3] خواجہ الحسن بن ابی الحسن البصری کی ولادت ۲۱ھ / ۶۴۲ء مدینہ منورہ میں ہوئی تھی۔ بعد میں انھوں نے بصرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ علوم ظاہری و باطنی میں جامع تھے۔ خرقۂ خلافت انھوں نے حضرت علی سے براہ راست پایا تھا۔ ۱۱۰ھ / ۷۲۸ء میں وفات پائی۔ مزار مبارک بصرہ میں ہے۔ برائے حالات دیکھئے۔ فریدالدین عطار۔ تذکرۃ الاولیاء (اردو ترجمہ) [illegible] جلد اول۔ ص ۲۴۲ - ۲۵۰؛ شیخ علی ہجویری - کشف المحجوب [illegible] ص ۹۱ - ۹۳؛ [illegible] ۱۸۰

۴۴

غالب اور منشی محمدی خادم بردوانی

مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی پروفیسر حدیث و تفسیر مدرسہ عالیہ کلکتہ

مغربی بنگال میں بردوان تیموری سلطنت کے زمانہ میں علم و ادب کا ایک قابل ذکر مرکز رہ چکا ہے۔ عہد جہانگیری کے حضرت حمید بنگالی (   ) جو علوم شریعت کے زبردست فاضل تھے، اور بالآخر مجدد الف ثانی کی نظر کیمیا اثر کے فیض سے عیار خالص بن کر چمکے، اسی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے۔ بہرام سقا یہیں پیوند خاک ہوئے جن کے شاعرانہ جوہر کی نمود دیوان دستیاب نسخوں سے ہوتی ہے۔ بوہار کے اولوالعزم زمیندار صدر الدین موسوی بوہاری (م ۱۲۱۱ھ ۱۷۹۶ء) کا مشہور مدرسہ جلالیہ اٹھارہویں صدی کا عظیم دار العلوم تھا جس میں علامہ عبد العلی بحر العلوم فرنگی محلی زینت آرائے مسند صدارت تھے۔ اور جہاں بیک وقت آٹھ سو طلباء کے قیام و طعام اور دوسرے تمام ضروریات کی کفالت تنہا بانی مدرسہ کی جانب سے ہوتی تھی۔ مقامی اور غیر مقامی علماء کی ایک منتخب ٹولی صرف نادر و کمیاب مخطوطات کی تلاش، نقل نویسی اور مقابلہ کی خدمت انجام دینے کے لیے ہمہ وقت اس دار العلوم سے وابستہ تھی۔

انیسویں صدی کے علماء، ادباء اور شعراء جو اس خطہ سے تعلق رکھتے تھے ان میں منشی محمدی بردوانی کی یگانہ ہستی بھی ہے، جو فارسی زبان کے کہنہ مشق شاعر اور بلند پایہ ادیب و نثر نگار تھے۔ تخلص خادم تھا اور غالباً پوری زندگی اتالیق و معلم کی حیثیت سے فارسی زبان و ادب کی خدمت میں بسر کی۔ خوش قسمتی سے ان کا مجموعۂ کلام یا دیوان ان کی زندگی ہی میں طبع ہوا۔ ان کے صاحبزادے

نجم الحق نے اسے مرتب کیا اور اس کا مقدمہ لکھا۔ خادم بردوانی کی زندگی کے بارے میں مختصر حالات کے لیے ہم زیادہ تر اسی مقدمہ کے مرہون ہیں۔ جو مندرجہ ذیل معلومات کا بیشتر حصہ فراہم کرتا ہے۔

خادم بردوانی، مہاراجہ مہتاب چند بہادر، والی بردوان کے اتالیق و استاذ تھے۔ (مہتاب چند کو سابق مہاراجہ تیج چندرا نے ۱۸۲۶ء میں منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا یہ دراصل مہارانی کمل کماری کے بھتیجے تھے، باپ کا نام پران چند بابو تھا۔ بہر حال مہاراجہ تیج چندرا کے فوت ہونے کے بعد (۱۸۳۲ء) مسند نشین ہوئے اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی خلعت دیا۔ ۱۸۵۵ء میں سنتھال تحریک کے مقابلہ میں مہتاب چند نے کمپنی کی بھرپور معاونت کی پھر ۱۸۵۷ء کے موقع پر کمپنی کی وفاداری میں پیش پیش رہے۔ اور ۱۸۸۱ء میں فوت ہوئے۔ یہ تاریخ بنگال ڈسٹرک گزیٹر کی رو سے ہے۔[۱] ورنہ بی۔ کے۔ موکرجی نے اپنے مقالہ ANNALS OF BURDWAN میں لکھا ہے کہ مہتاب چند کی عمر بوقت مسند نشینی بارہ سال کی تھی، لارڈ بینٹنک LORD BENTINCK نے مہتاب چند کے خطاب و منصب کی توثیق اپنے فرمان مورخہ ۳۰ اگست ۱۸۳۲ء کے ذریعہ کی تھی۔ ۱۸۴۴ء سے مہتاب چند خود تمام املاک کی راست نگرانی کرنے لگے، ورنہ اس سے قبل تک مہارانی کمل کماری اور اس کے بھائی پران چند بابو کی مشترکہ سرپرستی کے تحت نظم و انصرام ہوتا رہا تھا۔ مہتاب چند، ۴۴ سال گدی پر براجمان رہ کر ۱۸۷۹ء میں فوت ہوئے۔[۲] انھوں نے بردوان میں ایک فری انگلش اسکول جاری کیا، ایک دواخانہ غرباء کے علاج معالجہ کے لیے قایم کیا۔ اور رامائن، مہابھارت وغیرہ کے معتبر تراجم کی اشاعت اور ان کے نسخوں کی مفت تقسیم کا اہتمام الگ کیا۔) بظاہر مہاراجہ نے اپنے اتالیق کے حق استاذی کی نگہداشت مدۃ العمر باقی رکھی۔ مہاراجہ کا اسکول جو بردوان میں تھا اس میں فارسی زبان و ادب کے استاذ کی حیثیت سے خادم مصروف درس و تدریس رہے۔ خوشنویسی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے

---

[۱] دیکھیے۔ J.C.K. PETERSON: BENGAL DISTRICT-GAZETTERS BURDWAN: P.P 38-39, CALCUTTA, 1910

[۲] ملاحظہ ہو: B.K. MUKERJIS: ANNCIS OF BURDWAN (CALCUTTA REVIEW: VOL. 259, P.P. 127-129) CALCUILA-1910

اور فرصت کے اوقات میں خط نستعلیق کی مشق سے جی بہلاتے تھے۔ بلکہ فکر شعر و شاعری پر خوشنویسی کی مشق کو ترجیح دیتے تھے۔ غالباً یہ اواخر عمر کی بات ہے جبکہ تجربہ و کہن سالگی کے نتیجہ میں رسمی و مروجہ شاعری یا نظم نگاری کے عیوب ان پر کھل چکے تھے۔ ویسے دیوان کی ضخامت اور مشمولہ کلام پر طائرانہ نگاہ ڈالنے سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کو ایک عرصہ تک شعر گوئی میں انہماک رہ چکا ہے۔

دیوان شاہد ہے کہ فارسی زبان جیسے خادم کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ہندوستان کے فارسی گو شعراء بالعموم اپنا جو مقام رکھتے ہیں خادم بردوانی اس سے کمتر کسی بات میں نہیں ہیں۔ دیوان کا بڑا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے، قصائد، قطعات اور مثنویاں بھی ملتی ہیں۔ زبان سہل، سلیس اور پاکیزہ ہے۔ تعقید اور صنعتی تکلفات سے پاک صاف؛ خیالات عام روش سے اگرچہ الگ نہیں تاہم کہیں کہیں بلند پروازی بھی ملتی ہے۔ طرز ادا سنجیدہ اور دلکش ہے۔ غرض پورا دیوان زبان و بیان کے لحاظ سے شاعر کی کہنہ مشقی اور حسن مذاق پر شاید عدل ہے۔ گاہ بگاہ شاعرانہ 'انانیت' زمزمہ پردازی سے باز نہیں آتی؛ لیکن اس میں بھی اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ ایسے موقوں پر وہ اپنے مرز بوم بردوان کو نہیں بھولتے اور اس سے اپنی فطری محبت کا اظہار بے ساختہ کرتے ہیں۔ چند اشعار اس سلسلہ کے درج ذیل ہیں :-

بردوان و من و ایں طرز فصاحت خادم ورنہ از خاکِ صفاہان و نہ از شیرازم (دیوان ص ۱۸۳)

ایک جگہ مختلف انداز بیان میں کہا ہے :-

چناں از نظم خادم بردواں مشہور شد کانیکسا نمی آرد کسے برلب دگر ذکر صفاہاں را (دیوان ص ۲۴۴)

یہی انداز کچھ اور بدل جاتا ہے، ملاحظہ ہو :-

خادم احزوز از کلام تو بردواں مشتہر چو شیراز است (ر ص ۶۱)

پھر اسی مضمون کو کچھ اور دلکش انداز میں ادا کرتے ہیں :-

کسے ز خادم واز بردواں اگر پرسد بگوئے صاف کہ آں بلبل ایں گلستانست (ر ص ۲۹)

بہرحال ہمارا شاعر بردوان سے دست کش ہونا تصور میں نہیں لاتا جبکہ اس کا عظیم معاصر غالب

اسی مضمون کو جب باندھتے ہیں تو اپنے موارد فشار کو نظر انداز ہی نہیں کرتے بلکہ جوشِ 'انانیت' میں ایسا انداز اختیار کرتے ہیں جس سے بظاہر وطن بیزاری ٹپکتی ہے، فرماتے ہیں:۔

غالب ز ہند نیست نوائے کہ می کشم   گوئی ز اصفہان و ہرات و قمیم ما (کلیات غالب ص۲۵)

یا پھر اس طرح زمزمہ سنج ہوتے ہیں:۔

غالب سخن از ہند بروں بر کہ کس اینجا   سنگ از گہر و شعبدہ ز اعجاز ندانست (کلیات ص۶۸)

اور کبھی یوں نغمہ سرائی کرتے ہیں:۔

بود غالب عندلیبے از گلستانِ عجم   من ز غفلت طوطیِ ہندوستاں نامیدمش (ر ص۱۵۶)

اور بالآخر یہاں تک فرما دیا کہ:۔

غالب از آب و ہوائے ہند بسمل گشتہ نطق   خیز تا خود را بہ اصفاہان و شیراز افگنم (ر ص۱۹۳)

شدت انانیت کا یہ عالم بادی النظر میں فنکار کی سقیم ذہنیت کا آئینہ دار ہے، جس سے بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ بہر حال اس طوطیِ ہندوستان کا کلیات عجب نہیں کہ خادم کی نظروں سے گزرا ہوگا۔ غالب کا کلیات ۱۸۴۵ء میں مطبع دار السلام دہلی سے اور ۱۸۶۳ء میں نول کشور کے مطبع سے چھپ کر عام ہوا۔ ان میں سے کوئی ایک ایڈیشن مغربی بنگال کے اس طوطیِ شکر مقال کے کام و دہن کے لیے ذوق بخش ہوا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی زمین میں ہمارے بردوانی شاعر نے کبھی کبھی طبع آزمائی کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے غالب کی غزل جوان اشعار پر ختم ہوتی ہے:۔

بعد از حزیں کہ رحمتِ حق بر روانش باد   ما کردہ ایم تربیت فن دریں چہ بحث (کلیات ص۹۲)

ادجستہ جستہ غالب و من دستہ دستہ ام   عرفی کسے است لیک نہ چوں من دریں چہ بحث (ر ص۹۳)

اب غور فرمائیے 'طوطیِ بنگالہ' نے کس شان سے ہم صفیری کی ہے:۔

گر ساختم بمیکدہ مسکن دریں چہ بحث   بتخانہ شد چو جائے برہمن دریں چہ بحث

خواہ از ستم بگیر دلم یا ز روئے لطف   از آنِ تست اے بتِ پُر فن دریں چہ بحث (دیوانِ خادم ص۹۲)

ہاں دم مزن ز آتش عشق ار دلت بسوخت — آتش در او فتاد بخرمن دریں چہ بحث

در فصل گل کہ جوش جنون است ناصحا — چاکی اگر زدیم بدامن دریں چہ بحث

بر شعر من کہ دوست پسندی ہمی کند — گر اعتراض رفت ز دشمن دریں چہ بحث

رد و قبول خلق چو یکسو نہادہ ایم — گر نشنوم ز شیخ و برہمن دریں چہ بحث

خادم چہ ہرزہ گوئی غالب کہ گفتہ است — (عرفی کسے است لیک نہ چوں من دریں چہ بحث) (دیوان خادم ص۹۴)

عرفی کے ساتھ ایسی عقیدت کیشی جس کے نتیجہ میں غالب کو "ہرزہ گو" کہنے میں بھی باک نہیں کیا گیا حق پسندی کے علاوہ جوان خون کی سرخی کا پتہ دیتی ہے۔ ورنہ خادم کو غالب سے کچھ کم عقیدت نہیں تھی۔ ایک دوسری غزل ملاحظہ فرمائیے جو غالب ہی کی زمین میں ہے، غالب کا مطلع حسب ذیل ہے:۔

جنوں مستم بفصل نو بہارم می تواں کشتن — صراحی بر کف و گل در کنارم می تواں کشتن (کلیات ص۱۹۴-۱۹۵)

خادم کی غزل یہ ہے:۔

دلم پر داغ شد در لالہ زارم می تواں کشتن — ز گلشن بیروں و برکو ہسارم می تواں کشتن

بجرم اینکہ از من راز عشقش آشکارا شد — سر بازار یا بر رہ گذارم می تواں کشتن

بیاد آں گل روش کہ ہر دم گریہ یادارم — بروز بارش ابر بہارم می تواں کشتن

بشہد بے تکلف در لباس خاکسارانم — کنوں از نطع بر روئے غبارم می تواں کشتن

بمن کامشب نمودی وعدہ از وصل دائم — کہ آخر تا سحر در انتظارم می تواں کشتن

بمر قدری کند ہنگامۂ پروانہ بیدارم — حریفاں بعد ازیں شمع مزارم می تواں کشتن

مکش دست از جفا چوں منے چنداں کہ میخواہی — اگر زاں شکوہ بر لب گذارم می تواں کشتن

زمان وصل آخر شد و قدر آں ندانستم — بجرم غفلت آں روزگارم می تواں کشتن

بگرید تا کسے برحال من چوں غالب اے خادم
(جدا از خانمان دو ماز دیارم می تواں کشتن) (دیوان ص۱۸۹-۱۹۰)

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، خادم مرزا غالب کے معتقدین میں تھے۔ مرزا کی زندگی کا آفتاب

ڈھل چکا تھا، جب خادم کے لیے ایک لمبے سفر کی تقریب پیدا ہوئی۔ دہلی کی سیر کا موقع ہاتھ آیا اور خوش قسمتی سے غالب یگانہ کی دید و شنید سے شادکام ہو کر لوٹے تقریب سفر کی بابت دیوان کے مرتب نجم الحق کا بیان ہے کہ مہاراجہ پٹیالہ کی کتخدائی کے موقع پر ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) میں مہاراجہ بردوان نے اپنے خدم حشم کے ساتھ اس دعوت میں شرکت کی۔ اور اپنے استاذ منشی محمدی خادم کو بھی ہمراہ چلنے کے لیے آمادہ کیا۔ بلکہ خود نجم الحق بھی اس سفر میں ساتھ گئے۔ اصل الفاظ یہ ہیں:۔

"در ۱۲۸۱ ہجری یک بار مہاراجہ مہتات چند بہادر والی بردوان کہ شاگرد شان بودند، مدعوت شادی مہاراجہ پٹیالہ مع سواران وغیرہ باسامان شائستہ فرستادند، بندہ ہم ہمرکاب بود۔ دران جا اتفاق ماندن بست و پنج روز شدہ بود (مقدمہ دیوان خادم: ص ۴) دیوان میں ایک قصیدہ ملتا ہے۔ جس کی سرخی ہے: قصیدۂ تہنیت شادی راجہ پٹیالہ (ص ۱۴) لیکن اس کا مطلع ہی اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے کہ سرخی قایم کرنے میں مرتب دیوان سے غلطی ہو گئی ہے، مطلع یہ ہے:۔

زآسمان و زمیں شور تہنیت برخاست کہ جشن صدر نشینی راجہ والا ست۔

قصیدہ میں کل ۳۳ بیت ہیں لیکن کسی ایک بیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قصیدہ کا تعلق جشن کتخدائی سے ہے مطلع خود پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ موقع مسند نشینی کا تھا نہ کہ جشن شادی۔ مہاراجہ پٹیالہ مہندر سنگھ بہادر کی تاریخ مسند نشینی بہ قول خلیفہ سید محمد حسن خاں، وزیر اعظم ریاست پٹیالہ ۲۹ رجنوری ۱۸۶۲ء ہے۔ دس برس چار مہینے بارہ دن کی عمر میں تخت ریاست پر بیٹھے۔ یہ رسم بڑی شان و شوکت سے منائی گئی۔ بنارس، بردوان وغیرہ ریاستوں کے اہل کار... اور روسا شریک دربار ہوئے[1] بہرحال اس موقع پر منشی محمدی خادم کا شریک ہونا ثابت نہیں ہے۔ قصیدہ میں ذیل کے اشعار ہماری تائید میں ہیں:۔

بہ بزم مت از رسیدم بقائے عمر تو یاد برائے تہنیت تو ہمی قصیدۂ ماست
چو نامۂ تو در آمد بہ پیش آقا یم نمود امر کہ ہاں پاسخش بکن آراست
پس از فراغت آں یک بیک ز جوش سرور پس ایں نوائے مدیح تو از دلم برخاست
کنوں بمجلس تو می کنم رواں بر گیر کہ ایں عروس بصد زینت است بے کم و کاست

---

[1] دیکھیے خلیفہ سید محمد حسن، تاریخ پٹیالہ ص ۵۲۸-۵۲۹، مطبوعہ امرتسر، سفیر ہند پریس ۱۸۷۸ء

صاف معلوم ہوا کہ جشن مسند نشینی جو اس قصیدہ کا صحیح عنوان ہے، اس میں خادم شریک دربار نہیں تھے۔ البتہ انھوں نے بطور خود اپنا مدحیہ قصیدہ ضرور بھیجا تھا۔ جب مرتب یا مطبع کی غلطی سے (تھنیت شادی راجہ پٹیالہ) کے زیر عنوان درج ہوگیا ہے۔ تھوڑے عرصہ بعد مہاراجہ مہندر سنگھ کی شادی سرہند میں ۵ر مارچ ۱۸۶۵ء میں بڑے دھوم دھام[1] سے ہوئی۔ جس میں خادم اپنے لڑکے نجم الحق کے ساتھ شریک ہوئے۔ اور یقیناً اس موقع پر خادم نے الگ قصیدہ پیش کیا ہوگا۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ قصیدہ دیوان کے مطبوعہ نسخہ سے خارج رہ گیا ہے۔ اور اب اس کا سراغ نہیں ملتا۔

خادم کے مذکورۂ بالا قصیدہ کی شہادت ہے کہ انھوں نے سابق مہاراجہ نریندر سنگھ آف پٹیالہ کی مدح میں بھی کم از کم ایک قصیدہ لکھا تھا جس پر مہاراجہ کی طرف سے تین ہزار کی گراں قدر رقم ملی تھی۔ مہاراجہ نریندر سنگھ کی قدردانی و کشادہ دستی کا ثبوت یہ ہے کہ اتنی ہی رقم ان کی طرف سے سید کو بھی ایک قصیدہ کے صلہ میں ملی تھی جو لندن سے بھیجا گیا تھا۔ غالباً سید سے مراد سر سید احمد خاں[2] کے علاوہ کوئی بزرگ ہیں، جن کا تعین سردست نہیں ہوسکا بہر حال ملاحظہ فرمائیے مندرجہ ذیل ابیات:۔

زبخشش پدر تو چہا کنم اظہار ۔۔۔ کہ سہ ہزار درم بذل او بوجہ صلاست
ہماں قصیدہ کہ سید نوشت از لندن ۔۔۔ ہمیں صلاش فرستاد یارب ایں چہ صلاست

مطبوعہ نسخہ اس قصیدہ سے بھی خالی ہے۔

پٹیالہ میں خادم کا قیام ۲۵ دن رہا۔ نجم الحق رقمطراز ہیں کہ اس کے بعد مہاراجہ بردوان سے خادم نے مراجعت وطن کی اجازت لی اور واپسی میں علی گڑھ (کول)، کی آب و ہوا جو پسند آئی تو یہاں بھی ہفتہ بھر قیام کیا پھر دہلی کا رخ کیا اور مہینہ بھر دہلی میں مقیم رہے اس عرصہ میں مرزا غالب سے ملاقاتوں کا سلسلہ رہا۔ ایک موقع پر مرزا کی فرمائش سے اپنی تازہ غزل سنائی اس کے ایک شعر پر مرزا نے خوش ہو کر بہت داد دی۔ دیباچہ میں صرف منتخب بیت کا اندراج ہے، یہاں پوری غزل نقل کی جاتی ہے:۔

کس با آرام نہ از گردش ایام نشست ۔۔۔ ہر کس از پنجۂ ظلمش بدل چاک نشست

---

[1] ایضاً، تاریخ پٹیالہ صفحہ ۵۴۸ [2] سر سید احمد مرحوم کے سفر لندن کی تاریخ اپریل ۱۸۶۹ء ہے (دیکھئے، حیات جاوید صفحہ ۱۵۰)

بہر تعظیم خیالش کہ چو آمد ز ادب ‌ اشکم از دیدہ بروں آمد و برخاک نشست

سرکشی آورد آخر ز بلندی درپست ‌ تیر بر باد ببالا شد و برخاک نشست

بعد ازیں باک نہ دارم ز رقیب بد خو ‌ یار در خانۂ من آمد و بیباک نشست

خادم اینک دگر از عذر نخواہی برخاست
زیر شمشیر تو لے قاتل سفاک نشست (دیوان ص۲۲)

وہ شعر جس کو سن کر مرزا بھی اچھل پڑے تھے۔ ظاہر ہے کہ دوسرا شعر ہو سکتا ہے۔ اہل نظر کو شاید اختلاف نہ ہوگا کہ اس شعر پر داد سخن دینے میں غالب کا خلوص و جذبۂ تحسین واقعی کارفرما رہا ہوگا۔ جس کا مقابلہ "دفتر بے مثال" کی تعریف و توصیف سے نہیں کیا جا سکتا۔ مرزا نے خادم کی بیاض لے کر کہیں کہیں سے پڑھنے کی زحمت بھی اٹھائی تھی۔ خود نجم الحق کے الفاظ ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

"..... از آنجا رخصت شدہ در علی گڑھ کہ معروف بکویل است یک ہفتہ کہ آب و ہوائے آنجا خوش یافتند استقامت ورزیدند۔ بعد ازاں علی التواتر دہلی رشیدہ تا یک ماہ مقام کردند۔ درآنجا از میرزا نوشاہ نواب اسد اللہ خاں غالب بسیار اتفاق مجالست می افتاد۔ میرزا ے موصوف از دور دیدہ بر می خواستند و می فرمودند ع :-

بیا بیا کہ براہ تو چشم دادارم

و ہنگام رخصت فرمودند کہ محبت صاحب در دلم جا کردہ است۔ و بیاض اشعار والدم بدست خود گرفتہ می خواندند روزے دراثنائے کلمہ کلام گفتند : دی شب چیزے کہ دارد طبع شدہ باشد بفرمائید۔ گفتند کہ از مہاجرت فرزنداں و عزیزاں وطن، دل را اضطراری ہامی باشد، چہ گویم! معہذا شب غزل گفتہ ام۔ خواندند چوں نوبت ایں شعر افتاد بیت :-

بہر تعظیم خیالش کہ چو آمد ز ادب ‌ اشکم از دیدہ بروں آمد و برخاک نشست

از جا برجستند و بارک اللہ فرمودند" (دیباچہ : ص۵)

خادم کی ایک اور غزل قیام دہلی کی یادگار معلوم ہوتی ہے۔ اس کے چند منتخب اشعار

یہاں درج کیے جاتے ہیں:۔

تا جان بتن ماست بہار شد سخن ما — از بہر ہمیں است زبان در دہن ما
ہر غنچہ کہ شگفت پرید از رخ او رنگ — ہم رنگ خزاں است بہار چمن ما
اے کاش کہ در ساغر زریں بگلستاں — مے در دہد آں ساقی سیمیں ذقن ما
امروز ز غربت کہ فتادیم بدہلی — خادم کہ رساند خبرے از وطن ما
(دیوان ص ۱۴۷)

دہلی سے واپسی پر خادم نے مرزا کو کم از کم ایک خط ضرور لکھا تھا۔ اور اس کے ساتھ ایک تازہ غزل بھیجی تھی۔ پتہ نہیں مرزا نے کیا جواب دیا۔ اور دونوں میں خط و کتابت کا سلسلہ قایم رہ سکا تھا یا نہیں! غالباً خود مرزا کے اردو اور فارسی خطوط کے مجموعے جو اب تک منظر عام پر آچکے ہیں؛ خادم بردوانی کے نام سے خالی ہیں۔ وہ غزل جو بردوان پہنچ کر مرزا کو بھیجی گئی بہر حال دونوں کے تعلقات کی ایک کڑی ہے لہذا ذیل میں نقل کی جاتی ہے:۔

ہوائے آں حریم جنت آسا می کشد مارا — ز باد صبح میخواہیم افزوں تیزی پا را
دل من از فروغ عشق غیرت خورشید می گردد — بیاد آرم چو روئے دلبراں ماہ سیما را
اگر آزادگی خواہی تو از ہم صحبتاں گم شو — کجا در دام صیاداں کسے دید است عنقا را
در از آں وہاں واقف نخواہی شد دلا ہرگز — کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را[1]
خیال او بخواب اندر نمی آید بآغوشم — بہر شب می کشایم من عبث دست تمنا را
نسیم صبح امروز از سر کویش ہمی آید — کہ می یابم ہمانا بوئے زلف عنبر سا را

فضائے دہلی و گلگشت باغ و سیر بازارش

چو در دل یاد آید خادم از جا می برد ما را (دیوان: ص ۵ نمبر مقدمہ ص ۶)

دونوں کے تعلقات کی آخری کڑی وہ تاریخی قطعہ ہے جو خادم نے مرزا کی وفات پر لکھا ہے:۔

یکتائے دہر غالب جادو بیان ما — گو بے سخن بملک سخن بود بادشاہ

---

[1] یہ مصرع حافظ شیرازی کا ہے:۔

روز دوشنبہ دوم ذیقعدہ از جہاں　　در باغ خلد رفت برو رحمت الٰہ
خادم ز سال رحلت از فکر چوں نمود　　آمد ندا ز غیب کہ غالب بمرد آہ

(دیوان: ص ۲۲۳-۲۲۴)

اگرچہ مادۂ تاریخ ایسا ہے جس میں بقول مولانا حالی دس بارہ آدمیوں کو توارد ہوا لیکن مہینہ اور تاریخ کے ساتھ روز دوشنبہ کی صراحت میری نظر سے میر مہدی مجروح کے مراسلہ کے علاوہ اسی قطعہ میں گذری ہے۔ یکتائے دھر، ارجاد دبیان وغیرہ کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا پر نقد و جرح کرنے والوں کے برعکس خادم بردوانی مخلص عقیدت مند اور سرگرم حامیوں میں سے ایک تھے۔ افسوس یہ ہے کہ غالب اور خادم کے تعلقات پر مزید روشنی ڈالنے سے ہم اس وقت قاصر ہیں۔

ذیل میں بسلسلہ خادم چند باتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے:۔

(۱) خادم کی تعلیم اور مبلغ علم کی بابت ہمیں کوئی تفصیل نہیں ملی۔ بظاہر مقامی علماء کے زیر سایہ انھوں نے تعلیم و تربیت کے مراحل طے کئے ہوں گے۔ علوم دینیہ اور عربی زبان و ادب سے براہ راست واقفیت کا اندازہ نہیں ملتا۔ پورے دیوان کا جائزہ لیجئے تو کہیں ان کی زبان پر عربی دانی کا اثر نمایاں نہیں ملے گا۔ البتہ ہمیں ان کے ایک استاذ کا علم ایک تاریخی قطعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ سر عنوان یہ عبارت ملتی ہے: "تاریخ وفات مولانا مرشدنا مولوی زین العابدین مرحوم حیدر آبادی"۔ بہر حال یہ کہنا دشوار ہے کہ ان سے کسب فیض خادم نے بردوان ہی میں کیا یا کہیں باہر جاکر۔ پھر ان سے استفادہ کی نوعیت غالباً تصوف و روحانیت کے کسی سلسلہ تک محدود رہی ہے۔ قطعہ میں دس ابیات ہیں یہاں ان کا انتخاب نقل ہے تاکہ ان کی شخصیت کے متعلق قارئین کو کسی قدر اندازہ ہو سکے:۔

دردا و حسرتا کہ امام جہاں برفت　　حامی دیں و مہدی گم گشتگاں برفت
مقبول بارگاہ خدا، زین العابدیں　　وا حسرتا چو باد ازیں خاکداں برفت
از بہر طوف کعبہ ہمی گشت کام سنج　　کامد اجل براہ ہم آنجا ز جاں برفت
از بست و پنج شہر ربیع نخست داں　　کاں فخر روزگار و زماں از جہاں برفت
در شہر بمبئی است مزار مقدسش　　صد رحمت الٰہ بر آں آستاں برفت

تاریخ سال رحلت او گفت خادم

آں مہدی زمن زجہان جناں برفت (دیوان: ص ۲۴۴-۲۴۵)

اس کے بعد ایک چھوٹی سی مثنوی میں ان کے حالات کو نظم کیا ہے اور آخری ابیات میں دو تاریخی مادے بھی ۱۲۷۸ھ نکالے ہیں چند ابیات یہ ہیں :-

حامی دیں بود آں مرتاض ذات او بود درجہاں فیاض

بسکہ علم حدیث و قرآں داشت پاس شرع رسول از جاں داشت

راہ توحید می نمود عیاں دور می کرد شرک را زمیاں

گمرہاں را براہ دین آورد ہم زشک در رہ یقین آورد

عارف و کامل و مدقق بود عالم و کامل و محقق بود (دیوان ص ۲۴۵-۲۴۶)

(۲) خادم کی ولادت اور وفات کی تاریخیں تادم تحریر معلوم نہیں ہو سکتی ہیں تاریخ ولادت کے سلسلہ میں تخمینہ لگانے کے علاوہ چارۂ کار نہیں۔ یہ معلوم ہے کہ خادم بردوانی مہاراجہ مہتاب چند کے اتالیق تھے اور مہاراجہ بارہ سال کی عمر میں ۱۸۳۲ء میں مسند نشین ہوئے اس طرح ان کی پیدائش ۱۸۲۰ء کے قریب ہوئی ہوگی۔ استاذ اور شاگرد کی عمر میں کم از کم دس سال کا فرق بھی مان لیا جائے تو اس اندازے کے مطابق خادم کی ولادت ۱۸۱۰ء کے لگ بھگ قرار پاتی ہے۔ اور غالب سے ملاقات کے وقت (۱۲۸۲ھ ۱۸۶۵ء) خادم ۵۴ سال کے رہے ہوں گے۔ دیوان کی طباعت جمادی الاول ۱۳۰۲ھ (مارچ ۱۸۸۵ء) میں ہوئی، جبکہ صاحب دیوان کی عمر ۷۴ سال کے قریب تھی۔ اہتمام طباعت تک ان کی حیات کے ثبوت میں خاتمہ طبع کے یہ الفاظ ملتے ہیں: دیوان: جناب منشی محمدی صاحب خوشنویس تخلص خادم بردوانی دام فیضہ استاد جناب مہاراجہ مہتاب چند بہادر، والی بردوان بسعی فراوان منشی سید عبدالرحیم ابد نعت گو منتظم مطبع باہتمام عمر محمد ناخدا غفر اللہ ذنوبہ، در مطبع قادریہ واقع کلکتہ نیبو تلہ گلی نمبر ۱۶ طبع شد (ص ۲۸۸)

(۳) بردوان میں خادم کی سکونت شاید محلہ گھوڑے شہید میں تھی۔ اس لیے کہ نجم الحق نے

مطبوعہ دیوان کے آخر میں اپنا پتہ یوں لکھا ہے: "المشتہر نجم الحق ساکن بردوان محلہ گوراشہیدؔ"۔ اب یہ محلہ گھوڑا شہید کہلاتا ہے۔ لیکن مقامی لوگوں سے نجم الحق، یا اس کے خاندان والوں کی بابت کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔

(۴) انیسویں صدی کا ماحول جس میں غالب گذرے ہیں اور خادم نے بھی اپنی زندگی کے بہار آخریں مرحلے طے کئے، اس میں نوابوں، مہاراجاؤں اور تعلقہ داروں کی حاشیہ نشینی و مدح سرائی وغیرہ شعراء کا معمول رہا ہے۔ خادم نے بھی مدحیہ قصیدے لکھے اور اپنی قابلیت کے جوہر دکھا کر ممدوحین کا تقرب حاصل کیا۔ لیکن تعجب ہوتا ہے کہ مہاراجہ بردوان کی مدح میں ہمیں کوئی قصیدہ اس مطبوعہ دیوان میں نہیں ملتا۔ صرف ایک قطعہ اس سے مستثنیٰ ہے، جو سفر دہلی سے مہاراجہ کی مراجعت کے موقع پر لکھا گیا ہے:-

للہ الحمد کہ امروز زشہر دہلی	خوش بکاشانہ مہاراج بہادر آمد
سال تاریخ چو جستیم ز طبع خادم	گفت ما را کہ ہمین است پس از وے عدد
عدد چار تو شش مرتبہ بنویس و بگیر	سہ ازاں در مایۂ دو دبعشر یک بہ احد
ہمہ را از رہ ترتیب در آور بشمار	صاف تاریخ زہجری ست عیاں در ابجد

مہاراجہ کی تعریف میں کسی قصیدہ کا درج نہ ہونا ایسی بات نہیں جو اہمیت سے خالی ہو۔ جبکہ شہزادہ بشیر الدین (رفیق)، جان عالم واجد علی شاہ سابق فرماں روائے اودھ، سلطان حسین امیر سندھ، سلطان فخر الدین وغیرہ کی مدحت سرائی میں خادم کے طویل قصیدے ملتے ہیں۔ ایک قصیدۂ تہنیت نبیرۂ خواجہ عبد الغنی نواب ڈھاکہ کی ولادت کے موقع پر لکھا گیا ہے۔ سطور بالا میں گذر چکا ہے کہ خادم نے ایک قصیدہ مہاراجہ پٹیالہ نریندر سنگھ کی تعریف میں کہا تھا جس پر تین ہزار کی رقم ملی تھی نیز مہاراجہ مہندر سنگھ کی تخت نشینی کے جشن میں انھوں نے خالی ہاتھ شرکت نہیں کی ہوگی۔ لیکن مطبوعہ دیوان میں ان میں سے ایک قصیدہ بھی شامل نہیں ہے۔ لہٰذا ہم مطبوعہ دیوان کو خادم کے کلام کا کامل مجموعہ قرار نہیں دے سکتے۔ یہ قصائد بظاہر شاعر کی زندگی ہی میں تلف ہو گئے

یا ان کی نقلیں محفوظ نہیں رہ سکیں۔

خادم کے ممدوحین میں مولوی سید شرف الدین احمد شرافت الدولہ[1]، امام باڑہ محسنیہ ہوگلی کے متولی ہفتم شامل ہیں دیوان میں ان کے نام بھی کوئی قطعہ درج نہیں ملتا جبکہ دردانۂ خیال اور طبقاتِ محسنیہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ۱۲۹۲ھ ۱۸۷۵ء میں جب شرافت الدولہ کا تقرر منصب تولیت پر ہوا تو قطعات تہنیت پیش کرنے والے شعرا میں خادم بردوانی بھی تھے۔ قطعہ ذیل اسی موقع کی یادگار ہے:۔

ہوائے آں حریم جنت آسامی کشد مارا	ز باد وصبح میخواہیم افزوں تیزی پارا
خدایا آں جمالے را کہ در دل آرزو دارم	مرا بنما کہ بکشایم برآں چشم تمنا را
چہ خلق اوست بے پایاں چہ لطف اوست بیش از حد	درآرد بر سر تحریر و تقریرش کرا یارا
بہر دفتر کہ بنویسم ہمانا وصف خلق او	برآید از سر ہر حرف بوئے عنبر سارا
کشد آزاد طبعاں را ز لطف دیگراں نخود	کند یکسر اسیر دام خلق خویش دلہا را
کنایت تا بکے باشد صریحا نام او گویم	بہ آں باشد کہ بکشایم من اکنوں ایں معما را
چہ نام است ایکہ سید اشرف الدین احمدش خوانند	کہ در ہوگلی ہم داد، ہنواخت ہر اعلیٰ و ادنیٰ را
خدا بر مسند تولیتش داراد با ثروت	کہ او در انتظام آورد جائے پاک شہدا را

خوش آں روزے کہ خادم خویش را بنیم بہ بزم او
برانم از لب خود سر بسر حرف تمنا را (طبقات محسنیہ ص ۵۴-۵۵)

مطلع اس قطعہ کا مقدم الذکر غزل کا مطلع ہے جو مرزا کو بردوان پہنچ کر خادم نے بھیجی تھی۔ دیوان خادم کے تقریظ نگاروں میں شرافت الدولہ نواب مولوی شرف الدین احمد بھی ملتے ہیں (دیوان خادم ۲۷۵-۲۷۹) اس تقریظ کی نقل دردانۂ خیال کے آخری صفحات میں بھی ثبت ہے (دردانۂ خیال: ص ۴۷-۴۸، نول کشور لکھنؤ ۱۸۸۹ء)

---

[1] حالات کے لیے دیکھئے صحیفہ زرین ج ۲ ص ۴۰۳ از پراگ نرائن بھارگو، نولکشور ۱۹۰۲ء

(۵) خادم کی اولاد میں ہمیں صرف نجم الحق کے متعلق کچھ معلومات حاصل ہیں - ان کی یادگار اس دیوان کا مقدمہ ہے جس کو ہم ان کے ذوق ادب و فارسی دانی کا ستھرا نمونہ قرار دے سکتے ہیں۔ شعر و شاعری سے لگاؤ اور علی الخصوص فارسی میں طبع آزمائی کا شوق گھر کے ماحول کا نتیجہ تھا ذریعہ معاش یہ تھا کہ انجینیر ہوگلی کے دفتر میں کسی عہدے پر ملازم تھے شروع میں ان کا میلان شاعری کی طرف زیادہ مائل رہا لیکن بہت جلد سنبھل گیے اور باپ کی ہدایت پر مشق سخن میں دلچسپی لینا ترک کر دیا، دوستوں اور عزیزوں کے اصرار پر بطور تفنن کچھ کہہ لیتے تھے اور بس بہر حال انھوں نے کہیں اپنا تخلص نہیں لکھا ہے۔ لیکن ایک مثنوی دیوان خادم میں ملتی ہے جس کا عنوان ہے: (در نصیحت فرزند ارجمند متخلص بہ مضطر) میرا خیال ہے کہ یہ فرزند ارجمند جن کا تخلص مضطر تھا، خود نجم الحق ہیں یہ منظوم نصیحت سیدھی سادی زبان میں خاصہ کی چیز ہے اس میں ایک جگہ خادم نے شاعری سے باز رہنے کی ہدایت کی ہے ؎

کم کم بخیال شعر پرداز کز کارِ دگر ندارَدت باز

نجم الحق کی نظم نگاری کا کوئی نمونہ نہیں ملتا۔ لیکن مقدمۂ دیوان کو انھوں نے ختم کرتے ہی "قطعہ تاریخ دیوان" کے عنوان سے یہ دو شعر درج کیے ہیں :-

دیوان چہ خوش است بس زخادم گو دُرِ معانی اندران سفت

طبعم تاریخ اویکا یک بین بحرِ معانی است برگفت

بظاہر یہ قطعہ خود نجم الحق کا نظم کردہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد کے قطعات نظم نگاروں کے نام کے ساتھ ملتے ہیں۔

خاتمۂ مضمون میں قطعہ حمد، ایک غزل، اور متفرق ابیات کا انتخاب قارئین کی ضیافت طبع کے لیے پیش ہے اس لیے کہ خادم کا دیوان مطبوع ہونے کے باوجود کمیاب اور نادر ہے:

قطعۂ حمد کی سادگی اور روانی قابل ستائش ہے:

اے بدرگاہ تو نیاز ہمہ ذات پاک تو کارساز ہمہ

من چہ خود عرض حال خویش کنم | پیش تو ظاہر است راز ہمہ
از ہمہ بے نیاز آمدہ | لیک باشد بہ تو نیاز ہمہ
شب و روز است در رہِ طلبت | مہر و مہ وار ترک تاز ہمہ
آں کریمی کہ از عنایت تو | ہم غنا گشتہ است آز ہمہ
چہ گدا و چہ بادشہ یکسر | بس ز ذات تو فخر و ناز ہمہ
نیک و بد را کہ می کنم تفہیم | دادہ ہم تو امتیاز ہمہ

کار ایں خادم شکستہ بیار
اے کہ ہستی تو کارساز ہمہ (دیوان خادم: ۲۰۹)

نعتیہ قصیدہ سے دیوان کا آغاز ہوتا ہے اس کا ایک شعر انتخاب ہے:

شہ سریر نبوت محمدؐ عربی | کہ ذات او بجہان است ختم صنع اللہ

ایک غزل کاتب کی زمین میں ملتی ہے جو حسب ذیل ہے:

عکس روئے سرخ او آتش در آب انداختہ | نے غلط کردیم در آب آفتاب انداختہ
تا ز روئے آتشیں آں مہ نقاب انداختہ | خاک خجلت در دہان آفتاب انداختہ
آں دو زلف پرشکن کز ہر دو سو دارد گرہ | در دل سودائیم[1] صد پیچ و تاب انداختہ
چشم مخمور[2] تو امروز از نگاہِ فتنہ ساز | عالمے را ہر طرف مست و خراب انداختہ
شب کہ بردارد ز روئے خویشتن آں مہ نقاب | مہر از اں از شرم خود را در حجاب انداختہ
دل ز حسرت اندرون سینہ ام پنہاں گداخت | تا برخ آں شعلہ رو یا رب نقاب انداختہ
چشم پر آب مرا نادیدہ[3] است از دست برق | آتش غیرت بجاں خود سحاب انداختہ
من کجا بینم دگر امنیتے در عمر خود | عشق خوباں در دل من اضطراب انداختہ
آتش عشق تو از روزیکہ در دل سر زدہ است | چشم اشک افشاں مرا در سیل آب انداختہ

---

[1] دیوان: "سودائی من" [2] دیوان "مخمور یکہ تو" [3] " ": "نادیدہ"

خال مشکیں نیست گرد بیت ابرویش مگر — کلک قدرت نقطہ ہائے انتخاب انداختہ
بزمین آں غزل خادم کہ کاتب گفتہ است — طبع جولانم چہ خوش طرح جواب انداختہ (دیوان، صفحہ ۲۱)

غزلیات میں داد طلب ابیات کی کمی نہیں ہے، ذیل کے انتخاب سے اہل ذوق کو کسی قدر اندازہ ہو سکے گا۔

معلوم نیست آہ کہ امشب زتوبہ ام — درمیکدہ چہ برسر جام وسبو گذشت (ص ۱۷۹)

بیا بہ آں قد بالائے او شدم تہ خاک — سزد کہ سرو دمد جائے سبزہ از خاکم (ص ۱۸۵)

شیشۂ مے بلحد بہر خدا بگذارید — کہ نبود است جز او ہیچ کسے دمسازم (ص ۱۹۳)

مپرس بیکسی ما کہ وائے بعد از مرگ — کسے چراغ نیفروخت برسر خاکم
توئی و کوثر و طوبیٰ و حور اے زاہد — من و قرابہ و ساقی و سایۂ تاکم (ص ۱۸۵)

نیست شور عشق در شہر عدم گر از چہ رو — گل گریباں چاک از کتم عدم آید بروں
نیست جز شہر دل من عاقبت جائیش دگر — ہر کجا از سینۂ ہر کس کہ غم آید بروں (ص ۱۹۲)

شیشۂ مے ببغل جام بکف خندہ بلب — در چنیں حال ندانم زکجا می آئی (ص ۲۱۴)

نمی دانم بغفلت تا چہ جنگ آری بمن زیں پس — پیام صلح بے موجب کہ اینک درمیاں کردی (ص ۲۲۴)

شادم کہ گشت نامۂ اعمال من سیاہ — حرفی تواں نخواند بروز شمار بس (ص ۱۳۹)

مکتوب سادہ پیش بتاں می کنم رواں
از راز خود خبر بقلم ہم نمی کنم (ص۱۵۶)

جاں بلب خواہد رسید از بہر استقبال او
در دم آخر کہ از وئے وعدۂ دیدار فوت (ص۶۹)

یا رب بحیرتم کہ زیاد کدام کس
ہر شب گم است خواب ز چشم ستارہ ہا (ص۲۵)

حیرت زدہ چو من کسے نیست
اندر بر دمن در انتظارم (ص۱۶۸)

در مقامے کہ ترک سر باید
غفلتم بین کہ گل بدستار است (ص۹۰)

بقیہ صفحہ ۱۷۲

(۵) مرآۃ مداری مکھن پور، ضلع قنوج میں مدفون بدیع الدین ملقب بہ قطب المدار اور عوام میں شاہ مدار کے نام سے مشہور بزرگ کی سوانح عمری کے بیان میں ہے۔ اس مختصر رسالے کی تصنیف مکھن پور میں ۱۰۶۵ھ؍۱۶۵۵ء میں ہوئی تھی۔ یہ رسالہ، ایمان محمودی نامی رسالہ پر مبنی ہے جو شاہ مدار کے خلیفہ قاضی محمود کنتوری نے لکھا تھا جس میں اُن کے پیر و مرشد کے حالات منقول ہیں۔ اُس کا دوسرا ماخذ لطائف اشرفی ہے جس کے مصنف[1] شاہ مدار کے دوستوں میں تھے۔ اس رسالے کے قلمی نسخے ہندوستان کے کتب خانوں میں ملتے ہیں۔ محمد عبد الرشید ظہور الاسلام نے اُس کا اُردو ترجمہ ثواقب الانوار فی مطالع قطب المدار کے نام سے فرخ آباد سے ۱۹۰۱ء میں شائع کیا تھا۔

[1] عبد الرحمٰن چشتی نے اس تواریخ کا نام نہیں بتایا ہے۔

تبصرے

مولانا محمد علی کی یاد میں

از جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب
تقطیع متوسط، ضخامت ۲۷۰ صفحات۔ کتابت وطباعت بہتر۔ قیمت 9/50 ۔ پتہ : دارالمصنّفین اعظم گڈھ یو، پی

جیسا کہ دیباچہ میں ذکر ہے، یہ کتاب مولانا محمد علی جوہر کی نہ مرتّب سوانح عمری ہے، اور نہ ان کی زندگی کے کسی خاص پہلو کے متعلق کوئی سوچی سمجھی تالیف ہے، بلکہ فرطِ عقیدت و ارادت و محبت کے جذبہ سے مجبور ہو کر ایک مرتبہ لائق مرتّب مولانا پر ایک مضمون لکھنے بیٹھے تو وہ بڑھتا چلا گیا، یہاں تک کہ ایک کتاب بن گیا جو اس وقت زیرِ تبصرہ ہے، اس بنا پر اگرچہ اس میں جامعیت نہیں ہے۔ لیکن مولانا کے بہت سے اہم قومی و ملی کارناموں، علمی و ادبی کمالات، فضائل اخلاق، دینی جذبات اور عشقِ رسول کے واقعات کا مبسوط و مفصل تذکرہ مستند حوالوں کے ساتھ اس کتاب میں آگیا ہے۔ اور چونکہ لائق مؤلف مورّخ ہونے کے باوجود نثر میں شاعری کرنے کے عادی اور مولانا محمد علی کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر بالوقیر ہیں اس لیے اس پوری داستان میں فسانۂ گل وبلبل کا رنگ خود بخود پیدا ہو گیا ہے، اس بنا پر یہ کتاب تاریخی بھی ہے اور ادبی بھی اور اس حیثیت سے مطالعہ کے لائق اور قابلِ قدر ہے۔

غالب مدح وقدح کی روشنی میں

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب
تقطیع متوسط۔ ضخامت ۴۴۴ صفحات

قیمت -/15 پتہ دارالمصنفین اعظم گڈھ ــــ غالب صدی تقریبات کے سلسلے میں مرزا غالب

پر چھوٹی بڑی، اچھی بُری سینکڑوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں غالب کی زندگی اور اس کے فن کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو زیرِ بحث گفتگو نہ آگیا ہو، اس لیے سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے جب ان تقریبات میں شرکت کا ارادہ کیا تو اپنے لیے مندرجہ بالا عنوان منتخب کیا، جو ایک حد تک اس سب کا جامع ہے جو اب تک غالب پر مدح میں یا قدح میں لکھا گیا تھا۔ چنانچہ زیرِ تبصرہ کتاب میں جو صرف حصہ اول ہے، غالب کے معاصرین اور ان کے شاگردوں سے لیکر ڈاکٹر عبداللطیف (حیدرآباد) تک کے تمام لوگوں کی تحریری آرا کو جن میں غالب کی نسبت اظہارِ خیال کیا گیا ہے، یک جا کر دیا گیا ہے، اس بنا پر اس کتاب کا یہی فائدہ کچھ کم نہیں ہے کہ یہ بہت سی کتابیں پڑھنے سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ مزید برآں لائق مولف نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ ان تحریروں پر تبصرہ بھی کرتے گئے ہیں، اس چیز نے کتاب کی افادیت کو دو چند کر دیا ہے۔ کتاب بڑے سلیقے اور عمدگی سے مرتب کی گئی ہے۔ اندازِ بیان دلکش اور لطف آفریں ہے، غالب اور غالبیات کے طالب علم اور اساتذہ کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

مخدوم علی مہائمی

از مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی۔ تقطیع متوسط۔ ضخامت ۳۱۲ صفحات۔ کتابت وطباعت بہتر۔ قیمت۔/16
پتہ: نقش کوکن، پبلی کیشن ٹرسٹ۔ بمبئی۔9

شیخ سید مخدوم علی مہائمی آٹھویں صدی ہجری میں ہندوستان کے اکابر مشائخ و علماء میں سے ہیں، وسعت علم، دقتِ نظر اور کشف وبیان حقائق اور سلوک و معرفت میں مسلک کے اعتبار سے آپ کو شیخ محی الدین ابن عربی کا مثنیٰ کہنا چاہیے، ۸۳۵ھ میں وفات ہوئی۔ مہائم میں آپ کا عظیم الشان مقبرہ مرجع عوام وخواص ہے۔ آپ کی تفسیر جو تفسیر مہائمی کے نام سے اربابِ علم میں متداول اور مشہور ہے، اپنی چند خصوصیات کے اعتبار سے کتب تفسیر میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے، حضرت شیخ کثیر التصانیف تھے، لیکن آپ کے

حالات وسوانح کا بڑا حصہ اور آپ کی اکثر اور اہم تصنیفات پردۂ خفا میں تھیں۔

لائق مصنف کی یہ کوشش سزاوار تحسین اور لائق ستائش ہے کہ انھوں نے اس کو تحقیق کا موضوع بنایا، اور بڑی جدوجہد اور مشقت بسیار کے بعد یہ کتاب مرتب کی۔ کتاب دس ابواب پر منقسم ہے، باب اوّل میں مہائم کا جغرافیہ، اوس کی قدیم تاریخ عرب کے ساتھ اس کے دیرینہ تعلقات اور پھر اسلامی فتوحات کا تذکرہ ہے، باقی ابواب میں حضرت شیخ کے خاندانی حالات، ذاتی سوانح حیات، علم وفضل، شریعت وطریقت میں آپ کا مقام، آپ کی تصانیف اور ان کا مفصل تعارف۔ تصوف میں آپ کے مخصوص نظریات و افکار اور ان کی تشریح، آپ کے ملفوظات ومعمولات، آپ کے متعلق اکابر وعلماء ومشائخ کے اقوال اور آراء، ان سب کا نہایت واضح مدلل اور محققانہ بیان شگفتہ وسلیس زبان میں ہے، آخر میں ماخذ کی طویل فہرست ہے جو عربی، فارسی، اُردو اور انگریزی کی پچھتّر (۷۵) مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد اشاریہ اور شروع میں ایک مقدمہ، پیش لفظ اور فہرست مضامین ہے، غرض کہ کتاب تحقیق وتصنیف کے موجودہ اصول کی روشنی میں ایک معیاری کتاب ہے، اس کی اشاعت سے صوفیا اور علمار کے تذکروں کے ذخیرے میں ایک وقیع اضافہ ہوا ہے۔

جلد ۸۲	جمادی الاول ۱۳۹۹ھ مطابق اپریل ۱۹۷۹ء	شمارہ ۴

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

باخبر اصحاب جانتے ہیں کہ انگریزوں کے عہد حکومت میں انگریز مورخین نے ہندوستان کی جو تاریخیں لکھیں ان کا مقصد، خود ایلیٹ کے اعتراف کے مطابق مسلمان بادشاہوں کو فرضی اور مبالغہ آمیز بیانات کے ذریعہ بدنام کرنا تھا تاکہ ہندو انگریزی حکومت کو اپنے لیے خیر و برکت سمجھیں اور دل سے اس کی قدر کریں، ملک کی تقسیم اور اس کے طبعی اثرات و نتائج کے باعث آزادی کے بعد جو تاریخیں لکھی گئیں باستثنائے چند ان میں بھی ہندوستان کے اسلامی عہد کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ چنانچہ مسلمان جماعتوں اور اداروں کی طرف سے وقتاً فوقتاً اس پر احتجاج ہوتا رہا ہے اور اس احتجاج کی معقولیت کو خود حکومت نے بھی تسلیم کیا ہے لیکن گذشتہ دس بارہ برس سے تاریخ نگاری میں ایک نیا رجحان کمیونسٹ طریق فکر کا نمایاں ہوا ہے۔ اس میں ہندو اور مسلمان کا فرق نہیں، بلکہ خود نام کے بعض مسلمانوں نے ایسی کتابیں لکھی ہیں جن میں حضرت مجدد الف ثانی کا مذاق اُڑایا گیا، شاہ ولی اللہ دہلوی کو تنگ نظر اور قدامت پرست کہا گیا اور اس کے بالمقابل اکبر کے دین الٰہی کو سراہا گیا ہے، اس مکتبۂ فکر کے مورخین ایک منظم اور مربوط منصوبہ کے ماتحت اس بات کی برابر کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کے اسلامی عہد میں مسلمانوں نے جو عظیم الشان تہذیبی اور ثقافتی کارنامے انجام دیئے ہیں وہ تاریخ کی مادی تشریح (DIALECTICAL METHOD) کے گرد و غبار کے نیچے دب کر اپنی آب و تاب کھو بیٹھیں، ظاہر ہے یہ طرز عمل نہ ملک کی خدمت ہے اور نہ قوم کی، اس سے تاریخ بنتی نہیں بگڑتی ہے، اس سے تعمیر نہیں ہوتی تخریب ہوتی ہے، اس لیے سخت ضرورت تھی کہ اس رجحان کی مقاومت کی جائے۔

اپریل ۱۹۷۹ء

بڑی مسرت کی بات ہے کہ برصغیر کے بلند پایہ محقق اور مورخ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ابھی گذشتہ ماہ فروری میں انڈین ہسٹری اینڈ کلچر سوسائٹی کے دوسرے سیشن کے صدر کی حیثیت سے جو فکر انگیز خطبہ پڑھا ہے اس میں اس ذہنیت کو اور اس کے مذموم اثرات کو بڑی جرأت سے بے نقاب کیا ہے۔ اس سیشن میں موضوع بحث دو چیزیں تھیں :-

(۱) ہندوستانی تاریخ نگاری میں عصبیت، اور (۲) تاریخ کے مآخذ، ان دونوں تک اپنی گفتگو کو محدود رکھتے ہوئے پہلے موصوف نے آزادی سے پہلے اور اس کے فوراً بعد کی تاریخ نگاری اور اس کی خصوصیات کا جن کی طرف ہم نے ابھی اشارہ کیا ہے، جائزہ لیا ہے اور اس کے بعد جب تیسرا دور شروع ہوا تو اس کے متعلق لکھتے ہیں : یہ دوسرا دور رو بہ زوال تھا کہ "تاریخ بغیر نظریہ کے نہیں ہو سکتی" کا نعرہ لگا اور اس نعرے کے علمبرداروں نے اس درجہ تعصب برتا کہ جو لوگ ان کے ہمنوا نہیں تھے اُن کو ان لوگوں نے فرقہ پرست، تنگ نظر، اور رجعت پسند جیسے القاب سے موسوم کرنا شروع کر دیا، انھوں نے یہ حقیقت نظر انداز کر دی کہ ہر ملک کے لوگوں کی کچھ روایات ہوتی ہیں، جو ان کی تاریخ اور ان کی تاریخ کا مآخذ بنتی ہیں، ان روایات میں مذہب بھی شامل ہے جو ایک نہایت قوی عنصر اور محرک ہے۔ اس بنا پر تاریخ کو محض مادی نقطۂ نظر سے بیان کرنا اور مذہب، روایات اور کلچر ایسے اہم اور قوی عناصر کو نظر انداز کر دینا تاریخ کے ساتھ انصاف نہیں ظلم ہے۔

اس پر بہت واضح اور مدلل گفتگو کرنے کے بعد پروفیسر نظامی نے مابعد الطبیعیاتی تنقید اور مادی نقطۂ نظر کی چند دلچسپ مثالیں بیان کی ہیں، آپ بھی ملاحظہ کیجیے لکھتے ہیں : مثلاً یہ کہنا کہ محمود غزنوی نے اقتصادی اسباب کے باعث ہندوستان پر حملہ کیا۔ درست ہے، اس میں یہ اضافہ کرنا بھی صحیح ہے کہ غزنوی نے مندر تباہ کر دیئے، لیکن تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں ہوگی جب تک واقعہ کا یہ جز بھی نہ بیان کیا جائے کہ محمود غزنوی کے معاصر شیخ ابوالحسن بولانی جو بلند پایہ صوفی تھے، جب سلطان نے ان کی خدمت میں سومنات سے حاصل کیا ہوا سونا بطور نذر پیش کیا تو شیخ نے اس کے قبول کرنے سے یہ کہہ کر انکار فرما دیا کہ سلطان کی مہم پیغمبر اسلام کی تعلیمات کے مطابق نہیں تھی، اسی طرح غزنوی کی ہندوستان میں مہم کی تاریخ اس وقت مکمل ہوگی جب یہ بھی بیان کیا جائے کہ شیخ سعدی نے محمود کو حریص و طماع لکھا ہے اور اس کے معاصر البیرونی نے کہا ہے کہ غزنوی کے حملوں نے ہندوستان میں اسلام کے خلاف نفرت پھیلا دی۔

اسی طرح یہ تسلیم ہے کہ اکبر ایک عظیم بادشاہ تھا جو مغل بادشاہت کو ہندوستانی قومیت کا رنگ دینا چاہتا تھا۔ لیکن رانا پرتاپ نے اکبر کے خلاف جو جنگ کی اور بادشاہ کے مذہبی پیشوا ہونے کے دعوے کے خلاف ہندو اور مسلمان دونوں نے جو اظہار بیزاری کیا تھا اس سے صرف نظر کرنے کی کیا وجہ ہے؟۔ اسی طرح اورنگ زیب عالمگیر کی شیعہ دشمنی کو بڑے طمطراق سے بیان کیا جاتا ہے، لیکن یہ حقیقت نظر انداز کردی جاتی ہے کہ سلطان کے چار وزیروں میں سے تین وزیر شیعہ تھے اور ایک وزیر ہندو تھا۔

اسی سلسلے میں پروفیسر نظامی لکھتے ہیں: آج کل مارکسی نقطۂ نظر کے مؤرخین لکھتے ہیں کہ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کی تحریک رجعت پسندانہ تھی، یہ حضرات اس حقیقت کو فراموش کر جاتے ہیں کہ حضرت مرزا مظہر جانجاناں، جنھوں نے ہندوؤں کو اہل کتاب اور وید مقدس کو الہامی کتاب لکھا ہے وہ حضرت مجدد ہی کے روحانی سلسلے کے ایک فرد فرید تھے۔ نیز یہ کہ داراشکوہ جو نہایت آزاد منش تھا اس نے حضرت مجدد کی اتنی اور ایسی تعریف لکھی ہے جو کمیونسٹ مورخین کی فہم سے بلند وبالا ہے۔"

غرضکہ پورا خطبہ نہایت برمحل اور فکر انگیز ہے، بہرحال پروفیسر نظامی کو ترقی پسندی کے صومعہ میں حق کی اس اذان پر مبارکباد پیش کرتا ہے۔

بڑے افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ ہمارے عزیز دوست جناب سید محبوب رضوی صاحب اچانک ۲۵ مارچ کو راہی ملک بقا ہوگئے۔ مرحوم نے اچھے خاصے ظہر کی نماز چھتے کی مسجد میں ادا کی فراغت کے بعد سینہ میں کچھ درد سا محسوس ہوا فوراً ایک رکشا کر کے گھر روانہ ہوئے لیکن ابھی گھر پہونچے بھی نہ تھے کہ مرغ روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ہمہ تن دارالعلوم کی خدمت کے لئے وقف ہو گئے۔ انھوں نے مختلف دفتری خدمات بڑی دیانت، محنت اور قابلیت سے انجام دیں انکو مطالعہ تحقیق اور تصنیف وتالیف کا اعلیٰ ذوق قدرت کی طرف سے عطا ہوا تھا وہ دیوبند کے مایۂ ناز ادیب محقق مؤرخ اور مصنف تھے انکا آخری شاندار کارنامہ تاریخ دارالعلوم دیوبند کی دو جلدیں ہیں عادات وفضائل کے اعتبار سے نہایت دیندار عابد وزاہد معاملہ فہم خوش اخلاق اور دیانت دار تھے اس میں شبہ نہیں کہ انکی وفات دارالعلوم کا ایک عظیم نقصان ہے۔ اللھم اغفرلہ وارحم

شیخ عبدالرحمن چشتیؒ

از: جناب ڈاکٹر محمد عمر صاحب ریڈر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲)

(۶) مراۃ مسعودی اس رسالے میں سلطان الشہداء سالار مسعود غازی کی سوانح عمری کو قلم بند کیا گیا ہے جس کا بنیادی ماخذ ملا محمد غزنوی[۱] کی تاریخ ہے۔ وہ تاریخ اسی عہد میں لکھی گئی تھی۔ ملا محمد غزنوی۔ سلطان محمود غزنوی کا ایک ملازم تھا۔ اس رسالہ کا انگریزی میں بی۔ ڈبلو۔ چیپ نے خلاصہ پیش کیا تھا۔ اکبر علی ابن محمد بخش نے اس کا خلاصہ اردو میں کیا تھا۔ خود عبدالرحمن چشتی نے اس کا خلاصہ قصہ سالار مسعود غازی کے نام سے کیا تھا قلمی نسخے ہندوستان کے کتب خانوں میں ملتے ہیں۔

(۷) مراۃ الاسلام بختاور خاں نے شیخ عبدالرحمن چشتی کی ایک اور تصنیف کا حوالہ دیا ہے جس کا نام مراۃ الاسلام تھا۔ دوستانہ تعلقات کی وجہ سے عبدالرحمن نے اس کا ایک قلمی نسخہ بختاور خاں کو بھی بھیجا تھا۔ اس کتاب کے بارے میں بختاور خاں نے اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کی ہے۔ "فی الواقع کتاب خوب و مستحسن و مرغوب است"[۲] غالباً اب یہ کتاب ناپید ہے کیوں کہ نہ تو سی۔ اے۔ اسٹوری نے اس کتاب کا ذکر کیا ہے اور نہ کہیں دوسری جگہ اس کا حوالہ نظر سے گذرا ہے۔

(۸) مراۃ المخلوقات یہ منظوم سنسکرت ایک رسالے کا فارسی نثر میں ترجمہ اور اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق اس کی تشریح ہے۔ یہ رسالہ سنسکرت میں ہندو نظریۂ تخلیق کائنات کے

---

[۱] عبدالرحمن چشتی نے اس تاریخ کا نام نہیں بتایا ہے۔ [۲] مراۃ عالم۔ ص ۲۲۱ الف و ب

بارے میں مہادیو اور پاربتی میں ایک مکالمے کی صورت میں ہے۔ اس سنسکرت رسالے کی تصنیف منی پشسٹ سے منسوب کی جاتی ہے۔ شیخ عبدالرحمٰن نے ۱۶۳۱ء ۱۶۳۲ء میں یہ رسالہ مرتب کیا تھا۔ اس رسالے کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ہندو مذہب کی سنسکرت کتابوں پر عبور حاصل تھا۔ اور انھوں نے ہندوستانی تصوف کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ دیو مالائی قصوں اور کہانیوں کا وہ اچھا خاصا علم رکھتے تھے مراۃ المخلوقات کے دیباچہ میں عبدالرحمٰن چشتی نے لکھا ہے کہ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بارے میں بشارت پائی جاتی تھی لیکن اس حقیقت کا علم محض چند پنڈتوں تک ہی محدود تھا۔ اُن پنڈتوں نے مذہبی تعصب کی بنا پر اس بات کو عوام سے پوشیدہ رکھا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اعلیٰ طبقے کے ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے تنفر و عناد کا جذبہ کارفرما تھا۔ اس عناد و تبعد کو دور کرنے اور اس علم کو عوام تک پہنچانے کی غرض سے انھوں نے منی بشسٹ کے رسالے کو فارسی میں منتقل کیا تھا تاکہ دونوں فرقوں کے فارسی داں حضرات کو اُن پوشیدہ حقائق کا علم ہو جائے۔

زیرِ نظر رسالہ اسی رسالے کا اردو ترجمہ ہے جسے اس خیال سے بھی اردو میں منتقل کیا جا رہا ہے کہ عہدِ وسطیٰ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے تہذیبی تعلقات کو نظری سطح پر سمجھنے کے لئے یہ رسالہ ایک اہم اور بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

مراۃ المخلوقات

الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ علی محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین (حمد خدا کے لیے ہے جو تمام عالموں کا پالنے والا ہے اور عاقبت پرہیزگاروں کے لیے ہے، اور صلوٰۃ محمد کے اوپر اُن کی آل کے اوپر اور اُن کے تمام اصحاب پر)

اس کے بعد یہ خاکسار فقیر عبدالرحمٰن چشتی رسالہ مرآت المخلوقات تصنیف کرتا ہے۔ چوں کہ اس خاکسار نے ہندوؤں کی اُن تواریخ کا مطالعہ کیا تھا جو جنیات (شیو کی تخلیق) کے زمانے میں

لکھی گئی تھیں لیکن اُن کتابوں میں کہیں بھی ابوالبشر (آدم) صلوٰۃ اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ اس قوم کے بعض ناقص لوگوں نے آدم علیہ السلام کے ذکر کو اُن کتابوں سے خارج اور الگ کردیا۔ اور اپنے مذہبی تعصب کی بنا پر اس بات کو پوشیدہ رکھا۔ بالآخر بہت تحقیق و تفتیش کے بعد بشست کی ایک کتاب دستیاب ہوئی جس کے اُتردکھنڈ (آخری باب) میں آدم علیہ السلام اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور اُن کی بزرگی اُن کی اولاد اور اخلاق کا مفصل بیان پایا جاتا ہے۔ اور یہ بشست قوم جنیات میں ایک مُنی ہوا تھا اور اُن کی (ہندوؤں) اصطلاح میں رسول کو مُنی[1] کہتے ہیں۔ حالانکہ بشست بذاتِ خود صاحب کمال ایک فرد تھا لیکن مہادیو کے فیضان سے اکثر علوم کسب کئے تھے۔ اور اس نے اس علم کو اپنی قوم تک پہنچایا تھا مہادیو (یا شنکر) کو ابوالجن کے نام سے موسوم کرتے ہیں یعنی بابائے جن جنیات قوم میں مہادیو کو ایک رسول کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا۔ تاریخ طبری[2] کا مصنف اور دوسرے معتبر مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ جنیات قوم کی تربیت اور ہدایت کے لئے جن بحیثیت رسول آئے۔

قال اللہ تعالیٰ الجانّ خلقناہ من قبل الخ (ہم نے جنوں کو تیز چلنے والی ہوا کی آگ سے پیدا کیا)

روضۃ الصفا[3] کے مصنف نے ابن عباس رضی اللہ عنہ، کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ابوالجن کا نام

---

[1] خاموشی سے عبادت کرنے والا۔

[2] ابو جعفر محمد بن جریر الطبری کی ولادت آمل میں ۲۲۴ھ ۔ ۸۳۹ء میں ہوئی تھی اور بغداد میں ان کا انتقال ۹۲۳ء میں ہوا۔ ان کی شہرۂ آفاق کتاب کا نام تاریخ الرسول والملوک ہے۔

C. A. STOREY: PERSIAN LITERATURE. (LONDON) 1970) PART- I. VOLUME I.-PP 1-216

[3] محمد بن خاوند شاہ بن محمود، جو میر خاوند کے نام سے مشہور رہیں۔ ایک سید خاندان کے فرد تھے۔ وہ خاندان بہت زمانے پہلے بخارا میں بس گیا تھا لیکن اُن کے والد برہان الدین (باقی اگلے صفحہ پر)

سوماسنت[1] ہے۔

اور اس کا لقب جان (जान) اور دار الصفا[2] میں اس کا اسم گرامی آدم علیہ السلام لکھا ہے کیوں کہ جان کا نام ناردیتا (اصل نسخہ میں نار ندبوس لکھا ہے) جب اس کی اولاد اور اقربار روئے زمین پر بھاری تعداد میں پھیل گئے تو حق جل علائے ان پر شریعت (قانون) نازل فرمائی۔ ان تمام

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ کا) خاوندشاہ نقل سکونت کرکے بلخ چلے گئے اور ان کا وہیں انتقال ہوا۔ میر خاوند ۱۴۳۳ء میں بلخ میں پیدا ہوئے لیکن انہوں نے اپنی بیشتر زندگی ہرات میں گذاری جہاں انھیں میر علی شیر کی سرپرستی حاصل تھی انھوں نے چھیاسٹھ سال کی عمر میں ۱۴۹۸ء میں وفات پائی۔

روضۃ الصفا فی سیرت الانبیاء والملوک والخلفا تاریخ عام ہے جو سات جلدوں یا قسموں پر مشتمل ہے۔ (۱) تخلیق کائنات سے یزدگرد تک (۲) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور چاروں خلفاء کا بیان (۳) بارہ اماموں، بنوامیہ اور بنوعباسیہ کے حالات (۴) بنوعباسیہ کے معاصر حکمراں خاندان (۵) چنگیز خاں اور اس کے جانشین (۶) امیر تیمور اور اس کے جانشین، ۱۴۶۹ء میں ابو سعید کے انتقال تک۔ (۷) سلطان حسین اور اس کے بیٹوں کا حال ۱۵۲۲ء-۱۵۲۳ء تک۔

C. A. STOREY. PERSIAN LETIRATURE (LONDON. 1970) VOL. I. PART. I. PP. 92-93. PART. II PP. 1236-37

حاشیہ صفحہ ہذا

[1] سوم شیکھر (सोम शेखर)

[2] یہ کتاب غیر معروف ہے۔ بڑی تحقیق و تفتیش کے بعد بھی نہ تو اس کتاب کے کسی مخطوطہ کا پتہ چلا اور نہ ہی مصنف کا نام معلوم ہو سکا۔

لوگوں پر اپنی اطاعت لازم کر دی ہندوستان کی تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ بیاس کو بشست کا پوتا اور اس کا جانشین مانتے ہیں۔ مہادیو کا نام سوم شیکھر ہے اور نارد نامی ایک دوسرا عابد تھا جو مہادیو کا ہم عصر تھا۔ اس کا سلسلۂ نسب برہما تک پہنچتا ہے اور بشست کا وجود بھی برہما ہی کی ذات سے وقوع پذیر ہوا ہے۔ برہما کی تخلیق کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ ابوالجن کی تخلیق آگ سے ہوئی تھی لیکن بیاس کے کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیو یہ عنصری تھا ان چاروں میں سے ایک (یعنی آگ، پانی، خاک اور ہوا)۔ ان کی اصطلاح میں دو قسم کے دیوتا ہوتے ہیں یعنی ملائکہ۔ ان کی دو قسمیں متعین کی گئی ہیں۔ ایک قسم نورانی، قسم دوم عنصری کہ ان سے تولید و تناسل ممکن ہے۔ اور تفسیر[1] زاہدی میں بھی یہ لکھا ہے کہ ملائکہ کی دو قسمیں ہوتی ہیں: قسم اول "ناری" (آگ) اور قسم دوم "نوری"۔ قسم اول کے مطابق ملائکہ گناہ سے معصوم ہوتے ہیں اور قسم دوم سے تخلیق عمل میں آتی ہے۔ اور ان سے نسلیں وجود میں آتی ہیں۔ قولہ تعالیٰ نسل و ذریت[2]

---

[1] تفسیر زاہدی یا لطائف التفسیر سیف الدین کے مصنف کا نام ابونصر عبداللہ بن الحسن بن عبدالسلمان تھا۔ اس تفسیر کی تصنیف بخارا میں ۵۱۹ھ میں ہوئی تھی۔

C. A STOREY PERSIAN LITERATURE. (London 1970)

جلد اول : حصہ اول ص ۴۳

جلد اول حصہ دوم ص ۱۱۹۰

[2] مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں مرأت المخلوقات کے چار مخطوطے ہیں۔ ان سب مخطوطوں میں محولہ بالا آیت نامکمل ہے۔

نسخہ عبدالسلام کلکشن۔	قولہ نسلاً و ذرۃً ص ۳ الف
حبیب گنج	قولہ تعالیٰ اصلاً و رہا ص ۲ الف
سلیمان۔	قولہ تعالیٰ

حضرت شیخ محی الدین، مصنف فصوص[۱] الحکم بھی اس قول سے اتفاق کرتے ہیں کہ ملائکہ ارضی، سماوی اور عنصری ہوتے ہیں اور عرش پر رہنے والے ملائکہ اور مقربین ملائکہ نورانی ہیں۔ غرض کہ مصنف طبری اور روضۃ الصفا کے مصنف نے چار زمانوں کو چار ادوار میں منقسم کیا ہے۔ پورے دو ادوار جنوں (الجان) نے روئے زمین پر حکومت کی تھی اور حق تعالیٰ نے ان کے لئے شریعت یا قوانین نازل فرمائے تھے۔ تیسرے دور میں اُن پر دنیاداری یا مادیت غالب آگئی۔ لہٰذا اکثر جنوں نے ان احکامات سے روگردانی کی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ انھیں نیست و نابود کر دیں۔ فرشتوں کی فوج آسمان سے زمین پر اُتری اور تمام جنوں کو اپنے قہر و غضب کا نشانہ بنایا۔ ان کے بعض لڑکے معصوم تھے، اُنھیں گرفتار کر کے آسمان پر لے جایا گیا۔ انہی قیدیوں میں عزازیل بھی تھے۔ چوں کہ انھوں نے فرشتوں کی صحبت سے فیضان حاصل کیا تھا۔

اس لئے اُنھیں ایک ایسا مرتبہ حاصل ہو گیا کہ عرش پر بیٹھ کر فرشتوں کی ہمیشہ تربیت کرنے لگے۔ اور فرشتوں کی فوج کے ساتھ روئے زمین پر اُترے۔ تمام روئے زمین کو اپنے قبضہ اور تصرف میں کر لیا۔ وہ لوگ کبھی آسمان پر چلے جاتے اور کبھی زمین پر اُتر آتے تھے۔ لیکن اپنی کوتاہ بینی کے سبب وہ مغرور ہو گئے۔ انا ولا غیری (میرے سوا کوئی نہیں ہے) یہاں تک کہ دنیا والوں کے کانوں تک یہ گونج پہنچی کہ انی جاعلٌ فی الارض خلیفۃ (آدم کو میں نے زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے)۔ دورِ ثالث کے آخری زمانہ اور دورِ چہارم کے دوران آدم علیہ السلام عالمِ وجود میں آئے جنوں کے مورخوں بیاس وغیرہ نے چار ادوار کو چار زمانہ قرار دیا ہے۔ دورِ اول ستجگ، جس کی مدت سترہ لاکھ اور اٹھائیس ہزار سال ہے۔ دورِ دوم، ترتیا، اس کی مدت بارہ لاکھ اور چھیانوے

---

(۱) شیخ محی الدین ابن العربی کا اصلی نام محمد اور والد کا نام علی بن محمد عربی تھا۔ ان کی ولادت ۵۶۰ھ میں اور وفات ۶۳۸ھ میں ہوئی تھی۔ اسلامی تصوف میں انھوں نے فلسفۂ وحدت وجود کا اضافہ کیا۔ ان کی مشہور ترین کتابیں فصوص الحکم اور فتوحاتِ مکیہ ہیں۔ ویسے تو انھیں پانچسو سے زائد کتابوں کا مصنف بتایا جاتا ہے۔ خزینۃ الاصفیا: ۱: ۱۱۲۔ ۱۱۳۔

ہزار سال۔ دورِ سوم، دواپر، اس کی مدت آٹھ لاکھ اور چونسٹھ ہزار سال؛ اور دورِ چہارم، کلجگ، چار
لاکھ اور بتیس ہزار سال۔ غرضکہ اب تک ہجرت سے ۱۴۰۱ سال گذر چکے ہیں اور دورِ کلجگ کے ۴،۳۳
سال گذر چکے ہیں۔ بعض لوگوں نے لاعلمی سے رام چندر، کشن اور ارجن وغیرہ کو ابو البشر آدم علیہ السلام
کی اولاد میں شمار کر لیا ہے۔ یہ تصور بے بنیاد ہے یعنی بالکل غلط ہے۔ کیوں کہ رام چندر، دورِ ترتیا میں
تھے۔ بشسٹ نے اُن کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ برہما کی نسل سے تھے۔ اور برہما کا زمانہ ستجگ
کا زمانہ تھا۔ اور مہادیو کا بھی زمانہ وہی تھا۔ ان دونوں کو قادرِ مطلق[1] نے بلا ماں و باپ کے پیدا کیا
تھا۔ برہما کی تخلیق نور، اور نار سے ہوئی تھی اور مہادیو کو "نار اور باد" آگ اور ہوا سے پیدا کیا گیا تھا۔
اس لحاظ سے آدم علیہ السلام کی ولادت دورِ دواپر کے آخری زمانے میں ہوئی تھی کشن اور ارجن باوجودیکہ
وہ آدم علیہ السلام کی اولاد کے ہم عصر تھے لیکن بیاس کے قول کے مطابق ان کا سلسلۂ نسب راجانند
اور بشودا تک پہونچتا ہے اور خود راجانند کا زمانہ دورِ ترتیا تھا۔ اس سبب سے کشن وغیرہ کو راجابنشی
([illegible]) کہتے ہیں۔ راجانند کی اولاد میں سے بعض جنات اور فرشتے (ملائکہ عنصری) متذکرہ
اقلیم پر آدم علیہ السلام کے بیٹوں کشن اور ارجن کے دنیا میں آنے کے وقت تک تصرف پذیر رہے۔
بیاس نے لکھا ہے کہ کشن کا ظہور اس وجہ سے ہوا تھا کہ کنس دانو (दानव) کو تہ تیغ کر دے۔ اور
مہابھارت کی جنگ میں جنوں کی ساری قوم کو ہلاک کر دے تاکہ اقلیم ہند ان لوگوں سے پاک ہو جائے۔
اور آدم علیہ السلام کے فرزند آکر اس پر قبضہ کر لیں کیوں کہ جنوں کا دور پورا ہو چکا تھا۔ اس دور میں
ملک عنصری کو دیوتا بھی کہتے تھے بلکہ ملائکہ نورانی کو دیوتا کو گندھرب اور یکچھ بھی کہتے تھے۔ جنیات
کو دیوتا" اور دانو"، راکچھش اور دانو کے ناموں سے موسوم کرتے تھے۔ یہ بھی کہتے تھے کہ انسان کا
وجود انہی میں پایا جاتا ہے اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ مہادیو ایک جن تھا جس کی تخلیق آگ
سے ہوئی تھی لیکن اپنی قوم کے لوگوں میں وہ صوری اور معنوی کمالات کے لئے بے نظیر سمجھا جاتا تھا
اُس کی زبان سے کلماتِ توحید نکلے اور امورِ غیبی (مکاشفات) ظہور پذیر ہوئے تھے۔ "قال اللہ تعالیٰ

---

[1] برہم۔ قادرِ مطلق یا ذاتِ مطلق۔ جس کے کوئی صفات نہیں ہیں وہ لافانی اور لامتناہی ہے

ماخلقت الجن والانس الا لیعبدون " (میں نے نہیں پیدا کیا جن اور انس کو مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں)۔

جنوں کی عرفانیت کے بارے میں محولہ بالا آیت ایک دلیل کامل کا حکم رکھتی ہے۔ تفسیر زاہدی میں لکھا ہے کہ ہمارے پیغمبر علیہ السلام کی بعثت سے پہلے جن اور دیو آسمانوں پر جاتے تھے اور فرشتوں کی باتیں سنتے تھے لیکن ہمارے پیغمبر احمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعثت کے بعد آسمانوں کا راستہ ان کے لئے بند کر دیا گیا۔ غرضکہ ہمارے پیغمبر کے ظہور سے پہلے اُنھوں نے جن بعض امور کی پیشین گوئی بطور کشف کی تھی، اُن پر یقین کرنا چاہیئے کیوں کہ اُن باتوں سے کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچتا ہے۔ ہم صوفیاء کا مشرب تو یہ ہے کہ جو بھی اچھی بات کسی بھی فرقے میں پائی جاتی ہو اُسے اختیار کر لینا چاہیئے۔ اس سلسلے میں رسول اکرم کی یہ حدیث ہے: خذ ما صفا ودع ما کدر (اچھی بات لے لو، بُری بات چھوڑ دو)۔ ہمارے اس مشرب کے بارے میں صادق آتی ہے۔ اب میں اپنے اصلی موضوع کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

جب دورِ ستجگ کا مجموعی زمانہ، جو دورِ اول تھا، ختم ہو گیا تو ملک عنصری اور جنات نے بلا کسی رخنہ و خلل اپنی زندگی عیش و عشرت میں گزارنے لگے اور ان میں تکبر اور رعونت پیدا ہو گئی۔ ترتیا کے زمانے میں، جو دورِ دوم کے مترادف تھا، اُن سے احکامِ الٰہی کے خلاف اعمال سرزد ہوتے رہے۔ اُس زمانے میں مہادیو نے اُن سے کہا کہ اگر تم اپنی فلاح و بہبود چاہتے ہو تو راہِ اطاعت اختیار کر لو اور شریعتِ الٰہی کے مطابق عمل کرو۔ لیکن دنیاوی تکبر کے سبب سے یہ بات اُن کی سمجھ میں نہ آئی۔ اس بات پر مہادیو کی رگِ حمیت حرکت میں آگئی اور انھوں نے متذکرہ بالا جماعت سے پھر کہا، "خبردار! ہوشیار رہو! انشاء اللہ تعالیٰ زمانہ دواپر میں حق تعالیٰ ایسے ایک شخص کو پیدا کرے گا جو اس روئے زمین میں تمہارا نام و نشان تک باقی نہ چھوڑے گا۔ یہ بات کہہ کر مہادیو کوہِ کیلاش کے لئے روانہ ہو گئے۔ ان کی زوجہ، پاربتی محولہ بالا باتیں سن کر حیرت میں پڑ گئی۔ اور اُس نے ان کا تعاقب کیا۔ جب مہادیو اپنی منزلِ مقصود کوہِ کیلاش پر پہنچ گئے تو آرام سے وہ وہاں زندگی بسر

کرنے لگے۔ موقع پا کر ایک دن پاربتی نے مہادیو سے دریافت کیا۔" اِس دن آپ نے فرمایا تھا کہ دورِ دواپر میں قادرِ دانا (خداوند تعالیٰ) ایسے ایک عقلمند شخص کو جنم دے گا جو تمام دیوتاؤں اور دیوؤں وغیرہ کو معدوم کر کے تمام روئے زمین پر تصرف حاصل کرے گا۔ جس وقت سے میں نے آپ کی زبان سے یہ بات سُنی ہے اُس وقت سے میں حیرت زدہ ہوں۔ لہذا اس وقت آپ وہ اصلی بات بتایئے کہ قادرِ مطلق اس شخص کو کس قسم سے پیدا کرے گا۔" چوں کہ مہادیو کو اپنی زوجہ سے درجۂ رتم محبت تھی اس لئے بدرجۂ مجبوری وہ اصل واقعہ بیان کرنے لگے۔ کوہ کیلاش کے دامن میں بشست مُنی عبادتِ حق میں منہمک تھے۔ مہادیو اور پاربتی کے درمیان جو سوال وجواب ہوئے تھے۔ بشست مُنی نے مہادیو سے اپنے غلبۂ اخلاص کی وجہ سے اس گفتگو کو بالتفصیل قلم بند کر لیا۔ چنانچہ بھی سار (भविष्यसार) نامی مقام بہ شوت (سُننے والا) اور شونک (سُننے والا) اپنی قوم میں مجتہدین کا مل کا مرتبہ رکھتے تھے۔ اُن کے زاہد و عابد افراد بشست مُنی کے بیانات کو نقل کرتے ہیں جو یہ ہیں نہ کم نہ زیادہ۔ اُن شلوک کا ترجمہ کسی کمی و بیشی کے پیش کیا جاتا ہے۔ پہلے میری خواہش تو یہ تھی کہ اُن شلوکوں کو بجنسہٖ نقل کیا جائے لیکن وہ ہر ایک کے سمجھ میں نہ آئیں گے۔ اس لئے ایک شلوک بطور نمونہ یا شہادت کے نقل کیا جاتا ہے اور بقیہ شلوکوں کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے تا کہ ہر شخص بلا تکلف ان کا مطالعہ کرے۔ وہ شلوک یہ ہے۔

اُوباَ نیہ تریتا بُوڈ ایں سُو بھیتھیہٖ

وِنیل لِنہیُ بشست سنہا کو سنہا اُنترا کہنڈری رہدا

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مہادیو نے کہا۔" اے پاربتی۔ دواپر کے دور میں عجیب وغریب اُمور وقوع پذیر ہوں گے تو قادرِ مطلق بیچوں نارد کو حکم دیں گے کہ" باسا بدھی نام کن" یعنی فرشتوں سے کہو کہ وہ زمین پر جا کر ایک مٹھی مٹی لائیں اور اس مٹی کو برہما کے سپرد کر دیں۔ اُن کی اصطلاح میں برہما، موکل کو کہتے ہیں جو اللہ کے حکم سے مخلوقات کی تخلیق کرتا ہے اور نارد بذاتِ خود ایک دیوتا کی حیثیت رکھتے ہیں جو اس قوم کے کامل اشخاص پر نازل ہوتے ہیں۔ لہذا نارد نے اللہ تعالیٰ کا

حکم آسا بدھی (برہما) کو پہنچایا اور یہ کہا کہ قادرِ مطلق نے اپنی بے حد دوستی کی وجہ سے آپ کو یہ خدمت تفویض کی ہے۔ اُن کی خواہش ہے کہ آپ اُس مٹی سے ایک شخص کو پیدا کر دیں۔ نارد جب اپنی پوری بات کہہ چکے تو آسا بدھی مذکور (برہما) کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ کہیں نارد نے یہ بات خود اپنی طرف سے کہی ہے یا حق تعالیٰ کا ہی حکم ایسا ہے؛ اس بات کی تحقیق کے لئے وہ اس ذات بے چوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے کہا "میں حاضر ہوں! میرے لئے کیا حکم صادر ہوتا ہے اور جو حکم ہوگا اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں گا"۔ لہٰذا ایک ندا آئی "جو کچھ میں نے کہا تھا وہ سب کچھ نارد نے تم سے کہہ دیا ہے"۔ اس لئے نارد اس مٹی کو لے کر کندل جیکم یعنی برہما کی خدمت میں پہنچا اور ان سے کہا "ایک ایسے شخص کی تخلیق کیجئے جو بہت طاقتور و تنبر وہ ہو۔ اس کا چہرہ آگ کی طرح دمکتا ہو؛ یعنی اس کا حُسن اتنا مکمل ہو کہ ہر شخص اس کی طرف نظر نہ کر سکے"۔ اس کا پہلا نام آدیا ج (آدیاج) تھا اور نام ثانی آدم علیہ السلام۔ جب برہما اس کے قالب کو پیش کریں گے تو اللہ تعالیٰ اُنھیں اپنی قبولیت عطا فرمائیں گے تاکہ تمام مخلوق اُن کی پرستش کرنے لگے۔ اسی اثنا میں پارتی نے مہادیو سے دریافت کیا کہ "وہ شخص جس کے اس قسم کے کمالات قادر مطلق نے بیان فرمائے ہیں، کب پیدا ہوگا؟" مہادیو نے جواب دیا۔ "جب دورِ دواپر کے اختتام میں تین ہزار باقی رہ جائیں گے، اس زمانے میں آدم پیدا ہوں گے اے پاربتی وہ گندھرب یعنی وہ فرشتہ آسمان سے زمین پر اُتر کر یہ کہے گا کہ اے مادرِ زمین مجھے اپنی ایک مٹھی خاک عنایت کر۔ لہٰذا زمین اُسے یہ جواب دے گی کہ اے فرزند میں ہرگز تجھے مٹی نہ دوں گی۔ مجھے معاف رکھ۔ جس شخص کو مجھ سے پیدا کرنا چاہتے ہو اس سے بہ کثرت گناہ سرزد ہوں گے۔ نہ وہ یگ (قربانی) کرے گا اور نہ ہی دان (خیر خیرات) نہ روزہ رکھے گا اور نہ ہی تیرتھ استھان (زیارت گاہ) جائے گا"۔ لہٰذا وہ فرشتہ زمین کی یہ باتیں سُن کر واپس آسمان پر جائے گا، اپنے مقررہ مقام پر کھڑے ہو کر خداوند تعالیٰ کو واقعۂ حال سے مطلع کرے گا۔ اس وقت قادرِ مطلق جَم (ارواح) یعنی قابض الارواح کو مخاطب کر کے فرمائیں گے۔

"تم نے دیکھا، باسابدھی کن یعنی وہ فرشتہ زمین سے مٹی نہ لایا۔" قابض الارواح یہ سن کر کہے گا۔ "اگر حکم ہو تو میں مٹی لے آؤں۔ میں ابھی جا کر مٹی لے آتا ہوں۔" اسی وقت وہ ایسی برق رفتاری سے آسمان سے زمین پر اترا جس طرح کہ بارش کا قطرہ آسمان سے زمین پر گرتا ہے۔ زمین کی اجازت کے بنا وہ اپنا بایاں ہاتھ آگے بڑھا کر زمین سے ایک مٹی خاک لے کر برہما کے سامنے جا کر پیش کر دے گا۔ برہما اس سے فرمائیں گے کہ "تم تو جم ہو، لیکن تم نے یہ کام انجام دیا۔ کہ زمین کی رضا حاصل کئے بنا تم مٹی لے آئے اور اس بارے میں زمین دعویٰ کر رہی ہے۔ اگر میں نے اس مٹی سے ایک مجسمہ تیار کیا تو وہ کس طرح مبارک ثابت ہو گا۔" قابض الارواح یہ جواب دے گا کہ "قادرِ مطلق نے مجھے جو حکم دیا تھا، میں نے اس کی تعمیل کی اور جو حکم تمہارے لئے ہے کہ تم اس سے ایک مجسمہ تیار کرو تم اس پر بلا کسی تاخیر کے عمل کرو۔ بحث و مباحثہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔" اے پاروتی اُس وقت دورِ دواپر کے ختم ہونے میں نو ہزار سال کی مدت باقی رہ جائے گی اور برہما نے جس انسان کی تخلیق کی تھی اس کی تخلیق سے پانچسو سال گزر چکے ہوں گے۔" پاروتی نے پھر سوال کیا۔ "کیا اس قالب کو تیار کرنے میں پانچسو سال لگیں گے، کس پانی میں ملا کر اس مٹی کا خمیر تیار کریں گے اور اُس کو کس آگ سے پکائیں گے۔ میں یہ سوچ سوچ کر حیرت زدہ ہوں۔ ان سوالوں کا جواب جلدی سے دیں۔" مہادیو نے جواب دیا کہ "اے میری زوجہ، قادرِ مطلق کی پیشانی سے حسبِ ضرورت پانی کی بوندیں ٹپکیں گی، اُس پانی سے قدرت اُس مٹی کا خمیر تیار کرے گی اور اُس آگ سے، جو برہما کے پاس بطور امانت محفوظ ہے، اُس مجسمے کو پکایا جائے گا۔ اُس پورے مجسمے کو برہما بذاتِ خود اپنے ہاتھوں سے بنائیں گے، لیکن اُس کے سر اور چہرے کے بنانے میں ششدر رہ جائیں گے۔ اُس موقع پر قادرِ مطلق کا ہاتھ عالمِ غیب سے نمودار ہو گا۔ وہ (خدا تعالیٰ) اپنے ہاتھوں سے آدم کے چہرے کو بنائے گا۔ اس بارے میں ایک حدیث ہے:

خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ (اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا) اس موقع پر اس صورتِ حال کا مشاہدہ کر کے برہما ادب کے ساتھ علیحدہ کھڑا ہو جائے گا۔ اس کے بعد آدم کے سر پر ایک دوسرا ہاتھ ظاہر ہو گا اس وقت

قادرِ مطلق اپنا دستِ آدم کے سر پر رکھ کر اپنے منہ سے آدم کے کان میں روح پھونکے گا۔ وہ روح (دیا ہوا) اس انسان کے سارے جسم میں سرایت کر جائے گی۔ اس طرح باری تعالیٰ کی ذات آدم کے سر سے پیر تک کے تمام عناصر کو اپنی ذات کے پرتو سے اس طرح منور کر دے گا کہ وہ اس کو محیط ہو جائے گا۔ قال اللہ تعالیٰ ونفخت فیہ من روحی (میں نے اس میں اپنی روح پھونکی) اس آیت سے اس بات کا علم ہوتا ہے اے پاربتی بھوم دیوتا (منگل) اس آدم کو سجدہ نہ کرکے دیدہ و دانستہ قادرِ مطلق کے حکم سے روگردانی کرے گا کیوں کہ سارے دیوتا اس بات کو دیکھیں گے کہ قادرِ مطلق نے بذاتِ خود اپنے ہاتھوں سے آدم کی تخلیق کی ہے اور اپنا نور اس کے جسم میں پھونکا ہے۔ اس بات کو دیکھ کر برہما تمام دیوتاؤں کے ساتھ اس آدم کو سجدہ کریں گے اور بھوم (دیوتا) اپنی جہالت و تکبر کے زیرِ اثر خود کو رسوا کرے گا۔ اس کو نہ تو فلک الافلاک میں، نہ برہما کے مقام میں، نہ دیوتا کے مقام میں اور نہ گندھرب کے مقام میں، نہ راکششوں کے قرب میں، نہ راجاؤں میں اور نہ جوگیوں میں کوئی مقام حاصل ہوگا۔

اے پاروتی اس کی عمر طویل ہوگی اور وہ افضل المخلوقات ہوگا۔ اس کی آنکھیں نیلوفر (کنول) کی طرح شگفتہ ہوں گی اور اس کا چہرہ چند ہزار ماہتابوں کی چودھویں کی روشنی کے مثل درخشاں ہوگا۔ اے پاروتی۔ جب برہما آدم کے وجود میں باری تعالیٰ کی تجلی کو کارفرما دیکھے گا تو وہ بے اختیار ہوکر خود کو ان پر نثار کر دے گا اور ان کے سامنے سجدہ کرے گا۔ ذیل کے شعر میں فریدالدین عطار[1] نے اس مقام کی طرف اشارہ کیا ہے:

---

[1] نیشاپور سے ملحق کدکن نامی مقام میں آپ کی ولادت ۱۱۱۹ء میں ہوئی تھی۔ ابتدا میں شیخ رکن الدین اکاف کی خدمت میں حاضر ہوکر توبہ و استغفار کیا تھا اور شیخ مجد الدین بغدادی کے مرید تھے۔ انھوں نے بہت سے مشایخ کی خدمت میں رہ کر فیضان حاصل کیا تھا۔ پندنامہ عطار، الٰہی نامہ، بیسر نامہ، منطق الطیر انکی تصانیف ہیں۔ وہ فلسفۂ وحدتِ وجود کے پیرو تھے۔ آپ نے ۱۲۳۰ء میں وفات پائی۔ مزار نیشاپور میں واقع ہے۔ خزینۃ الاصفیا۔ جلد دوم ص ۲۶۲، ۲۶۳

گر نبودی ذاتِ حق اندر وجود
آب و گِل را کے ملک کردے سجود

(اگر انسان کے وجود میں حق تعالیٰ موجود نہ ہوتا تو پانی اور مٹی کے مجسمہ کو فرشتہ کیونکر سجدہ کرتا؟)

اے پاروتی۔ اُس وقت قادرِ مطلق تمام مخلوقات کو حکم دیں گے کہ وہ آدم کو سجدہ کریں اور تمام دیوتا، منی، راکشش اور جن وغیرہ یکبارگی سب کے سب سجدہ میں گر جائیں گے۔ ہنونت نامی دیوتا یعنی عزازیل سجدہ نہ کرے گا۔

قولہ تعالیٰ: و اذ قلنا للملٰئکۃ اسجدوا لآدم فسجدوا الا ابلیس۔ تا۔ من الکافرین۔ (اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں تو سب نے سجدہ کیا۔ اِلّا ابلیس جس کا تکبر بڑھ گیا تھا اور وہ کافروں میں شامل ہو گیا تھا) اور حسد کی بنا پر وہ آدم کی مذمت میں لب کشائی کرے گا اور کہے گا کہ وہ ایک بدترین خلقت ہے کیونکہ ہماری تخلیق تو لطیف آگ سے ہوئی ہے اور اس مٹی کے پتلے کو گندی مٹی سے بنایا گیا ہے۔ لہٰذا تمام دیوتاؤں کو مخاطب کر کے وہ کہے گا کہ "تم ہی" لوگ اس بات کا فیصلہ کرو کہ میں کیونکر آدم کو سجدہ کروں اور قرآن کی یہ آیت اس واقعہ کی شاہد ہے۔ خلقتنی من نار و خلقتہ من طین (تم نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور انھیں خاک سے، اس لئے میں کیسے انھیں سجدہ کر سکتا ہوں۔ اوپر جانے والی چیز نیچے جانے والی چیز کو کیسے سجدہ کرے)

اے پاروتی۔ تمام چیزوں سے زیادہ بڑی چیز تکبر ہے۔ لہٰذا عارف وہ شخص ہے جو ہر حالت میں اُس ذاتِ قادرِ بے چوں کو حاضر و ناظر جانتے ہوئے باادب رہے۔ جب اس (ابلیس) نے آدم کو حقارت کی نظر سے دیکھا اور اس نے کہا کہ دوزخ میں جا کر وہ باہر آ جائے گا۔ اے پاروتی۔ قادرِ مطلق آدم کو ہفت اقلیم کی بادشاہی تفویض کرے گا۔ سخاوت و شجاعت بدرجۂ اتم عطا کرے گا۔ اور ابتدا سے انتہا تک تمام علوم سے آ

بہرہ ور کرے گا۔ • قال اللہ تعالیٰ وعلّم آدم الاسماءَ کلہا (اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام نام سکھا دیئے)

اے پاروتی! تمام مخلوقات وغیرہ جن کی تخلیق آگ سے ہوئی تھی، اُس (آدم) سے خوف زدہ رہیں گے اور تمام مخلوق پر اُس کا غلبہ رہے گا۔ زمین پر مکان تعمیر کر کے لوگ آباد ہو جائینگے اور تمام روئے زمین کو اپنے قبضے اور تصرف میں لا کر وہ حکومت کرے گا"۔ پاروتی نے پھر مہادیو سے سوال کیا، "جس وقت اتنا حسین وجمیل، باہمت جری اور صاحب عرفان شخص مٹی سے پیدا ہوگا تو اس کے لئے اس کی زوجہ کہاں سے پیدا کی جائے گی؟" مہادیو نے جواب دیا کہ اے پاروتی! "اس کے بائیں پہلو سے ایک عورت پیدا ہوگی اور اُس کا حسن چودھویں کے چاند کے مثل اور اس کا جسم کنچن کے مانند چمکدار ہوگا۔ وہ سولہ سال کی پیدا ہوگی اور اُسی وقت آدم اس کے ساتھ مجامعت کرے گا اور اس کا حسن اس درجہ کامل ہوگا کہ گویا اُسے کامُرت (काम की रति) کی بیوی (رتی) کہنا چاہیئے۔ دنیا کو منور کرنے والے اس کے حسن کو دیکھ کر اکثر لوگ یہ کہیں گے کہ وہ پاروتی ہے اور آدم کو مہادیو کہنے لگیں گے اور تم ہمارے ساتھ کوہ کیلاش پر بیٹھ کر لاتعداد متنوع تفریحات کا مشاہدہ کروگی۔ اے پاروتی! آدم کی زوجہ کے بطن سے جو پہلا لڑکا تولد ہوگا، اس کا نام "نیلا" ہوگا۔ وہ قوی ہیکل ہوگا۔ اس سے اکثر عجوبات ظاہر ہوں گے اور اس لڑکے کے بعد ایک لڑکی پیدا ہوگی، متذکرہ لڑکے سے اس کا نکاح کر دیا جائے گا اور نیلا اپنی زوجہ کو ساتھ لے کر آدم سے جدا ہو کر، روئے زمین پر الگ آباد ہو جائے گا۔ تھوڑے ہی زمانے میں اس سے بہت زیادہ اولادیں وجود میں آجائیں گی اور تمام دنیا پر وہ غلبہ حاصل کر لے گا۔ وہ اُس قدر قوی وہیکل اور شجاع ہوگا کہ تمام جنوں کو اپنا مطیع کر لے گا اور جو کوئی اس کی اطاعت نہ کرے گا وہ اُسے ہلاک کر دے گا۔ آدم کی زوجہ سے جو دوسرا لڑکا جنم لے گا اس کا نام نہیلا ہوگا۔ پھر ایک لڑکی پیدا ہوگی، اس کا بیاہ

نہیلا سے کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد تیسرا لڑکا پیدا ہوگا، اس کا نام دھنکی ہوگا۔
وہ بے حد نڈر ہوگا۔ وہ برہما اور لشن کو تسلیم نہ کرے گا۔ دھنکی میری ہر قسم کی عبادتوں کو بہ نظر تحقیر رد کر دے گا۔ جہاں کہیں عبادت خانے دیکھے گا، ان میں پیشاب کرے گا اور ہمارے دین کی ہر طرح سے مخالفت کرے گا اور دیوتا کی تمام عبادتوں معابلوں اور کاموں کے برخلاف عمل کرے گا۔ آدم کے چوتھے بیٹے کا نام بلبھال ہوگا اور وہ پنج اقلیم پر تصرف حاصل کرے گا اور دیوتا اور رعیت سے بزور خراج وصول کرے گا اور جو کچھ پہلے کبھی نہ ہوا تھا، بدھال وہ سب کچھ کرے گا۔ دنیا کے تمام راجا اس کی اطاعت اور فرماں برداری کرنے لگیں گے۔ وہ ایک نئی شریعت رائج کرے گا۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔
اے پاروتی، آدم کی زوجہ سے پہلے لڑکا پیدا ہوگا اور بعد میں لڑکی۔ اور ہر ایک لڑکے کے سپرد ایک لڑکی کر دی جائے گی۔ مجموعی طور پر اکیس ۲۱ لڑکے اور بیس ۲۰ لڑکیاں پیدا ہوں گی۔ اُن میں سے ایک لڑکی کے لئے دو لڑکوں میں تنازع اٹھ کھڑا ہوگا اور ایک لڑکا اپنے بھائی کو قتل کر کے اس لڑکی کو ساتھ لے کر کوہ کیلاش کی طرف چلا جائے گا۔ وہاں جا کر وہ بہت قوت اور شان و شوکت پیدا کرے گا۔ پہاڑ کی کان سے سونا چاندی نکال کر بنی نوع انسان کو عطا کرے گا۔ اور روئے زمین کے تمام لوگ اس کی فیاضی کا سن کر اُس کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے، حسب خواہش سونا چاندی اپنے ساتھ لے آئیں گے اور آدم کا وہ بیٹا بڑا ایک بادشاہ ہوگا اور اس گناہ کے احساس کی ندامت میں کہ اس نے اپنے بھائی کو قتل کیا تھا، بہت زیادہ عبادت و ریاضت کرے گا اور ہمیشہ نیلے رنگ کا لباس پہنا کرے گا۔

(باقی آئندہ)

کیا علماء انگریزی کے مخالف تھے؟

جناب رفیع احمد صاحب بستوی۔ مرکزی دارالعلوم بنارس

تاریخ کے ہر دور میں مسلمان علماء اور امرائنے علوم و فنون کی سرپرستی کی ہے، زبان ولغت کے سلسلہ میں انکا رویہ ہمیشہ رواداری کا رہا ہے۔ اجنبی زبانوں کے سیکھنے میں مسلمانوں نے بہت کم بخل سے کام لیا ہے اعتدال اور سلامت روی کی یہ روش اسلام کی پاکیزہ تعلیمات کا نتیجہ ہے۔

قرآن کریم نے زبان ولغت اور رنگ و نسل کے تنوع کو اللہ کی قدرت کا عظیم مظہر قرار دیا ہے ارشاد ہے "ومن اٰیٰتہٖ خلق السمٰوٰت والارض واختلاف السنتکم والوانکم ان فی ذٰلک لاٰیٰت للعٰلمین" (الروم ۲۲) گویا اسلام نے تعصب اور تنگ نظری سے بالاتر ہو کر ایک آفاقی نظریہ اپنایا ہے، اور اجنبی علوم و فنون کے لئے اپنا دروازہ بالکل کھلا رکھا ہے، اسی طرح اس نے اپنے متبعین کو دوسری زبانیں حاصل کرنے کی نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ بالکل کھل کر حوصلہ افزائی کی ہے۔

حدیث کی اکثر مستند کتابوں میں زید بن ثابت کی ایک روایت موجود ہے اس کے الفاظ باختلاف روایات کچھ اس طرح ہیں: "امرنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اتعلم لہ من کتاب یہود وقال انی واللہ ما اٰمن یہود علی کتابی قال فما مرّ بی نصف شہر حتی تعلمتہ لہ قال لما تعلمتہ کان اذا کتب الی یہود کتبت الیہم واذا کتبوا الیہ قرأت لہ کتابہم"[1]

[1] ترمذی الجامع: باب السریانیۃ ۲/۹۶ (مطبوعہ رشیدیہ دہلی) بخاری: الجامع الصحیح: (باقی اگلے صفحہ پر)

مطلب یہ ہے کہ زید بن ثابت نے اللہ کے رسول کے حکم سے عبرانی سیکھی، لیکن بعض روایات میں سریانی زبان سیکھنے کا ذکر بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے عبرانی اور سریانی دونوں زبانیں سیکھی تھیں، چنانچہ حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) لکھتے ہیں " یحتمل ان زید اتعلم اللسانین لاحتیاجہ إلی ذلک "[1] یعنی اس کا احتمال موجود ہے کہ زید بن ثابت نے دونوں زبانیں سیکھی ہوں، کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دونوں کی ضرورت تھی۔

ملا علی قاریؒ (۱۰۱۴ھ) نے اس حدیث کے ذیل میں بڑی وضاحت کے ساتھ زبانوں کے سلسلہ میں اسلام کے موقف کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں: " لا یعرف فی الشرع تحریم علم لغۃ من اللغات، سریانیۃ او عبرانیۃ او ترکیۃ او فارسیۃ نعم یعد من اللغو وعما لا یعنی وھو مذموم عند ارباب الکمال الا اذا ترتب علیہ فائدۃ فحینئذ یستحب کما یستفاد من الحدیث "[2] یعنی شریعت کے نزدیک کسی زبان کا پڑھنا معیوب نہیں البتہ خواہ مخواہ کا مشغلہ ارباب کمال کو ناپسند ہے ہاں اگر اس میں کوئی فائدہ ہو تو سیکھنا مستحب ہو جاتا ہے جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

انگریزی زبان بھی اس کلیہ سے مستثنی نہیں، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ علماء اس زبان سے کد رکھیں اور نفرت کریں، مگر کم و بیش پچاس ساٹھ سال سے یہ سمجھا اور سمجھایا جا رہا ہے کہ علماء عموماً انگریزی زبان کے سخت مخالف تھے، اور انھوں نے اس کی تعلیم کو حرام قرار دیا تھا۔

آیئے اس سلسلہ میں علماء کے فتاوی اور طرز عمل کو دیکھیں، کیا واقعی معاملہ کی صورت یہی ہے یا حقیقت کچھ اور ہے، مگر پہلے یہ بات طے کر لی جائے کہ سرسید اور علماء کے

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) باب ترجمۃ الحکام دھل یجوز ترجمان واحد ۲/ ۱۰۶۷ (مطبوعہ رشید دہلی)؛ ابوداؤد السنن باب روایۃ اھل الکتاب ۲/ ۶۵ (مطبوعہ رحیمیہ دیوبند)۔

[1] ابن حجر عسقلانی فتح الباری ۱۳/ ۱۸۷ (مطبعہ سلفیہ قاہرہ) [2] ملا علی قاری بحوالہ تحفۃ الاحوذی، ۳/ ۳۹۸ (مکتبہ سلفیہ مدینہ منورہ)

تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ کیونکہ سلسلہ بحث کو آگے بڑھانے کے لئے یہ ایک لازمی بات ہے۔

سرسید اور علماء انگریزی تعلیم کے سب سے بڑے داعی سرسید تھے مگر علماء اور سرسید کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ ہی رہے۔ سرسید اور علماء ایک طویل مدت تک برسرِ پیکار رہے علماء کی طرف سے ان پر کفر کے فتوے لگائے گئے یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ ایک اہم سوال ہے عام طور سے مشہور رہے کہ یہ کفر کے فتوے اس جرم میں لگے کہ سرسید انگریزی تعلیم کے داعی تھے، اگر یہ دعویٰ یا اس کے برعکس کوئی چیز ثابت ہو جائے تو معاملہ خود بخود صاف ہو جائے گا۔

کش مکش کی تدریجی کیفیت مسلمانوں میں سرسید کی طرف سے بدگمانی کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی؟ اور اس میں تیزی کس طرح پیدا ہوئی؟ اس کی اجمالی کیفیت مولانا حالی (متوفی ۱۹۱۴ء) کے بیان کے مطابق اس طرح ہے لکھتے ہیں اگرچہ ان کے مذہبی خیالات کی نسبت اس وقت بدگمانی شروع ہو گئی تھی جب کہ انھوں نے انگریزوں کے ساتھ کھانے پینے سے پرہیز ترک کر دیا تھا مگر جب تبیین الکلام کی پہلی جلد شائع کی تو اس بدگمانی کو زیادہ ترقی ہوئی اس وقت سید مہدی علی خان "محسن الملک" (متوفی ۱۹۰۷ء) نے ایک سخت خط لکھا جب علیگڑھ سوسائٹی نے باقاعدہ کام شروع کیا اور سب سے پہلے الفنسٹن کی ہسٹری آف انڈیا کا ترجمہ انگریزی سے ہندی میں ہونے لگا تو اس کا ترجمہ بے کم وکاست ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پیغمبر باطل لکھ دیا گیا مولوی سمیع اللہ صاحب نے اس پر سخت اعتراض کیا اور اس سے اپنی ایک تحریر میں سرسید کے کفر و ارتداد پر استدلال کیا اس کے بعد اکثر بزرگ مسلمانوں نے سوسائٹی سے استعفاء دیدیا۔ لندن جانے سے پہلے جب رسالہ طعام اہل الکتاب شائع کیا تو انہیں عموماً کرسٹان کا خطاب دیا گیا لندن گئے تو گردن مروڑی ہوئی مرغی کی حلت کی تحریر شائع کرائی اس کو سرسید کے کافر ہونے کا بڑا سبب قرار دیا گیا اس کے

بعد جیوں ہی سرسید نے تہذیب الاخلاق شائع کیا مخالفت کی گھٹا امنڈ کر چاروں طرف سے اُٹھی۔[۱]

یہ پوری داستان ہر پہلو سے مکمل ہے مگر اس میں کہیں بھی اس کا تذکرہ نہیں کہ انگریزی تعلیم کی ترویج پر کفر کا فتویٰ لگا تھا مولانا حالی تو ایک اور قدم آگے بڑھا کر کہتے ہیں کہ "اگر سرسید یہ پرچہ تہذیب الاخلاق نہ جاری کرتے اور مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح چھوڑ دیتے بلکہ صرف ان کی تعلیم کا انتظام کرتے تو ظاہراً ان کی مخالفت کم ہوتی بلکہ شاید نہ ہوتی[۲]" گویا حالی کے نزدیک مخالفت کا اصل سبب سرسید کے مخصوص نظریات تھے اور اس مخالفت میں انگریزی تعلیم سے متعلق ان کی کوششوں کا کچھ بھی دخل نہ تھا۔ یہ خیال تنہا مولانا حالی کا نہیں بلکہ واقعات پر جو بھی غیر جانبداری سے غور کرے گا اس نتیجے پر پہونچے گا جناب شیخ محمد اکرام صاحب آئی، سی، ایس (م ۱۹۷۳) نے مولانا حالی سے بھی واضح تجزیہ کیا ہے لکھتے ہیں "سب سے بڑی غلط فہمی جو اس (سرسید کی مخالفت کے) بارے میں بہت عام ہے وہ یہ ہے کہ علماء نے سرسید کی مخالفت اس وجہ سے کی کہ وہ انگریزی تعلیم رائج کرنا چاہتے تھے۔ ہم نے سرسید کے مخالف اور موافق تحریروں کا مطالعہ کیا ہے ہماری رائے میں یہ خیال غلط ہے اور علماء اسلام کے ساتھ صریح بے انصافی ہے[۳]" ایک اور جگہ لکھتے ہیں "سرسید انگریزی تعلیم کی ترویج سے نہیں بلکہ اپنے معاشرتی اور مذہبی عقائد کی وجہ سے نیچری اور کرستان کہلاتے تھے"[۴]۔

اسی طرح ڈاکٹر سید عبداللہ اس پہ بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سرسید انگریزی تعلیم کو پھیلانا چاہتے تھے اور علماء انگریزی تعلیم کو مذہباً ناجائز سمجھتے تھے مگر یہ رائے منصفانہ نہیں انصاف یہ ہے کہ اس معاملے میں علماء کو

---

[۱] حالی، حیات جاوید ۲/۲۳۹ تا ۲۴۵ (مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۳۹ء) [۲] ایضاً ۱/۱۴۸ [۳] شیخ محمد اکرام: موج کوثر ۵۶ (لاہور ۱۹۴۰ء) [۴] ایضاً ۶۳۔

اختلاف سرسید کے مذہبی عقائد سے یا پھر انگریزی تمدن سے تھا ان کو انگریزی تعلیم سے اختلاف نہ تھا لیکن چونکہ سرسید انگریزی پھیلانے والے تھے اس لئے معاملہ الجھ کر رہ گیا اور بہت سے مغالطے پیدا ہو گئے"[1]

اکرام اللہ خاں مولف وقار حیات لکھتے ہیں" سرسید کے زمانہ میں ان کی مذہبی آزادی کیوجہ سے مذہبی گروہ کالج سے بیزار تھا اس لئے سرسید کا تمام زمانہ مخالفت اور کشمکش میں گذرا"[2]

مولانا امداد صابری صاحب لکھتے ہیں: "جو شخص بھی تہذیب الاخلاق اور اس کے مخالف اخبارات کا مطالعہ کرے گا تو اسی نتیجہ پر پہونچے گا کہ دونوں طبقے مسلمانوں کی تعلیم کے مخالف نہیں تھے طریقہ تعلیم اور بعض دینی مسائل اختلاف کے موجود تھے" تاریخ صحافت اردو ۲/۳۶۲

مقصود یہ نہیں کہ اس طرح کی شہادتیں جمع کی جائیں کہنا صرف یہی ہے کہ جس نے بھی اس معاملے کا تجزیہ کیا ہے اسی نتیجے پر پہونچا ہے کہ مخالفت کا منبع سرسید کے مذہبی افکار و خیالات تھے اس میں انگریزی تعلیم کی ترویج کا بالکل دخل نہیں، یہی وجہ ہے کہ جن علماء کو خاص طور سے مطعون کیا جاتا ہے کہ وہ ان کی مخالفت میں پیش پیش رہے ان کے خیالات دوسرے علماء کرام سے مختلف نہیں بلکہ تمام ہی علماء سرسید کے بارے میں ایک سی رائے رکھتے ہیں نمونۃً ہم مشہور محدث مولانا شمس الحق صاحب عظیم آبادی (م ۱۳۲۹ھ) کی ایک تحریر: "عون المعبود شرح ابو داؤد" سے نقل کرتے ہیں" وصنف رئیس النیچریۃ وامامہم تفسیرا للقرآن الکریم بلغۃ الھند ففسرہ برأیہ الفاسد وصرف فی معانی القرآن وجاء بالطامۃ الکبریٰ وانکر معظم عقائد الاسلام وصنف لاثبات ھذہ المقالات رسائل کثیرۃ فضل واضل[3] یعنی نیچریوں کے سردار نے اردو میں قرآن کی ایک تفسیر لکھی ہے جس میں اپنی فاسد

---

[1] سید عبد اللہ: سرسید اور ان کے نامور رفقاء / ۸۰ [2] اکرام اللہ خاں: وقار حیات ۲/ ۵۵۲ (علی گڑھ ۱۹۲۵ء) [3] شمس الحق عظیم آبادی محمد شا عون المعبود ۳/ ۳۵۶ (دارالکتب بیروت) ہم نے قصداً مولانا کے بیان کا وہ حصہ نظر انداز کر دیا ہے جس میں مرزا غلام احمد قادیانی کو تابع اور سرسید کو متبوع قرار دیا گیا ہے۔

رائے سے قرآن کی تفسیر اور اس کے معانی میں تصرف کیا ہے اور ایک بہت بڑی مصیبت کھڑی کردی ہے اس شخص نے اسلام کے اکثر عقائد کا انکار کردیا ہے اور ان باتوں کے اثبات میں متعدد رسائل تحریر کئے ہیں اس طرح وہ خود گمراہ ہوا اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا

گویا اصل اختلاف تو سرسید کے افکار وخیالات سے تھا مدرسۃ العلوم کی مخالفت ضمنی چیز تھی کوئی بھی عالم اصولی طور پر اس تجویز کا مخالف نہیں تھا اس کی تصدیق ان فتووں سے ہوتی ہے جو مدرسۃ العلوم کے بارے میں شائع ہوئے ہیں۔ ان فتاوی سے متعلق سوالات میں یہ چیز قدر مشترک ہے کہ جس شخص کے عقائد اس طرح ہوں (مثلاً رلا تک کا وجود نہیں گردن مروڑی مرغی حلال ہے) وہ اگر کوئی مدرسہ ان خیالات کی ترویج کے لئے اس اعلان کے ساتھ جاری کرے کہ دیوبند سہارنپور، کانپور وغیرہ کے مدارس بے فائدہ ہیں تو کیا ایسے مدرسہ میں مدد کی جا سکتی ہے؟[1]

ظاہر ہے کہ ایک مفتی کی حیثیت جج کی نہیں ہوتی کہ وہ پیش آمدہ سوالات کے حقائق کی بھی ٹٹولتا پھرے بلکہ اس کے سامنے جو سوال پیش کیا جاتا ہے وہ اسی کو حقیقت فرض کرکے اس کا جواب دیتا ہے چنانچہ اس استفتاء کے جواب میں وقت کے مستند علماء نے جو فتاوی دیئے وہ اسی سوال، کے گرد گھومتے ہیں۔

مثلاً مولانا عبدالحئی فرنگی محلی (م ۱۳۰۴ھ) لکھتے ہیں۔

"جس شخص کے اعتقادات اس طرح ہیں جو کہ سوال میں مسطور ہوئے ہیں وہ شخص مخرب دین، ابلیس لعین کے وسوسہ سے صورت اسلام میں تخریب دین محمدی کی فکر میں ہے۔ جو چیزیں اس کے نزدیک موجب تہذیب ہیں اہل سنت کے نزدیک باعث تخریب ہیں[2]

---

[1] امداد العلی اکبر آبادی: امداد الآفاق/۱۱۳ (کانپور ۱۲۹۰ھ) مولانا حالی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ منشی امو جان کے مکان پر دہلی میں ایک عربی مدرسہ قائم کیا گیا تو سرسید نے اس پر اپنے سخت رنج وغم کا اظہار کیا حیات جاوید ۲/۴۰۔
[2] امداد الآفاق: ۶۰/

اسی طرح کے فتاوی مولانا نذیر حسین محدث دہلوی (م ۱۳۲۰ھ) مولانا منصور علی مرادآبادی مولانا محمد احسن نانوتوی (م ۱۳۱۲ھ) مولانا ذوالفقار علی نقوی مالوی (م ۱۳۴۰ھ) وغیرہ کے بھی ہیں[1]

صاف نظر آتا ہے کہ یہ سارے فتاوی سرسید کے افکار وخیالات کے خلاف ہیں ان فتاوی کا اطلاق کسی طرح بھی ایسے کالج پر نہیں ہو سکتا۔ جو اس مقصد سے قائم نہ کیا گیا ہو جس کا ذکر فتاوی میں بطور خاص کیا گیا شیخ محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں۔

"علی گڑھ کالج کے متعلق سخت سے سخت مضامین درشت سے درشت فتاوی ہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ انگریزی پڑھنا کفر ہے بلکہ یہی ہوتا ہے کہ جس شخص کے عقائد سرسید جیسے ہوں وہ مسلمان نہیں اور جو مدرسہ ایسا شخص قائم کرتا ہے اس کی اعانت جائز نہیں[2]

یہی وجہ ہے کہ سرسید کی علیحدگی کی شرط کے ساتھ، مولانا قاسم صاحب نانوتوی (م ۱۲۹۷ھ) جیسے بزرگ بھی تعاون پر آمادہ تھے حتی کہ ان کے بدنام ترین مخالف مولوی امداد العلی اکبرآبادی نے کہا کہ آپ اگر اپنے خیالات سے رجوع کر لیں تو ہم تعاون کریں گے[3] حد تو یہ ہے کہ مولوی علی بخش (جنھوں نے علماء حرمین سے فتوی حاصل کیا تھا) بھی اس شرط کے ساتھ کہ "سرسید کمیٹی خزینۃ البضاعۃ سے الگ ہو جائیں اور مذہبی صیغہ کی نگرانی ایک الگ بورڈ کے سپرد کر دیں، تو پھر تعاون کے لئے تیار تھے اور یک مشت آٹھ سو روپے کی گرانقدر امداد کا بھی اعلان کر دیا تھا[5]

---

[1] امداد الآفاق۔ [2] شیخ محمد اکرام: موج کوثر/۵۱ [3] محمد طفیل بنگلوری: روشن مستقبل/۲۱۶ علیگڑھ لیکن سرسید نے لکھا ہے کہ مولنا کا عذر یہ ہے کہ اس مدرسہ میں شیعہ بھی شریک ہیں اس لئے ہم شرکت سے معذور ہیں، تہذیب الاخلاق بحوالہ حیات جاوید ۲/۲۶۲۔ [4] حیات جاوید ۲/۲۶۲ ر ۰

[5] ایضاً

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ۱۸۶۴ء میں جب کہ سرسید غازیپور میں تھے ایک مدرسہ انگریزی تعلیم کے لئے قائم کیا تو یہاں کے مسلمانوں نے کوئی مخالفت نہیں کی تھی اسی زمانہ میں مولانا رحمت اللہ فرنگی محلی اور دوسرے علماء غازیپور آپ کے اشتراک سے ایک اور ایسی درسگاہ بنانا چاہتے تھے جس میں انگریزی تعلیم کا بھی خاطر خواہ انتظام ہو[1]

ذکر تھا سرسید اور علماء کی باہمی کشمکش کا اور اس کے اسباب کا لیکن بات ذرا طویل ہوگئی گذشتہ سطور میں ہم نے جو مواد فراہم کیا ہے اس سے یہ حقیقت بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ علماء اور سرسید میں اختلاف کا سبب انگریزی تعلیم کو کسی بھی درجہ میں نہیں قرار دیا جا سکتا

سرسید سے پہلے

اب ہم چاہتے ہیں کہ انگریزی تعلیم کے متعلق سرسید کے معاصرین کے فتاوی اور ان کا طرز عمل ذکر کریں لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ان علماء کا ذکر کر دیں جنھوں نے سرسید کی تعلیمی کوششوں سے پہلے ہی اس وادی میں قدم رکھا تھا یا اس کے جواز کا فتوی دیا تھا مولانا آزاد (م ۱۹۵۸ء) نے بالکل صحیح فرمایا ہے "سرسید سے بہت پہلے مسلمان علماء میں انگریزی زبان اور نئے علوم کی ترویج کے کتنے ہی حامی اور دعاۃ گذر چکے ہیں"[2]

(۱) شاہ عبدالعزیزؒ (م ۱۲۳۹ھ) دہلی میں جب انگریزی تعلیم کا انتظام ہوا تو مسلمانوں نے کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کے متعلق فتوی طلب کیا تو آپ نے واضح لفظوں میں اسے جائز قرار دیا چنانچہ سرسید لکھتے ہیں" شاہ عبدالعزیز جو تمام ہندوستان میں نامی مولوی تھے، مسلمانوں نے ان سے فتوی پوچھا، انھوں نے

---

[1] حیات جاوید ۲/۲۸۔ د. حشمت رحمت تاریخ کے آئینہ میں

[2] عبدالرزاق ملیح آبادی: آزاد کی کہانی/ ۳۷۰ (دہلی ۱۹۶۵ء)

جواب دیا کہ کالج انگریزی میں جانا اور پڑھنا اور انگریزی زبان کا سیکھنا بموجب مذہب کے درست ہے[1] مگر اہل دہلی کا کوئی استفتاء آپ کے فتاویٰ کے مجموعہ میں نہیں ہے ممکن ہے یہ سب کچھ زبانی رہا ہو۔ البتہ اسی موضوع پر شاہ بخاری کے نام آپ کا ایک دوسرا مدلل فتویٰ ضرور موجود ہے سوال ہے کہ " ہفتم آنکہ در تحصیل علم انگریزی مثلاً شخصے اشتغال آں دارد بر جواز و عدم آنچہ حکم آست "

جواب میں شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

" تعلیم انگریزی یعنی خط و کتابت و لغت و اصطلاح اینہا را دانستن، باکے ندارد اگر بنیت مباح باشد، زیرا کہ در حدیث وارد است کہ زید بن ثابت رضا بحکم صلعم روش خط و کتابت یہود و نصاریٰ و لغت آنہارا آموختہ بود برائے این غرض کہ اگر برائے آنحضرت صلعم خطے با لغت و رسم خط برسد جواب آں تو اند نوشت اگر محض خوش آمد آنہا و اختلاط بآنہا تعلیم این لغت نماید و بایں وسیلہ پیش آنہا تقرب جوید پس البتہ حرمت و کراہت دارد "[2]

انگریزی زبان کے متعلق شاہ عبدالعزیز رح کے اس طرح کے فتویٰ کی اچھی طرح پبلسٹی کی گئی تھی ہنٹر نے بھی اس فتویٰ کا ذکر کیا ہے[3]

شاہ عبدالعزیز رح کا یہ صاف صریح فتویٰ سرسید کی تعلیمی جدوجہد سے کم و بیش چالیس پچاس سال پہلے کا ہے۔

(۲) مولانا عبدالرحیم دہری شاہ عبدالعزیز (م ۱۲۳۹ھ) سے نسبت تلمذ رکھتے تھے۔

---

[1] سرسید احمد خاں اسباب بغاوت ہند۔ ۲۸/ ضمیمہ حیات جاوید [2] شاہ عبدالعزیز فتاویٰ عزیزیہ ۱۹۱ ۱۹۵ (دہلی ۱۳۱۱ھ) [3] ولیم ہنٹر: ہمارے ہندوستانی مسلمان ۲۶۲-۲۶۳/ (اردو) شائع کردہ اقبال اکیڈمی لاہور۔

اور شاہ اسمٰعیل شہید (م ۱۲۴۶) کے ہم درس تھے سر سید سے آپ نے بہت پہلے علوم جدیدہ اور ان کی ترویج و اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔[۱]

مولانا آزاد کا بیان ہے

"غدر سے پہلے ...... دنیا کا علمی انقلاب محسوس کیا اور نئے علوم سے آشنا ہوئے نیز یورپ کی زبانیں سیکھیں اور اس حد تک کامیابی حاصل کی جو آج باوجود نئی تعلیم کے عموم اور رواج کے کمیاب ہے" [۲]

فرید لکھتے ہیں۔

"مسلمان علماء میں انگریزی زبان اور نئے علوم کی ترویج کے کتنے ہی داعی گذر چکے ہیں مولوی عبدالرحیم ان سب میں مقدم ہیں ان کا زمانہ تو لارڈ میکالے کا زمانہ ہوگا مجھے ایک رسالہ مولوی عبدالرحیم کا فارسی میں ملا "عرض داشت در باب ترویج زبان انگریزی و علوم فرنگ" اس میں انھوں نے انگریزی زبان اور نئے علوم کی تحصیل و ترویج کے موضوع پر

---

[۱] مولانا عبدالرحیم دھریؔ کے بارے میں مولانا جعفر تھانیسری (۱۹۰۵) لکھتے ہیں مشہور دھریہ تھے انھوں نے خدا کا انکار کر دیا تھا۔ سورج کی تعظیم کرتے تھے وغیرہ وغیرہ (سوانح احمدی ۸/ ۵۲-۵۸) مولانا عبدالحی حسنی لکھتے ہیں کان یرمی بالزندقہ (نزہۃ الخواطر ۷/ ۲۵۹) لیکن ان کی خود نوشتہ سوانح حیات سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت بڑے فلسفی تھے تاہم مذہب سے ایک گونہ تعلق باقی تھا (جامعہ اپریل ۱۹۶۵ء) مولانا آزاد نے ان کے دھریہ ہونے کے بارے میں سخت تردد کا اظہار کیا ہے کہتے ہیں کہ بہت جستجو کی بجز شہرت عام کے کوئی ثبوت ان کی دھریت کا نہیں ملا عجب نہیں کہ عقلیات کے اشتغال و انہماک کی وجہ سے دھریہ مشہور ہوگئے ہوں (آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی ۶۸/ ۷-۳۴۶) مولانا مہر کا خیال ہے کہ فلسفہ میں توغل کے باعث دھریہ مشہور ہو گئے (سید احمد شہید ۱/ ۲۱۷) اور حقیقت بھی یہی ہے مولانا تھانیسری نے جو کچھ لکھا ہے حد درجہ مبالغہ آمیز اور ناقابل یقین ہے خصوصاً مولانا اسمٰعیل شہید سے مناظرہ کرنے سے فرار وغیرہ واللہ اعلم بالصواب۔ [۲] آزاد کی کہانی ۲۴۶/

جامع بحث کی ہے [1]

مولانا عبد الرحیم دھری اپنی خود نوشت سوانح حیات میں لکھتے ہیں۔

"انتہائی محنت سے بغیر معلم کے سہارے صرف ترجمہ فارسی و انگریزی گفتگو کی مدد سے کتنی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ریاضی اور علم ہئیت کی جدید کتابیں بھی پڑھیں۔ اس زمانے میں فیثاغورثی نظریہ کے مطابق اجرام سماوی کے متعلق جو میری معلومات پہلے سے تھیں اور بھی پختہ ہوگئیں۔ پھر تو روز بروز میرا شوق بڑھتا گیا اور انگریزی مصنفوں کی بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں اور اسی بنا پر ان کی تعریف کرتا ہوں اور سراہتا ہوں" [2]

مزید لکھتے ہیں۔

"اس وقت ۱۲۳۵ھ کی ابتدا رہے ہیں انگریزی کتابوں کے پڑھانے میں شب و روز مشغول رہتا ہوں میرا دل اس سے اس قدر مانوس ہوگیا ہے کہ اب دوسرے علوم کی طرف توجہ نہیں ہوتی" [3]

(۳) جناب قادر مرتضی صاحب (م ۱۸۶۶ء) مدراس کے مشہور امرا میں آپ کا شمار ہوتا ہے آپ مولوی صبغۃ اللہ الدین محمد ناصر کے اکلوتے صاحبزادے تھے انگریزی زبان کے متعلق ان کا کیا نظریہ تھا اس کی تفصیل مولانا محمد یوسف صاحب کوکن عمری کی زبانی سنئے لکھتے ہیں:

"مدراس بلکہ ہندوستان بھر کے علماء وفضلاء اور امرا میں (جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے) آپ پہلے شخص ہیں جنھوں نے انگریزی نظام کی حمایت اور سرپرستی کی، انھوں نے اس زمانے میں اس کی حمایت کی، جبکہ سرسید احمد خاں ابھی تک اس میدان میں گامزن نہیں ہوئے تھے انھوں نے خود اپنی اولاد کو صاف الفاظ میں یہ نصیحت کی کہ انگریزی تعلیم کی مخالفت بے سود ہے" [4]

---

[1] آزاد کی کہانی ص ۲۶۰ [2] جامعہ (اپریل ۱۹۷۵ء) [3] ایضاً [4] محمد یوسف کوکن عمری خانوادہ قاضی بدرالدولہ، ج ۲، ص ۳۵ - ۳۴

(۴) مولوی سعید الدین برائے بریلوی (م ۱۲۹۳ھ) سر سید سے بہت پہلے آپ نے انگریزی تعلیم حاصل کی تھی مولانا عبد الحیٔ لکھتے ہیں۔

احد الرجال المعروفین بالفضل والصلاح سافر الی دھلی ثم رجع الی کلکتہ وتعلم الانکلیزیۃ ثم اعتزل واقام ببلدہ توفی سنۃ اربع وسبعین[1]

مولانا علی میاں ندوی لکھتے ہیں۔

"کلکتہ کے قیام میں ایک انگریز سے انگریزی پڑھی اور وکالت کا امتحان دیا اور مظفر پور میں وکیل سرکار مقرر ہوئے، دیانت تقوی اور نیک نامی کے ساتھ وکالت کی ۵۷ء کے ہنگامے کے بعد خانہ نشین ہو گئے"۔[2]

(۵) مولانا عبد الهادی جھومکوی (م ۱۲۶۵ھ) خلیفہ سید احمد رائے بریلوی۔ درسیات کی تکمیل مولانا اسماعیل اور مولانا ولایت علی عظیم آبادی (م ۱۲۶۹ھ) اور شاہ اسحاق (م ۱۲۶۲ھ) سے کی تھی، انگریزی کے عمدہ عالم تھے[3]

(۶) مولوی سید امیر احمد (م ۱۳۰۸ھ) مولانا عبد الباقی سہوانی آپ کے بارے میں لکھتے ہیں "تکمیل کے بعد حج بیت اللہ کیا پھر قانون وکالت درجہ اول کا امتحان پاس کیا اور انگریزی زبان میں اعلیٰ قابلیت حاصل کی یہ سب کچھ سرسید کی تحریک سے پہلے کی بات ہے"[4]

(۷) مولانا محمد احسن نانوتوی (م ۱۸۹۵ء) موصوف کی پیدائش ۱۸۲۵ء میں ہوئی تعلیم سے فارغ ہو گئے تو ۱۸۵۰ء میں آپ نے ملازمت اختیار کر لی اس سے قبل آپ نے انگریزی سیکھ لی تھی۔

پروفیسر ایوب قادری صاحب لکھتے ہیں کہ

---

[1] عبد الحیٔ حسنی نزھۃ الخواطر ۷/۲۰۰ [2] ابو الحسن علی میاں سیرت سید احمد شہید ۱/۲۲۲ لکھنو ۱۹۴۱ء
[3] نزھۃ الخواطر ۷/۳۱۶ [4] عبد الباقی سہوانی حیات العلماء لکھنو ۱۹۲۶ء

"مولانا محمد احسن نانوتوی نے دہلی کالج میں انگریزی بھی پڑھی تھی"

خود مولانا محمد احسن کے ہاتھ کی بعض انگریزی تحریریں ہیں۔مولانا محمد احسن نے سرسید احمد کی فرمائش پر کاڈفری ہیکنس کی کتاب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا[۱]

آپ نے اپنے ربیب مولانا عبدالاحد (م۱۹۰۲ء) (مالک مطبع مجتبائی) کو درس نظامیہ کی تکمیل کے بعد انگریزی تعلیم دلوائی چنانچہ ۱۸۶۹ء میں بریلی کالج سے انٹر پاس کیا[۲]

(۸) سید عبدالفتاح الحسینی گلشن آبادی (م ۱۲۹۵ھ) تکمیل کے بعد مختلف جگہ قضا کے عہدوں پر فائز رہے ۱۸۲۵ء میں الفنسٹن ہائی اسکول بمبئی میں ملازمت اختیار کرلی (حکومت کی طرف سے جسٹس آف دی پیس کا خطاب بھی ملا) مجھے یہ تصریح تو نہ مل سکی کہ انگریزی تعلیم حاصل کی تھی البتہ آپکی تصانیف میں ایک ایسی کتاب بھی شامل ہے جس میں انگریزی حکایتوں کا ترجمہ کیا گیا ہے[۳] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی یقیناً جانتے تھے۔

(۹) مولانا عنایت رسول چریاکوٹی (م ۱۳۲۰ھ) مشاہیر علماء میں تھے۔ اور عربی، عبرانی اور فارسی کے زبردست ماہر، آپ کے بعض تذکرہ نگاروں کا بیان اگر صحیح مان لیا جائے تو سرسید کو انگریزی تعلیم کی ترویج و اشاعت پر آمادہ کرنے والے پہلے بزرگ آپ ہی تھے۔ خود بھی انگریزی سیکھی، اور اطراف اعظم گڑھ میں مسلمانوں کو انگریزی تعلیم پر آمادہ کیا[۴]

(۱۰) مولوی اشرف علی بن مولانا احمد اللہ عظیم آبادی (م ۱۹۰۸) خاندان صادق پور کے لائق فرزند تھے مولانا عنایت علی صاحب کے ہمراہ افغانستان چلے گئے، یہاں ۱۴ سال گذار کر ہندوستان واپس آئے اور ۱۸۶۰ء میں مفتی صدرالدین سے بقیہ درسیات کی تکمیل کی پھر یہیں سے انگریزی تعلیم حاصل کرنی شروع کی، اور بنارس میں قیام کرکے انگریزی تعلیم

---

[۱] محمد ایوب قادری مولانا محمد احسن نانوتوی/۲۵ (کراچی ۱۹۶۶ء) [۲] ایضاً/۱۶۱ [۳] عیمونہ دلوی: بمبئی میں اردو/۳۴-۱۳۳ [۴] ڈاکٹر معتصم عباسی، اسلام اور عصر جدید، ۵/شمارہ ۳-۲،

مکمل کی لہ اس کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ آپ کو انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے والے مفتی صدر الدین کے بھانجے تھے انھوں نے ہی مولوی اشرف کو انگریزی تعلیم کی حاصل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ ۲؎

بنارس میں تعلیم کے لئے قیام کا زمانہ ۱۸۷۰ء کے لگ بھگ ہے کیونکہ ۲۶ دسمبر ۱۸۷۰ء کو سرسید احمد نے ان اسباب کا پتہ لگانے کے لئے کہ "مسلمان انگریزی تعلیم کیوں نہیں حاصل کرتے" جو انعامی مذاکرہ منعقد کیا تھا اس کا پہلا انعام آپ ہی کو ملا تھا۳؎ حالی نے تصریح کی ہے آپ اس وقت بنارس کالج میں پڑھتے تھے ۴؎

(۱۱) امجد علی بن یحیٰی علی صادق پوری (م ۱۹۳۱ء) آپ نے بھی مولانا اشرف علی کی طرح سرحد کا سفر کیا اور انھیں کے ساتھ واپس آگئے، اور انھیں اشرف علی صاحب کی زیر نگرانی انگریزی تعلیم حاصل کی پھر زندگی بھر مختلف کالجوں میں تدریس کی خدمت انجام دی ۵؎ اور اسی کو اہم قومی خدمت سمجھتے رہے ۶؎

(۱۲) مولانا محمد حسن بن مولانا غازی ولایت علی صادقپوری (م ۱۸۸۹ء) مولانا عبد الرحیم (م ۱۳۴۱ھ) مولانا یحیٰی علی (م ۱۲۸۴ھ) مولانا احمد اللہ (م ۱۲۹۸ھ) کے وہابی سازشی کیس میں ماخوذ ہونے کے بعد خاندان صادقپور کی سرپرستی کا سارا بار آپ کے کندھوں پر آپڑا تھا آپ نے خود بھی معمولی انگریزی تعلیم حاصل کی، اور مولوی موسٰی (۱۳۶۶ھ) مولوی محمود الحسن ڈاکٹر بیت اللہ وغیرہ کو اعلیٰ انگریزی تعلیم دلائی، اور عام مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کو رواج دینے کے لئے ۱۸۸۴ء میں "محمڈن لائف اینگلو عربک" کے نام سے ایک کالج قائم کیا ۷؎

لہ مولانا عبد الرحیم: تذکرہ صادقہ /۹۵ (پٹنہ ۱۹۶۴ء) ۲؎ ایضاً /۹۴ ۳؎ حالی: حیات جاوید ۱/۱۵۳، عبد الرحیم: تذکرہ صادقہ /۹۵، ۴؎ حیات جاوید ۱/۱۵۳، ۵؎ تذکرہ صادقہ /۱۳۶-۱۲۱، ۶؎ ایضاً /۱۳۱، ۷؎ ایضاً /۲۱۱، مولانا عبد الرحیم لکھتے ہیں اگرچہ عربی زبان میں مہارت نہ تھی، مگر علوم مغربی سے بھی بہت شوق تھا، جو کتابیں علوم مغربی میں اردو ترجمہ ہو گئی ہیں ان کا مطالعہ کرتے تھے ۲۱۱/

(۱۳) مولانا جعفر تھانیسری (م ۱۹۰۵ء) اپنے بارے میں لکھتے ہیں، "۱۸۷۰ء میں ایک برس کی محنت میں مجھ کو انگریزی پڑھنے لکھنے میں خوب مہارت ہوگئی .... میں نے انگریزی سیکھ کر بڑے کتب خانوں کی سیر کی ..... انگریزی زبان علم و فنون کا گھر ہے جو انگریزی نہیں جانتا وہ بلاشبہ دنیا کے حالات سے بخوبی ماہر نہیں مگر فقط زبان انگریزی کا سیکھنا اتنا مضر نہ ہوگا، صرف کتب بعض علوم کی جو تعلیم انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے خلاف ہیں ایک ایسے شخص کو جو اصول مذہب سے پوری طرح واقف نہیں ضرور ملحد اور بد دین کر دیویں گی"[۱]

(۱۴) مولانا رحمت اللہ فرنگی محلی (م ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء) سرسید کی تکفیر کے فتوی پر مولانا رحمت اللہ صاحب فرنگی محلی کا دستخط بھی ثبت ہے مگر سرسید کی تحریک سے پہلے ہی آپ نے مسلمانوں کے لئے انگریزی اور علوم جدید کی تعلیم کا معقول انتظام کیا تھا۔

مولانا عبدالحئی حسنی (م ۱۳۴۱ھ) لکھتے ہیں "رحل الی غازیفور و اسس بھا مدرسۃ بمساعدۃ اھلھا و ادخلھا اللانکلیزیۃ"[۲]

آپ نے اس مدرسہ کی بنیاد ۱۸۶۹ء میں رکھی تھی جس کا مقصد "دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے مطابق ماحول میں عربی، فارسی اور اردو کی اعلی تعلیم اور زمانہ کی ضرورت کے تحت علم ریاضی، اقلیدس اور علم انگریزی کی تعلیم کا انتظام مڈل کی سطح تک کیا تھا"[۳]

۱۸۷۴ء میں سر ولیم میور نے مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور کا معائنہ کیا تھا معائنہ کے تاثرات میں لکھا کہ "اس مدرسہ میں اعلی درجہ کی تعلیم عربی فارسی اور انگریزی کی ہوتی ہے"[۴]

(۱۵) مولوی محی الدین (م ۱۸۹۳ء) آپ نے علوم دینیہ کی تکمیل کے بعد ۱۸۳۳ء میں انگریزی حاصل کرنی شروع کی اور تین سال میں تکمیل کی[۵]

---

[۱] جعفر تھانیسری: کالا پانی، ۸۴ (اقبال اکیڈمی لاہور) [۲] عبدالحی حسنی، نزہتہ الخواطر، ۱۴۸/۸
[۳] چشمہ رحمت تاریخ کے آئینہ میں ۹-۱۲/ [۴] ایضاً ۱۸/ [۵] احمد علی خاں شوق: تذکرہ کاملان رام پور، ۴۰۲/ (رامپور)

(۱۶) مولوی محمد علی خاں (م ۱۹۱۲) آپ نے ۱۸۶۱ء میں انگریزی سیکھنی شروع کی اور ۱۸۶۷ء تک اس میں کامل دستگاہ حاصل کرلی۔[۱]

یہ چند ایسے علمار کی ایک سرسری فہرست ہے جنھوں نے سرسید سے پہلے انگریزی تعلیم حاصل کی تھی یا اس کے جواز کا فتویٰ دیا تھا یہ فہرست یقیناً مکمل نہیں ابھی اس میں متعدد علمار کا اضافہ ہوسکتا ہے لیکن نہ استیعاب مقصود ہے اور نہ اس کی گنجائش ہی ہے، ثابت صرف یہ کرنا ہے کہ ان تمام علمار نے سرسید سے پہلے بھی قول و عمل سے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ انگریزی تعلیم ہرگز حرام اور ناجائز نہیں پھر کیسے ممکن ہے کہ بعد میں یہ علمار کرام اس کو حرام یا ناجائز ثابت کرتے ؛

سرسید کے زمانے میں اب ہم چاہتے ہیں کہ یہ دیکھیں سرسید کے ممتاز معاصر علمار کرام کا نظریہ اس باب میں کیا تھا، لیکن اس جائزہ میں ہم صرف ان علمار کرام کو شامل کریں گے جنھوں نے یا تو سرسید کی تکفیر کی ہے یا ان کی مخالفت میں سرگرم حصہ لیا ہے ورنہ اگر ان کے تمام معاصر علمار کرام کی آرار کو جمع کریں، تو ایک مستقل کتاب بن جائے گی۔

(۱) مولانا عبدالحئی فرنگی محلی (م ۱۳۰۴) سرسید کی تکفیر پر آپ کے فتویٰ کا ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے مولانا حالی نے اس فتویٰ کی شدت کا بطور خاص شکوہ کیا ہے[۲] لیکن انگریزی تعلیم کے جواز پر آپ کے متعدد فتوے موجود ہیں یہاں صرف ایک فتویٰ ملاحظہ ہو فرماتے ہیں۔

"فی الواقع نفس تعلیم [illegible] جیسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ثابت کو یہودی زبان سیکھنے کا حکم کیا جیسا کہ جامع ترمذی وغیرہ میں ہے اور ملا علی قاری کی شرح مشکوٰۃ میں ہے، لا یعرف فی الشرع تحریم علم لغۃ من لغات سریانیۃ کانت او عبرانیۃ أو ترکیۃ أو غیرھا۔[۳]

فتاویٰ کی اسی جلد میں دو اور مدلل اور مفصل فتوے ہیں نیز تیسری جلد میں بھی اسی طرح کا

---

[۱] احمد علی خان شوق تذکرۂ کاملان رام پور ۲۴۳[۲] حالی: حیات جاوید، ۲/۲۵۲، [۳] عبدالحئی لکھنوی، مجموعہ فتاویٰ عبدالحئی ۲/۴۵ (لکھنو ۱۳۲۵ھ)

ایک فتوی ہے[۱] ظاہر ہے کہ اس فتوی کی موجودگی میں مولانا پر یہ حکم لگانا کہ " انگریزی تعلیم کو حرام سمجھتے تھے بے انصافی ہے۔

(۲) مولانا نذیر حسین محارث دہلوی (۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء) سرسید کی تکفیر کے فتوی پر آپ کا دستخط بھی ہے[۲] سرسید نے ان کے فتوے کی شکایت کی ہے[۳]۔ لیکن جہاں تک انگریزی تعلیم کا سوال ہے آپ کی رائے دوٹوک سی ہے،

آپ کے سوانح نگار مولانا فضل حسین مظفر پوری لکھتے ہیں، میاں صاحب انگریزی تعلیم کو جائز کہتے تھے[۴] آپ کے مجموعہ فتاوی میں اس سے متعلق ایک مستقل فتوی موجود ہے فرماتے ہیں بغرض حصول معاش و رفع حاجت کے انگریزی پڑھنی جائز ہے جامع ترمذی میں زید بن ثابت سے روایت ہے (اس کے بعد پوری روایت نقل کی ہے)[۵]

(۳) مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۲۹۷ھ) مولانا کا تذکرہ بھی سرسید کی تکفیر کے سلسلہ میں بار بار کیا جاتا ہے دیوبند مکتبہ فکر کے قائد ہونے کی وجہ سے علی گڑھ اور دیوبند کا تذکرہ جب بھی آتا ہے آپ کا تذکرہ ناگزیر ہو جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ارباب دیوبند انگریزی تعلیم کو حرام بتلاتے تھے مولانا مناظر احسن گیلانی (۱۹۵۶ء) نے بڑے درد و کرب کے ساتھ لکھا ہے کہ "جدید علوم وفنون کے سوال سے جو یہ باور کر لیا گیا ہے یا اب باور کرایا جا رہا ہے کہ ہمارے علماء قطعاً خالی الذہن تھے افترا یا اتہام کے سوا وہ کچھ نہیں ہے[۶] اور واقعہ بھی یہی ہے مولانا نانوتوی نے دارالعلوم کے سالانہ جلسہ میں جو کچھ کہا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ایک حصہ یہاں نقل کر دیا جائے (باقی)

---

[۱] مجموعہ فتاوی عبدالحی ۲/۳۵۵-۳۴۸، ۲/۳۴ [۲] امداد الآفاق، فتاوی علماء دہلی [۳] امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، بحوالہ تہذیب الاخلاق یکم جمادی الثانی ۱۲۹۰ھ جدید پرنٹنگ پریس [۴] فضل حسین مظفر پوری، الحیات بعد الممات، ۲۰۴، آگرہ، ۱۹۰۷ء [۵] فتاوی نذیریہ، ۲/۵۲ [۶] مناظر احسن گیلانی سوانح قاسمی، ۳/۲۸۰-۲، (دیوبند ۱۳۷۳ھ)

مخطوطات کے اختتامیے اور ان کے کاتب

از: جناب ڈاکٹر شعیب اعظمی لیکچرر فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

ہندوستان میں ہاتھ سے لکھی گئی کتابوں کا وہی مرتبہ ہے جو اسلامی عہد کے دیگر فنون کا تھا۔ اگر اس کوشش کا سہرا ایک طرف سرپرست بادشاہوں۔ شہزادوں، اُمرا اور اہلِ علم کے سر پر ہے تو دوسری طرف اس فن کو معراج پر پہنچانے کا کام اُن خطاطوں، کاتبوں اور اہلِ شوق کا ہے جنھوں نے بڑے بڑے صحیح دواوین ملفوظات، تاریخ، سوانح، فقہ وحدیث اور تفسیر وادب کے گرانقدر سرمایہ کو اپنے جادو نگار قلم سے نہ صرف صفحۂ قرطاس پر محفوظ کر دیا۔ بلکہ خوش خطی کے مختلف طرزوں میں مطلا، مذہب اور رنگا رنگ حاشیوں اور تصویروں سے مزین بھی کیا۔

ہمارے ملک میں اگرچہ فن قدیم تھا مگر مسلمانوں کے ورود کے ساتھ ایک نئی شکل میں آیا عربی اور فارسی زبان کے جو دستی نسخے ان کے ساتھ آئے اُن کی نقل یہاں کے خطاطوں نے کی۔ اپنے موئے قلم سے دیگر فنی اضافے کئے۔ ایران وعرب اور وسط ایشیا کے خطاطوں کے مانند کتاب کے آغاز واختتام کا انداز بھی اسی طرح کیا اور کتاب کے آخر میں اپنے مربی، محسن بزرگ، مرشد، بادشاہ یا امیر کے حسب ونسب کے مدحیہ ذکر کے بعد خود اپنا نام، لکھنے کی جگہ، ابتدا وانتہائی تاریخ شہر اور پھر یہ کہ وہ نسخہ کن کن نسخوں کی مطابقت کے بعد لکھا گیا۔ کہاں سے حاصل کیا گیا۔ یہ تمام معلومات کچھ نثر میں اور اکثر وبیشتر نظم میں ہم پہنچائی ہیں۔

ان معلومات کے علاوہ بیشتر کاتبوں نے آخری جملوں میں اپنے لئے والدین کے لئے دعائیہ کلمات اور اشعار بھی لکھے ہیں۔ یہ اشعار اور قطعات بہت دلچسپ ہیں۔ بعض اوقات اپنے، ابسا اوقات دوسروں کے بابشتر روایتی اور مروجہ شعر یا "قلمی نسخوں کے ان کاتبوں نے کتاب کے قارئین سے معذرت کی ہے، مغفرت کی درخواست کی ہے اور ا، بنی مساعی جمیلہ کے باوجود انسان کی بے بضاعتی اور خطا کاری کا واسطہ دیا ہے۔

یہ تمام مطالب جو کتاب کے مولف یا مصنف یا کاتب کے قلم سے ادا ہوتے رہے ہیں انھیں انگریزی کی علمی اصطلاح میں CALOPHAN کہا جاتا ہے اور ہمارے ادب میں اسے تمۂ کتاب یا خاتمۃ الکتاب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

گذشتہ آٹھ نو سو سال میں ہزاروں کیا لاکھوں کی تعداد میں قلمی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اور نسخے نقل ہوئے ہیں اور ان تمام کی کتنی نقلیں ہوئی ہوں گی۔ اس کی تیاری میں کتنے ماہر خطاطوں نے حصہ لیا ہوگا۔ اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ آج اس گئے گذرے دور میں بھی ہندوستان کے کتب خانوں، عجائب گھروں، قومی لائبریریوں اور بیرون ملک کی لائبریریوں میں جتنا ذخیرہ موجود ہے اس پر ایک نظر ڈالنا آسان نہیں ہے۔ اگر ان تمام کتابوں کے ناقلوں اور کاتبوں کی ایک انسائیکلوپیڈیا تیار کی جائے تو کئی جلدیں تیار ہوں گی اور کلاسیکی ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ ہوگا۔

یہ کتابیں زیادہ تر فارسی اور عربی میں ہیں اور آخر میں اردو کے کچھ قدیم خطی نسخوں کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ آج ان نسخوں کو آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کچھ لوگ انھیں دکھانے سے گریز کرتے ہیں۔ اگرچہ اونے پونے فروخت بھی کر دیتے ہیں لائبریریوں میں اور میوزیموں میں موجود کو دیکھنے میں فنی رکاوٹوں کے علاوہ انتظامی دشواریاں حائل ہو جاتی ہیں۔ اور کسی پرانے نسخے کی تو صورت دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بیشتر نسخے کس مپرسی کے عالم میں اور انکے اول اور آخر کا پتہ نہیں چل پاتا۔ کاتب کا نام تاریخ

غائب اور کس عہد کا ہے پتہ نہیں چلتا، پھر بھی اس حالت میں اکا دکا ایسے نسخے مل جاتے ہیں جو عہد بعہد لکھی جانے والی کتابوں کے انداز مصنفوں اور کاتبوں کے نام اور ان کے دعائیہ کلمات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ زیر نظر مضمون میں انھیں منتشر نسخوں میں کچھ کے نمونوں کا ذکر ہے تاکہ ہم کو ان لوگوں کے دور، طرز تحریر اور رواجی اختتامیوں کا اندازہ ہو سکے۔

۱۰ ویں ہجری

۱- کلیات و جزئیات | ضیاء الدین بخشی متوفی ۷۵۰ کی تصنیف ہے عبد الحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں اس کا ذکر کیا ہے۔ خط کوفی میں یہ کتاب ۹۱۹ ہجری میں لکھی گئی ہے۔ کاتب کا نام غائب اور صرف تاریخ کتابت کا پتہ چل سکا ہے۔ کیوں کہ اختتامیہ کے آخری تین مصرعے بالکل غائب ہیں۔ اختتامیہ یوں ہے :-

ہم بعون بی نیاز از ہر صفات	شد مرتب جزییات کلیات
ناصح العلما و عالم را امام	ناصر الفقرا نصیر الدین نظام
مالک این نسخہ شیرین ہمو نسب	آنکہ خلقش تدز جان وارند دوست
بود ہجری نہصدم و نوزدہ	نوزدہ بود از محرم این بہرہ
در دو شنبہ باد کز وقت ضحا	کاتب این از نبشتن شد گذا
بر تحریر بادہ ظاہر گشت مشک	ــــــــــــ
ای ہسان ــــــــ	ــــــــــــ

تاریخ کتابت کے ساتھ صرف اس کتاب کے اصل نسخہ کے مالک نصیر الدین نظام کا پتا ہے جو عوام میں بہت مقبول تھے۔

۱۱ ویں ہجری

۲ مرصاد العباد | نجم الدین کبریٰ کی تصنیف ہے اور عہد اسلامی میں علما و مشائخ کے حلقوں

اور دینی مدارس کے نصاب میں داخل رہی ہے۔ ۱۳۸۱ میں تہران سے بھی شائع ہو چکی ہے موجودہ نسخہ ۱۰۲۰ ہجری کا لکھا ہوا ہے اور خط نستعلیق ہے کاتب کا نام غائب ہے اور خاتمہ کتاب پر صرف اتنا درج ہے:۔

ہر کس کہ ازین بہرہ قرأة یابد دعائی معفرت کند مر کاتب را یاد

۳۔ ملفوظات قادریہ گجرات یہ نسخہ بھی تاریخ کتابت ظاہر کرتا ہے کاتب نامعلوم خط نستعلیق ہے کتاب پر ۱۳۳۱ ہجری کی مہر لگی ہے اور کتاب کے مالک کا نام تقوی حسینی پیرزادہ سید بشیر الدین احمد کا نام ہے خاتمہ اس قطعہ پر ہے:۔

یافتہ اتمام این نسخہ بعون ذوالجلال سال پنجاہم بر الف از ہجرت خیر الانام
باد صلواۃ و سلام بیکران در روح پاک احمد مرسل شفیع ماست در یوم القیام

۴۔ اسکندر نامہ نظامی ملک کے بیشتر کتب خانوں میں اس کے قلمی اور مطبوعہ دونوں نسخے بکثرت موجود ہیں۔ زیر نظر نسخہ ۹۶۳ھ ہجری کا خط نستعلیق میں ہے اس کے کاتب عزیز خان شاہ شجاع کے دور کے ہیں۔ آخری عبارت یوں ہے:۔

"ہر کہ دعوئی کند نامسموع و باطل گردد و ہر کہ خواند بمقام صحیح عفو فرماید"

۵۔ شرح نفحات الانس جامی مولانا نور الدین کی اس مشہور تصنیف کے بھی متعدد نسخے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ زیر مطالعہ نسخہ نہایت خستہ اور شکستہ ہے اور قدیم معلوم ہوتا ہے۔ خط نستعلیق اور جلی ہے۔ افتتاحیہ پہلے عربی نثر میں ہے۔ اور اس کے بعد شعر ہے۔ عربی کی عبارت اس طرح ہے جس سے کاتب کا نام، لکھنے کی جگہ اور سن کا پتہ چل جاتا ہے

ھذہ النسخۃ الشریفۃ فی الیوم الخمیس سادس شہر رجب المرجب (۱۱۳۷ھ) الف ومائۃ وثلثین وسبع من الھجرۃ فی البقعۃ المبارکۃ المیمونۃ المسمی بالدھلی حرسہ اللہ بالآفات الرذیلۃ واللہ اعلم بالصواب۔

غرض نقش است کز ما باز ماند که ہستی را نمی بینم بقائی

مگر صاحبدلی روزی برحمت کند در حق این مسکین دعائی

یلوح الخط فی القرطاس دہراً وکاتبہ رمیم" فی التراب

فارسی کا یہ قطعہ ایران میں نوین ہجری میں انیس العشاق نامی کتاب میں دیکھا گیا ہے۔ تہران یونیورسٹی کی لائبریری میں یہ نسخہ موجود ہے۔ اور اس کے کاتب نعمت اللہ درویش ہیں۔

عربی کا شعر ایران میں ساتویں ہجری، آٹھویں، نویں اور دسویں ہجری کے متعدد نسخوں میں ہے اور سب سے پہلے ایران میں جعفر بن محمد بن رجا کوفی نے "المحاسن" کے خطی نسخہ میں استعمال کیا۔

۶۔ شرح نفحات الانس۔ مولانا جامی کی اس شرح کے شارح احنف ہمدانی ہیں۔ یہاں کے قلمی نسخہ کی کتابت ۱۲۰۸ھ ہجری ہے۔ اور اختتامیہ پہلے نثر میں اور پھر شعر پر اس طرح ہوتا ہے:۔

حسب الامر پیر مرشد برحق دستگیر شاہ علی اکبر صاحب بیشک کتاب حاشیہ نفحات الانس راقم فقیر سید علی ولد جید علی باستعمال تمام بتاریخ نوزدہم شہر شوال المعظم سن ۱۲۰۸ ہجری باتمام رسائید توقع از قاریان آنست کہ این کاتب را بدعا یاد فرمایند:۔

ہر کہ خواند دعا طمع دارم زانکہ من بندۂ گنہ گارم

فارسی کے اس شعر کا سب سے پہلا استعمال ایران میں گیارہویں ہجری میں گدا علی مازندرانی نے مجموعہ در انتہائی رسالہ جراحی" میں کیا ہے۔

۷۔ فتاوی برہنہ۔ شمس الائمہ سرخسی کی تصنیف ہے۔ خط نستعلیق میں بڑی تقطیع پر ہے کاتب کا نام غائب ہے اور نثری عبارت کے بعد تقریباً اس عہد کے تمام دستیاب کتابوں کے مروجہ اختتامی اشعار نقل کر دیئے ہیں:۔

بتاریخ بست و پنجم شہر محرم الحرام روز دوشنبہ ۱۱۲۳ جلوس شاہ بہادر مطابق ۱۱۲۳ھ

کاتب اضعف العباد و کمترین مخلوقات،

نوشتہ بماند سیہ بر سفید	نویسندہ را نیست فردا اُمید

ایران میں تیرہویں ہجری کی ابتدا میں یہ شعر اسکندر نامۂ نظامی میں استعمال ہوا ہے۔

خط نوشتم صرف کردم روزگار	من نمانم این بماند یادگار

یہ شعر دسویں ہجری میں ایران میں شرایع مورخ اور ۱۱ ویں ہجری کے ایک ایرانی نسخہ الروضۃ البہیۃ میں لکھا گیا ہے۔

ہر کہ ما را کند بہ نیکی یاد	نامِ او در جہان بہ نیکی باد

ایران میں گیارہویں ہجری میں معارج النبوۃ میں لکھا گیا ہے۔

قاریا بر من مکن چندین عتاب	گر خطائی رفتہ باشد در کتاب
آن خطائی رفتہ تصحیح کن	از کرم واللہ اعلم بالصواب

دسویں ہجری میں مصباح کفعمی کے فارسی ترجمہ میں حسین بن فاضل حسینی نے اور پھر تیرہویں ہجری میں "مرسلات صابی میں یہ قطعہ موجود ہے۔ دیگر متفرق اشعار اس طرح ہیں:

خط خوب از من مسکین چہ طمع میداری	کہ دل از گردش دوران پریشان دارم
ہر کہ خواند دعا طمع دارم	زانکہ من بندۂ گنہگارم
نوشتہ بماند بخط سیاہ	نویسندہ را باد حفظ الٰہ
نوشتہ نماند بخط غریب	نصر من اللہ فتح قریب
بیادگار نوشتم من این کتابت را	دگر نہ این خط من لایق کتاب نبود
یلوح الخط فی القرطاس دہراً	وکاتبہ رمیم فی التراب

۸۔ تحفۃ الکرام۔ ۱۱۸۹ھ کی کتابت ہے۔ مصنف قانع تتوی ہیں۔ مشہور تذکرہ ہے۔

کاتب کا نام غائب ہے اور خود مصنف کا اختتامیہ نقل کر دیا گیا ہے:۔

قانع این راہ دور و دراز ‏ ‏ ‏ ‏ می کند طی بنام عجز و نیاز

ہر کہ گردد دلیل مقصد او ‏ ‏ ‏ ‏ باد در دامنش نیاید از

۹۔ دیوان عبد القادر گیلانی۔ ۱۱۹۳ھ میں خط نستعلیق میں کتابت ہوئی ہے کاتب کا نام عبد الہادی ہے۔ صرف ایک شعر پر اکتفا ہے:۔

ہر کہ خواند دعا طمع دارم ‏ ‏ ‏ ‏ زانکہ من بندۂ گنہگارم

۱۰۔ مثنوی معنوی۔ خط نستعلیق میں ۱۱۹۷ھ جلوس ۲۴ سنبت ۱۸۳۹۔ چہارم محرم کی کتابت ہے۔ اس نسخہ کے مالک خوب چند میوہ لال اور ۲۷ شعبان ۱۲۲۵ ہجری کو حسین بخش نامی کی مہر ہے کاتب غائب، خاتمہ یوں ہے:۔

طمع دارم کہ گر ناگہ شکر فی ‏ ‏ ‏ ‏ بخواند زین کتب نامہ حرفی

ز رائی فکر گر بیند خطائی ‏ ‏ ‏ ‏ نیاید بر سر من ماجرائی

۱۱۔ تذکرہ الاربیا۔ فرید الدین عطار کی تصنیف دارا شکوہ کے عہد کی ہے۔ ۱۲۰۰ ہجری میں لکھی گئی ہے۔ کاتب کا نام محمد حسین ہے خط نستعلیق میں ہے اور تتمہ کا شعر یہ ہے۔

گر کسی خواند دعا از جان کند ‏ ‏ ‏ ‏ نیبر تقبی سالما ایمان کند

۱۲۔ دلائل الخیرات۔ ابو عبد اللہ محمد بن سلیمان کی تصنیف ہے۔ نسخہ بغیر کاتب کے نام کا مطلا ہے حاشیہ مذہب ہے اور نسخہ نایاب ہے۔ خاتمہ عربی کے شعر یہ ہے:۔

یلوح الخط فی القرطاس دہراً ‏ ‏ ‏ ‏ وکاتبہ رہیم فی التراب

۱۳۔ حملہ حیدری۔ خطاطی کا نایاب نمونہ ہے۔ ۱۲۰۴ھ ہجری میں کشمیر میں احمد علی نامی شخص نے کتابت کی ہے پہلے نثر میں اور پھر نظم میں خاتمہ کیا ہے۔

امید از ناظرین و بینندگان آنکہ در ہر جائی غلطی شاہدہ نمایند آنرا از منقول عنہ تصور نمایند باصلاح و تصحیح آن کوشند و کاتب بیچارہ را بدعائی

مغفرت یاد فرماباشند"

من نوشتم صرف کردم روزگار　　من نمانم این بماند یادگار

ایران میں اسکندرنامۂ نظامی کے تیرہویں ہجری کے خطی نسخہ میں یہ شعر موجود ہے۔

۱۴۔ خیالات خسروی۔ امیر خسرو کے نام سے غلط طور پر منسوب ہے۔ ہندوستان میں اس کے کئی نسخے ہیں۔ زیر نظر نسخہ ۱۲۳۵ ہجری کا ہے۔ اور نستعلیق خط میں ابراہیم کاتب کی لکھی ہوئی کتابت ہے۔ آخر میں کئی اشعار ہیں:۔

یادگاری گر آدمی راہست　　سخن است دو گرہمہ باداست

گر بدی گوہری برائی سخن　　از فرد دآوری بجائی سخن

ہر کہ خواند دعا طمع دارم　　زانکہ من بندۂ گنہگار م

نوشتہ بماند سیہ بر سفید　　نویسندہ راہست فردا امید

۱۵۔ یوسف زلیخائی جامی۔ اس مشہور مثنوی کے کاتب محمد حسین ہیں اور ارکاٹ میں اس نسخہ کی کتابت ہوئی ہے۔ مگر سن کتابت معلوم نہ ہوسکا۔ اختتامی اشعار ذیل کے ہیں:۔

خدا اور اوحد عالی مراتب　　کہ خوانند فاتحہ در حق کاتب

غریق رحمت یزدان کسی باد　　کہ کاتب را بہ الحمد کند یاد

تہران یونیورسٹی میں شریف جرجانی کی شرح مفتاح العلوم ۸۵۶ھ ہجری میں لکھے گئے نسخہ میں یہ اشعار پہلی بار استعمال ہوئے ہیں اور اس کے کاتب ابی الحمد محمد بن عثمان بن مسعود ہیں۔

۱۶۔ فتوح الحرمین۔ جامی کی مشہور و معروف تصنیف کا عمدہ مصور اور منقش نسخہ ہے ۱۲۵۶ھ کی کتابت خط نستعلیق میں ہے۔ آخر میں عباس علی کاتب نے نعلین مبارک کا خاکہ بھی پیش کیا ہے۔ تمتہ اس شعر پر ہے:۔

تا رہا بر من مکن خشم و عتاب　　من نوشتم آنچہ دیدم در کتاب

ایران میں دسویں ہجری کے وسط میں اور تیرھویں ہجری کی ابتدا میں متعدد نسخوں میں یہ شعر موجود ہے۔

۱۷۔ سفینۃ الاولیا۔ دارا شکوہ کی تصنیف کے کاتب سید عبداللہ حسینی گلشن آبادی نے خط نستعلیق میں ۱۲۷۲ ہجری میں کتابت کی اور نثر میں اختتامیہ کی عبارت اس انداز میں لکھی ہے۔

این اوراقِ نو خاکپائی خلق اللہ فقیر حقیر سید عبداللہ حسینی گلشن آبادی در معمورہ ۔۔۔۔ نوشتہ بتاریخ چہارہم ماہ محرم الحرام ۱۲۷۲ ہجری مقدسہ نقل برداشتہ کتاب ناقص را باتمام رسانید یا مجیب روح مصنف و مولف و کاتب و ناقل مطالعہ کنندہ را بہ بخش و امر زکار خود ساز۔"

۱۸۔ مونس الارواح۔ جہاں آرا کی تصنیف اور خود اس کا ذاتی نسخہ ہے۔ مطلا، حاشیہ اور نستعلیق میں ہے علامہ شبلی نے ۵ جولائی ۱۹۱۰ء کو اس نسخہ کو خریدا تھا۔ اختتامیہ نثر میں ہے:۔

تمت کتاب سطحات مونس الارواح تصنیف نواب قدسی القاب فلک احتجاب ولایت مآب شاہزادہ جہان تیان بادشاہزادہ عالم دعا لمیان مدا اللہ تعالیٰ ظلہا الی یوم المیعا فی سنہ یک ہزار و شصت ہشت ہجری موافق سنہ سی دیک۔ جلوس میمنت مانوس خادم فقرا محمد عاقل حسینی۔

معین الدین با فانیست در حق ازان باقی شدہ در ذات مطلق" (جہان آرا)

۱۹۔ انیس الارواح۔ حسن سجزی دہلوی کی تصنیف ہے۔ غلام محی الدین حسین کاتب نے نستعلیق میں صرف اس پر ختم کیا ہے۔"

کار من نظام شد تمت تمام شد

۲۰۔ وحدۃ الوجود۔ نامعلوم مصنف کا رسالہ ہے۔ مرزا سلطان علی حیدر آبادی نے نستعلیق میں ۱۲۰۹ ہجری میں کتابت کی ہے:۔

الٰہی بیامرز این نامہ را مولف و قاری نویسندہ را

ہر کہ خواند دعا طمع دارم　　زانکہ من بندۂ گنہگارم

ایمان میں گیارھویں ہجری میں مثنوی معنوی کے قلمی نسخہ میں یہ شعر موجود ہے۔

۲۱۔ مفاتیح الحروف۔ محمد حسین بن علوی مصنف، کاتب ضیاء الدین حسین، خط نستعلیق ۱۲۸۲ھ اور خاتمہ اس شعر پر ہے:-

الٰہی بیامرز این ہر سہ را　　مولف وقاری نویسندہ را

۲۲۔ چشمہ فیض۔ بنام تنبیہ لغا فلین ۱۲۸۸ھ کی کتابت محمد علی حنفی قادری کاتب ہیں۔ اختتامیہ عربی کا شعر تھوڑی تبدیلی کے ساتھ

صرفت العمر فی القرطاس دہراً　　وکاتبہ رمیم" فی التراب

۲۳۔ منطق الطیر عطار کی تصنیف ہے قدیم نسخہ نستعلیق میں ہے کاتب نامعلوم ہیں اور خاتمہ یوں ہے:-

خدایا بیامرز این ہر سہ را　　نویسندہ وخوانندہ وگویندہ را

قاریا برمن مکن قہر و عتاب　　گر خطائی رفتہ باشد در کتاب

آن خطائی رفتہ را تصحیح کن　　از کرم واللہ اعلم بالصواب

گفت عطار از ہمہ مردان سخن　　گر نتہ ہم مردی بخیرش یاد کن

۲۴۔ راگ درپن۔ سن کتابت اور کاتب کا نام غایب ہے۔ شیخ فقیر اللہ رقم ہے اور مولانا آزاد نے غبار خاطر میں ذکر کیا ہے۔ پہلے نثر میں اور پھر شعر پر خاتمہ کیا ہے۔

"امید از مطالعہ کنندگان دارم کہ در حیات و ممات بعد از آنکہ محظوظ و مسرور اند مطالعہ این رسالہ شوند"

بفاتحہ یاد آور فرمایند:-

یک سخن نیست کہ خاموشی ازان بہتر نیست　　نیست علمی کہ فراموشی ازان بہتر نیست

۲۵۔ مناظر الانشا۔ محمود گاوان کی تصنیف نواب سعادت علی خاں کا نسخہ ہے۔ کاتب سید

حیدر علی رضوی اور خاتمہ ان اشعار پر ہے :-

ہر کہ خواند دعا طمع دارم   زانکہ من بندۂ گنہگارم

نوشتہ بماند سیہ بر سفید   نویسندہ رانیست فردا امید

یارب لاتخزنی فی یوم الحساب بہ   یا قاری الخط قل باﷲ

ہاتھ سے لکھے جانے کا یہ سلسلہ بیسویں صدی میں بھی رہا ہے کیوں کہ کتابیں سستی ہونے کے باوجود کمیاب ہوتی تھیں۔ نسخے کم ہوتے تھے۔ اور ہر جگہ وہ پہنچ بھی نہیں پاتی تھیں چنانچہ مطبوعہ کتب کی نقل کا ایک نمونہ اور کاتب کا اعتذار بھی قابل معافی اور ستایش ہے۔ ذیل کی تمام کتابیں، کاتب کا نام، مقصد اور دعائیہ اشعار بھی قابل ذکر ہیں :-

سفر نامہ حکیم خسرو، گلستان شیخ سعدی، ناول انشکیاو، ہدیہ ناظر، صبح تجلی محسن کاکوروی

این نامہ کہ یکی از طالب علم کالج علی گڑھ تصنیف فرمودہ نامش خوشی محمد است و این کالج از بزرگترین کالجہائی ہندوستان است نخستی از اشعار این نامہ از پدرم شنیدم ہر نقطہ اش دانہ گردید و ہر فسش دام گردید دلم را صید گردانید ہمیں سبب است کہ بہ غرہ رمضان شد بہ خامہ عنان از دستم ربود و گام بر صفحۂ کاغذ نہاد و بہ دوم رمضان بہ منزل رسید :-

شکر کہ حجازہ بمنزل رسید   زورق مقصود بہ ساحل رسید

التجا دارم کہ اگر جائی سہو از کاتب یابند عفو فرمایند نہ کہ انگشت نما سازند

"کہ ہیچ نفس بشر خالی از خطا نبود

نوٹ :- زیر نظر مضمون کی تیاری میں ذیل کے اداروں کی کتابیں استعمال کی گئیں۔

۱- ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ
۲- شبلی اکاڈمی دار المصنفین اعظم گڈھ۔
۳- کتب خانہ قاضی اطہر مبارکپوری۔ اعظم گڈھ۔
۴- "ہنر و مردم" تہران، شمارہ نمبر ۱۳۹-

ادبیاتِ فارسی میں میر کا درجہ

از: پروفیسر ڈاکٹر نظام الدین ایس گوریکر ایم اے، پی ایچ ڈی، صدر شعبۂ فارسی و اردو سینٹ زیویرس کالج بمبئی۔ اعزازی ڈائرکٹر، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی۔

دنیائے اردو میں میر محمد تقی میر خدائے سخن کا درجہ رکھتے ہیں۔ ایک طرف تذکرہ نویسوں نے میر کی تعریف و توصیف کی ہے تو دوسری جانب ہم عصر شاعروں نے انکے آگے سرِ تسلیم خم کیا ہے۔ قائم چاندپوری اپنی تالیف مخزن الشعرا میں میر کو فروغ محفلِ سخن پرداز ان، اور لچھمی نرائن شفیق اپنی تصنیف چمنستان شعرا میں میر بدان سخنوری، کے نام سے یاد کرتے ہیں تو میر حسن اپنے تذکرۂ شعرائے اردو میں میر کو افصح فصحائے زمان، اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ گلشن بیخار میں اشعر شعرا، کہہ کر پکارتے ہیں۔ شیخ ناسخ کی طرح مرزا غالب بھی اپنی عقیدتمندی کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ ۔۔۔ آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

اور شیخ ابراہیم ذوق اپنی بے بسی کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب ۔۔۔ ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

میر کو بھی اپنے فن کی عظمت کا احساس تھا اور اپنی فوقیت کا اعلان کرنے سے جھجکتے نہیں ؏

معتقد کون نہیں میر کی استادی کا

سلطنت مغلیہ کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ زبان فارسی کا اثر و اقتدار اور اس کی

مقبولیت بھی گھٹتی گئی اور اس کی جگہ مشترکہ عوامی زبان اردو لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ گھر گھر اردو شاعری کا چرچہ ہونے لگا حتیٰ کہ عوام مصرعوں کے توارد اور شعروں کے سقم، شاعروں کی نوک جھونک اور انکے حالات زندگی کے ذکر میں مصروف رہتے۔ جب شعرا کی تعداد بڑھی اور زمانے کے بے رحم ہاتھوں انکے مٹ جانے کا خطرہ محسوس ہوا تو فارسی کی تقلید میں فارسی زبان ہی میں شعرائے اردو کے تذکروں کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔

میر کے زمانہ میں فارسیت کا غلبہ تھا اور شعرالہند کے مصنف مولوی عبد السلام ندوی کے الفاظ میں: "اردو شاعری بالکل فارسی کے قالب پر ڈھل گئی اور ہمارے شعرانے بالکل ایرانی شعرا کے طرز میں کہنا شروع کیا۔" بقول میر ؎

تبعت سے جو فارسی کے میں نے ہندی شعر کہے سارے ترک بچے ظالم اب پڑھتے ہیں ایران کے بیچ

میر نے شیخ سعدی اور حافظ شیرازی سے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ ان کے اشعار کا ترجمہ بھی اپنے اردو شعروں میں پیش کیا۔ بعض اردو کے شاعروں نے اس زمانے میں متاخرین شعرائے فارسی میں بالخصوص ناصر علی، جلال اسیر، ابو طالب کلیم اور مرزا بیدل کے رنگ میں کہنا شروع کیا لیکن خوش مذاق شعرائے اردو نے طالب آملی اور حکیم شفائی جیسے مشاہیر فارسی شعرا کی روش اختیار کی۔ علاوہ ازیں شعرائے اردو کے کلام کی اندرونی شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے متاخرین شعرا کے کلام سے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ ان کے کلام کو سامنے رکھ کر شاعری شروع کی۔

میر نے بھی زمانے کے رجحان کے مطابق اس دور کے متعدد شعرائے فارسی میں صائب تبریزی، عرفی شیرازی، نظیری نیشاپوری اور مرزا بیدل کی غزلوں پر غزلیں لکھیں اور ان کے اشعار کا ترجمہ بھی اردو شعروں میں پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی محاورات اور فارسی تراکیب کے ترجمے جو کثرت سے اس دور کے اردو شعرا کے کلام میں نظر آتے ہیں

ہیں وہ اسی تقلید و تتبع کا نتیجہ ہے۔ میر نے بھی خزانۂ فارسی سے زبان اردو کو مالامال کیا۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ میر کی فارسی شاعری میں ایرانی لب لہجہ قریب قریب مفقود ہے تاہم انکی فارسی نثر میں پختگی پائی جاتی ہے۔

میر محمد تقی میر آگرہ (اکبر آباد) میں ۱۷۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ تقریباً نو برس کی عمر پائی اور ۱۸۱۰ء میں انتقال ہوا۔ سات سال کی عمر سے میر نے سید امان اللہ کی صحبت سے فیض اٹھایا۔ بقول خود " روز شب ان کے ساتھ رہتا اور قرآن شریف پڑھتا تھا" سید امان اللہ میر کے والد ماجد کے خاص مریدوں میں سے تھے۔ اور میر کو بھی ان سے بے حد انس تھا۔ سید امان اللہ کے علاوہ احسان اللہ بایزید اور اسد اللہ جیسے بزرگ صوفیوں کی صحبتوں سے فیضیاب ہوتے رہے اور یہ ان ہی صوفی منش بزرگوں کی صحبتوں کا اثر ہے کہ میر وسیع المشرب، مرنجان مرنج، صلح کل، یار باش اور دوست نواز ہو گئے۔

رسمی درسیات کی تکمیل کے پہلے ہی میر کے والد ماجد اور عم بزرگوار دونوں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر بمشکل دس سال کی تھی۔ کم عمری کے باوجود میر کو درست اور نادرست محاورہ کا احساس تھا۔ در اصل میر نے اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین خاں آرزو سے جو علم و فضل میں یگانۂ روزگار اور امام المتاخرین کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں، کافی فائدہ اٹھایا ہے۔ دوسرے لفظوں میں میر کے غنچۂ استعداد کی شگفتگی خانِ آرزو کی رہین منت ہے محض استاد کی حیثیت سے ہی ان کے تراکیب والفاظ کی میر نے خوشہ چینی نہیں کی۔ بلکہ زبان کے فوا عد و اصول بھی ان سے سیکھے اس سے انکار نہیں کہ اپنے تذکرہ نکات الشعرا میں میر نے خانِ آرزو کو اپنا استاد، پیر و مرشد بندہ لکھا ہے لیکن اپنی تالیف ذکر میر میں خانِ آرزو کی سلاخی و حلاجی کی شکایت کی ہے۔ اس میں جہاں اور بالتوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہاں میر نے

میر جعفر عظیم آبادی، سعادت علی امروہوی، اور یارانِ شہر سے فیضیاب ہونے کا ذکر بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک روز میر بازار میں انشار اور مکتوبات کی کتب میں سے ایک کتاب کا جزو لے کر پڑھ رہے تھے کہ میر جعفر وہاں سے گذرے۔ میر کے ہاتھ میں کتاب کا جزو دیکھ کر انہوں نے فرمایا: غالباً تمہیں پڑھنے کا شوق ہے! اگر واقعی ایسا ہے تو میں تمہیں پڑھانے کے لئے آجایا کروں گا۔ میر نے جواب میں کہا: میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔ اگر آپ یوں ہی زحمت فرمائیں گے تو بڑی نوازش ہوگی۔ میر جعفر نے فرمایا: مگر بغیر ناشتہ کے میرے لئے کہیں آنا جانا ممکن نہیں۔ میر نے کہا میں خود تنگ دست ہوں مگر خدا رزاق اور مسبب الاسباب ہے یہ مشکل بھی آسان کر دے گا۔ ناگاہ ایک خط ان کے وطن سے آیا اور وہ فوراً چل کھڑے ہوئے۔ تھوڑے دنوں کے بعد میر کی ملاقات سعادت علی امروہوی سے ہوئی۔ انھوں نے ریختہ میں شعر کہنے کی ترغیب دلائی اور میر نے اسقدر مشق کی کہ شہر کے مستند اردو شاعروں میں شمار ہونے لگے۔ اس سلسلہ میں میر خود فرماتے ہیں کہ "سعادت علی امروہوی میری شعر گوئی کے محرک ہوئے"۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سنگریزہ ان ہی کی کوشش سے دُرِّ عدن بن گیا ورنہ اس زبان کی طرف کون متوجہ ہوتا۔

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختہ کے   بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

اردو زبان پر انہیں ناز ہے اور وہ ببانگ دہل فرماتے ہیں ؏

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

میر کی تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فارسی اور عربی میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ اگر فارسی میں ادیب کامل کا درجہ رکھتے تھے تو عربی میں مطول تک استعداد حاصل کی تھی۔ ذکر میر اور فیض میر سے انکی جوہر بلیغ کا اظہار ہوتا ہے۔ بزم سخن اردو میں میر کی میر مجلسی مسلم ہے۔

جس زمانے میں میرؔ نے فارسی میں طبع آزمائی شروع کی اس وقت اردو زبان فارسی کے زیر اثر تھی۔ اور ریختہ کے مسلم الثبوت اساتذہ فارسی میں بھی شعر موزوں کر لیتے تھے۔ اس ضمن میں یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا۔ کہ میرؔ اور سوداؔ دونوں فارسی میں بھی لکھا کرتے تھے اور غالبؔ اور مومنؔ بھی فارسی میں اچھی استعداد رکھتے تھے۔ غالبؔ اردو کو مجموعۂ بے رنگ کہا کرتے تھے۔ لیکن فارسی کے نقش ہلئے رنگ رنگ پر انہیں ناز تھا۔ اس زمانے میں ملا ظہوری، نظیری نیشاپوری، طالب آملی، ابو طالب کلیم اور مرزا بیدل کے طرز کو پسند کیا جاتا تھا اور شعر کی خوبی کا انحصار نکتہ یابی اور معنی آفرینی پر تھا میرؔ نے زمانے کی روش کو اختیار نہیں کیا بلکہ اپنی فطری اقتضا اور جبلی فطرت کو رہنما بنایا۔ سادگی اور بے ریائی جو ان کی طبیعت میں تھی۔ وہی ان کے کلام سے ظاہر ہوتی ہے۔ انداز اور اسلوب جو اردو کا ہے وہی فارسی کے لبادہ میں بھی جلوہ گر ہے اور دل برشتگی اور لب تشنگی جو میرؔ کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ہے فارسی میں بھی نظر آتی ہے۔

بہ جمع ما نمیان حرف من اثر دارد به بزم عیش نفهمد کسی زبان مرا

میرؔ اس عہد کی پیداوار ہیں جب ہندوستان میں فارسی زبان کے اثرات کم سے کم ہو رہے تھے اور جب اہل علم انشاپردازی میں مبالغے سے کام لے کر اس کو دراز فہم اور معمہ بنا رہے تھے۔ لیکن ہر دور کی طرح اس عہد کی مناسبت سے اچھے نثر نگار بھی منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے اور زمانے کی بگڑی ہوئی روش کے باوجود بڑی حد تک اچھے افکار اور صحیح تناسب و توازن کو حتی الامکان باقی رکھنے کی کوشش کی گئی اور اسی لیے ان کے نثری کارنامے اس کا بڑا ثبوت ہیں۔ اس وقت ایک رجحان یہ بھی تھا کہ ارباب علم و فضل چھوٹے چھوٹے جملوں اور فقروں میں اپنے مطلب کو بیان کرتے اور طویل اور الجھی ہوئی عبارتوں سے اجتناب کرتے۔ فیض میر کے مقدمہ میں میرؔ کی فارسی دانی کے

بارے میں مسعود حسین رضوی لکھتے ہیں کہ "میر کو فارسی زبان پر عبور تھا اور فارسی نثر لکھنے کی جو قدرت انہیں تھی۔ وہ ان لوگوں سے پوشیدہ نہیں ہے جنھوں نے ذکر میر اور ان کا تذکرہ نکات الشعرا دیکھا ہے۔ میر کے ہم عصر بھی ان کی نثر کی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ میر حسن نے ان کی نظم کے ساتھ ان کی نثر کی بھی تعریف کی ہے۔ میر بالعموم مقفیٰ عبارت لکھتے ہیں۔ لیکن قافیہ کے التزام سے عبارت کی شگفتگی، بے ساختگی اور روانی میں فرق نہیں آتا۔ شاید کہیں کہیں تصنع آگیا ہو لیکن زیادہ تر عبارت کا حسن بڑھ جاتا ہے۔"

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ میر کو الفاظ، محاورات اور تراکیب پر حتمی قدرت حاصل تھی تاہم انکا بکثرت استعمال عبارت کو بغیر ضرورت کے مشکل بنا دیتا ہے۔ جس سے تحریر کی روانی اور سلاست میں قدرے فرق آجاتا ہے۔ نیز اس قسم کے تصرفات کو آورد سے پاک نہیں کیا جاسکتا۔ بہت سے ایسے محاورات یا تراکیب جو ہندی اصول پر وضع کئے گئے ہیں ان کے سمجھنے میں فارسی دانوں کو دشواری پیدا ہوتی ہے۔ بقول نثار احمد فاروقی: "مولوی عبدالحق نے میر کی فارسی کی تعریف کی ہے اور ان کی نثر کو سادہ اور شیریں بتایا ہے یہ ایک حد تک صحیح ہے لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ اس کا ابتدائی حصہ میر نے خاصی محنت سے لکھا ہے اور اس دور کے مرزایان ایران کی نقل کے شوق میں عبارت کو اسقدر ادق بنا دیا ہے کہ بعض الفاظ کی تشریح خود انہیں حاشیے پر لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ذکر میر کے الفاظ و محاورات سوائے چراغ ھدایت کے کسی اور لغت میں مشکل ہی سے ملتے ہیں۔"

میر اصلاً شاعر ہیں لیکن ان کی نثر میں بھی شعر کا لطف آتا ہے۔ فارسی شعرا کا کلام ان کے دل و دماغ پر اسقدر گھر کر گیا تھا کہ موقع بہ موقع اسے صرف کرتے رہے بقول کسی ؎

بہر رنگی کہ خواہی جامہ می پوش من اندازِ قدرت را می شناسم

نکات الشعرا یہ اردو کے تقریباً سو شاعروں کا تذکرہ ہے جو فارسی زبان میں میر نے لکھا ہے۔ یہ ریختہ گویوں کا دراصل سب سے پہلا تذکرہ ہے اگرچہ اس میں شعرا کے حالات مختصراً تحریر کئے گئے ہیں۔ تاہم جو کچھ ہیں وہ بہت غنیمت ہیں۔ میر نے اس میں کہیں کہیں کسی شاعر پر اعتراض بھی کیے ہیں اور بہت سی جگہ دل کھول کر داد بھی دی ہے۔ جس سے ہلکی سی تنقید کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ تنقید اگرچہ مختصر ہے لیکن منصفانہ ہے۔ جہاں کہیں کسی شاعر کا حال زیادہ معلوم نہیں ہے تو صاف لکھ دیا ہے کہ اس کے حال سے آگاہی نہیں یا اس قسم کا کوئی اور جملہ اپنے بارے میں میر نے صرف اسقدر لکھا ہے کہ "مولف این نسخہ متوطن اکبر آباد است۔ بسبب گردش لیل و نہار از چندی در شاہجہان آباد است" اس تذکرہ میں جو معلومات معاصر شعرا کے متعلق ہے وہ قابل ذکر ہے۔ اس کی عبارت سلیس اور بامحاورہ ہے مگر تصنع اور مبالغے سے پاک ہے۔ میر نے اس تذکرہ میں بلاشبہ فارسی تذکروں کی تقلید کی ہے۔ شعرا کے کلام اور ان کی سیرت سے متعلق بیانات اسقدر جامع اور آرا اسقدر مقتدر ہیں کہ میر کے ذوق ادب اور سخن شناسی کے ساتھ ان کے استادانہ کمال کا بھی قائل ہونا پڑتا ہے۔ نکات الشعرا کی انہیں خصوصیات کی وجہ سے اس عہد کے تنقیدی ذوق کی تربیت میں بڑی مدد دی ہے اور آئندہ کے تذکروں پر ایک گہرا نقش چھوڑا ہے۔

ذکر میر یہ میر کے واقعات زندگی اور سوانح حیات کا فارسی میں مجموعہ ہے۔ اس میں ان کے شاعرانہ کمالات کا ذکر نہیں ہے تاہم اس کی تاریخی حیثیت مسلم ہے سلطنت مغلیہ کے آخری دور کی کمزوریوں اور شریف گردیوں کا عبرتناک مرقع ہے۔ اس کا اسلوب بیاں از حد چست ہے مگر کہیں کہیں مقفی بھی ہے۔ لیکن عام روش کے مطابق مطلب و مقصد کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ ذکر میر اگرچہ میر کی ادبی زندگی کی آئینہ دار نہیں ہے

تاہم اپنے عہد کے کوائف و حالات کی عکاس ہے۔ اس میں نادر شاہ کی جنگ سے لے کر ضابطہ خاں کے قتل تک کے واقعات موجود ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ ۱۱۵۱ھ سے ۱۱۹۷ھ تک کی تاریخ ہے۔ دہلی کی خانہ جنگیاں، مرہٹوں، جاٹوں، روہیلوں اور افغانوں کی لڑائیاں، نوابانِ اودھ کے معرکے، انگریزوں کے مورچے، عمائدین شہر کی شازشیں اور ہندو وسلمانوں کے خوشگوار تعلقات سب کا ذکر اس کتاب میں موجود ہے۔

فیض میر یہ فارسی زبان میں ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جسے میرؔ نے اپنے صاحبزادے فیض علی کے لئے مرتب کیا۔ اس میں درویشوں کے پانچ قصے اور میر کی عقیدتمندی کا بیان ہے۔ آخیر میں کچھ ہلکے پھلکے لطیفے اور حکایتیں بھی ہیں۔ ان میں چند فحش بھی ہیں جن سے اس زمانے کا مذاق معلوم ہوتا ہے۔

دریای عشق اپنی مثنوی دریائے عشق کو میرؔ نے فارسی نثر میں بھی لکھا ہے۔ یہ رسالہ ایک قلمی بیاض کی صورت میں ملتا ہے۔

نثری کارناموں کے دیکھنے کے بعد اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی نثر ہر اعتبار سے بہتر ہے۔ مادری زبان نہ ہونے کی وجہ سے میرؔ سے فارسی کے بعض محاورات کے استعمال میں لغزشیں سرزد ہوئی ہیں تاہم ان کا اسلوبِ بیان طرزِ نگارش قابلِ داد ہے۔

میرؔ جس طرح اردو زبان کے ایک بلند پایہ شاعر ہیں اسی طرح فارسی میں بھی وہ بجا طور پر استاد کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ عرفی شیرازی، نظیری نیشاپوری اور صائب تبریزی جیسے مشاہیر اساتذۂ فارسی کے پہلو میں میر کو جگہ نہیں دی جا سکتی لیکن ریختہ گو شعرا میں فارسی شاعری کی حیثیت سے بھی میرؔ نظر آتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ میرؔ اصلاً اردو کے شاعر ہیں۔ بایں ہمہ فارسی میں بھی

جو کچھ انھوں نے کہا ہے اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شیخ مصحفی اپنے تذکرۂ "عقدِ ثریا" میں میر کے متعلق رقم طراز ہیں کہ" دعویٰ شعر فارسی ندارد مگر فارسیش ہم کم از ریختہ نیست" اور سراج الدین خاں آرزو اپنی تصنیف مجمع النفائس میں میر کی فارسی شاعری کے بارے میں بھی لکھتے ہیں کہ" ورا ول مشق اشعارِ ریختہ کہ بزبان اردو شعر نیست بطرز شعر فارسی توغل بسیار نمودہ چنانچہ شہرۂ آفاق است و بعد آن بگفتن اشعار فارسی بطرزِ خاص گرد ید قبول خاطر ارباب سخن و دانایان این فن گشتن" میر کا فارسی کلام ان کی فارسی نثر کے مقابلے میں اگرچہ قابل اعتنا نہیں ہے لیکن قابل ذکر ضرور ہے۔ اس امر سے بھی انکار نہیں کہ میر کو ہندوستان کے کہنہ مشق فارسی گویوں کے صف اول میں جگہ نہیں دی جا سکتی لیکن بقول مصحفی میر نے اپنے فارسی شعر کا دعویٰ نہیں کیا۔ اور غالب کے برعکس وہ اس کو قابل اعتنا تصور نہیں کرتے تھے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک شاعری جذبات قلبیہ کے ہیجان کا نتیجہ ہے۔ جب شعر تفنن طبع کی نیت سے کہا جائے تو اس کا کوئی خاص درجہ نہیں رہتا بلکہ وہ ایک ہنگامی اور وقتی چیز بن جاتی ہے۔ میر نے اپنا فارسی دیوان خانہ پری کے لئے لکھا تھا۔ بقول خود" سالے ریختہ موقوف کردہ بودم در آن حال دو ہزار شعر گفتہ تدوین کردم" یہ کلام کمیاب ہے۔ مولانا عبد الباری آسی نے ایک مکمل دیوان قلمی کا ذکر کیا ہے۔ مسعود حسن رضوی کے کتبخانہ میں ایک فارسی دیوان کا نسخہ موجود ہے۔ جو دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اسی طرح ایک قلمی بیاض علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری میں بھی ہے۔ جس میں تقریباً تین ہزار اشعار ہیں اور آخر میں یہ عبارت درج ہے۔" دیوان نظم فارسی کہ میر تقی میر گفتہ اند نوشتہ شد" ایک اور قلمی نسخہ مکتوب ۱۲۰۶ھ ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد میں موجود ہے اور جس کے آخر میں یہ الفاظ ہیں۔" تمام شد دیوان فارسی از میر تقی میر اس دیوان میں

ایک مثنوی ہے جس کا عنوان ہے "در فراق شہر ہند"۔ یہ مثنوی پچاس ورقوں پر مشتمل ہے۔ اور ان کے زورِ تخیل ہی نہیں بلکہ ان کے خون جگر کا نتیجہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ میر کی شاعری کی ابتدا اردو سے ہوئی اور چونکہ ان کے عہد تک فارسی برسر اقتدار تھی۔ اور ہر ایک سخن گو شاعر زمانے کے میلان و رواج کے مطابق فارسی میں بھی کچھ نہ کچھ طبع آزمائی کرتا تھا۔ لہذا میر کے لیے بھی یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اس میدان میں کسی سے پیچھے رہتے۔ یہی جذبہ انکی فارسی شاعری کا محرک رہا۔

اس ضمن میں یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میر کا بچپن آفات و مشکلات کی گود میں کٹا، جوانی پریشانی و تنگ دستی کے سایہ میں بسر ہوئی اور بڑھاپا فقر و فاقہ کی چھاؤں میں کٹا یا یوں کہئے کہ میر کی ساری زندگی مصائب و آلام اور نومیدی و مایوسی کی مستقل کتاب ہے۔ جو ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے ترک دنیا، بے ثباتیٔ عالم، اور ہمہ گیریٔ عشق سے متعلق حاصل کی تھی روز بروز زیادہ پائدار ہوتی گئی۔ اور ان کی یاس انگیز فطرت کو مضبوط تر کر دیا۔ ان کا مخصوص قنوطی رنگ، دنیا کی ناپائداری و بے ثباتی کا ذکر، عشق اور اس کے مختلف مدارج و منازل کا بیان، تصوف کے مسائل اور ریاکاری و سادوسی کی مذمت جس طرح ان کے اردو کلام میں ہے اسی طرح فارسی میں بھی موجود ہے اپنی برتری کا احساس، اپنی استادی کا یقین، اپنے کلام پر اعتماد جس طرح ان کے اردو اشعار سے ظاہر ہوتا ہے فارسی کلام سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اردو اور فارسی کے ہم مضمون شعروں سے ایک بات عیاں ہوتی ہے کہ میر کی طبیعت فارسی کے مقابلے میں اردو میں زیادہ رواں ہے اور اس میں غم انگیز وجدان میں تنوع کے امکانات زیادہ نہیں ہوتے اس لیے جو داستان غم اردو میں بیان کی گئی ہے۔ فارسی میں بھی کم و بیش منتقل کر دی ہے۔ ملاحظہ ہوں میر کے چند اردو و فارسی کے ہم مضمون و ہم معنی اشعار :-

اردو	فارسی
نہ دیکھا میرؔ آوارہ کو لیکن	ندیدم میرؔ را در کوی او لیک
غبار اک ناتواں سا کو بکو تھا	غبارِ ناتوانی با صبا بود
گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا	گل و آئینہ و مہ و خورشید
جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا	ہر کسے رو بسوی تو دارد
موقوف حشر پر ہے سو آتے بھی وے نہیں	ہر چند گفتہ اند کہ ای میرؔ روزِ حشر
کب درمیاں سے وعدۂ دیدار جائیگا	دیدارِ عام می شود اما نمی شود
غلط تھا آپ سے غافل گزرنا	غلط کردم کہ رفتم من از خود
نہ سمجھا نیں کہ اس قالب میں تو تھا	ندانستم درین قالب خدا بود
منعم نے بنا ظلم کی رکھ گھر تو بنایا	منعم ای خانہ خراب این ہمہ شوقِ تعمیر
پر آپ کوئی رات ہی مہمان رہیگا	سالہا ساختہ، جاہ و مکان آخر ہیچ
آہوں کے شعلے جس جا اٹھتے تھے میرؔ سے شب	در آن جائی کہ سر می زد شب از شعلہ من آہے
واں صبح جا کے دیکھا مشتِ غبار پایا	نشد معلوم آن جا صبح دم غیر از کفِ خاکے
سرنشین رہِ میخانہ ہوں میں کیا جانوں	من چہ دانم راہ و رسم خانقاہ
رسم مسجد کے تئیں شیخ کہ آیا نہ گیا	عمرِ من در خدمتِ میخانہ رفت

رہ طلب میں گرے ہوتے سر کے بل ہم بھی
شکستہ پائی نے اپنی ہمیں سنبھال لیا

از راہِ طلب خبر نہ داریم
مائیم و ہمین شکستہ پائیم

جگر ہی میں یک قطرہ خوں ہے سرشک
پلک تک گیا تو تلاطم کیا

دلی در سینۂ من قطرۂ خون بود ست
چون بچشم آمد از شیوۂ طوفان دیدم

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لیکر

این نہ پنداری کہ مردن موجب آسودن است
مرگ ہم یک منزل ست از راہِ بی پایانِ ما

دیر و حرم سے گذرے اب دل ہے گھر ہمارا
ہے ختم اس آبلہ پر سیر و سفر ہمارا

رفتہ شوق شود دیر و حرم را گذار
طوف کن میر بہر در بہ سجود آمدہ را

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

وقت آن کس خوش کہ گلزار جہان را دید و رفت
ہم چو گل بر بی ثباتیہای خود خندید و رفت

پھر نوحہ گری کہاں جہاں میں
ماتم زدۂ میر اگر نہ ہو گا

من ای ہمدم مصیبت دیدۂ چون میر کم دیدم
سخن از محنت خود تا بگوید چشم تر دارد

جلوہ اسی کا سب ہے گلشن میں زمانے کے
گل پھول کو ہے ان نے پروانہ بنا رکھا

جلوہ ها داریم و از هر جلوہ بی خود گشتہ ایم
خود تماشائیم و خود محو تماشا گشتہ ایم

اردو کی طرح فارسی میں بھی میرؔ نے قریب قریب ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ اور ہر قسم کے مضامین کو نظم کیا ہے بلکہ اکثر مقامات پر فارسی میں جو مضامین انھوں نے نظم کئے ہیں ان کی مثال اردو میں مشکل ملتی ہے۔ بالفاظ دیگر میرؔ کی فارسی شاعری میں بہت سے ایسے موتی ملیں گے جن سے اردو شاعری کا دامن خالی ہے۔

عشق وہ ایک موضوع ہے جس کے تمام حزنیہ پہلوؤں پر میرؔ کی نظر گئی ہے اور بڑی دل سوزی اور آب و رنگ کے ساتھ انھوں نے اپنی شاعری میں سمو کر پیش کیا ہے۔ اگرچہ اردو میں انکے جوہر کھلتے ہیں۔ لیکن فارسی میں بھی کہیں وہی سوز وگداز پیدا ہوجاتا ہے ؎

عشق یا رب چہ بلا است کہ ہیچش نے جرم
می رود میرؔ بیاے کہ گنہگار رود

از دل چہ حکایت کنم اکنون کہ بجا نیست زین بیشتر این قطرۂ ہم جگری داشت

دل می کشد بہ صحرا ہنگام کار آمد
شوری ست در سر من شاید بہار آمد

مہر شد مفقود یا این جا محبت رسم نیست یا مزاج ما دگر شد یا جہان دیگر است

عشق تا بکجا نہ درد مژگان ترکن
برخیز و فسانۂ محبت سر کن

اہل تصوف کی طرح میرؔ نے بھی ناپائیداری دنیا پر قلم اٹھایا ہے ؎

وقت رحیل آہ بخواب گران گذشت
تا چشم وا کنم ز نظر کاروان گذشت

طور و طرز رفتن اہل جہانم داغ کرد — عالمی بگذشت از این راہ و نشان معلوم نیست

میر دنیا رہگذاری بیش نیست — آسمان گرد و غباری بیش نیست
بستۂ وہم است نقش زندگی — ورنہ ہستی اعتباری بیش نیست

نوحہ گری و درد سرائی میر کی زندگی کا مسلک رہا ہے ؎

از غریق چو من چہ آگاہی
خاک افتادگانِ ساحل را

بہ مردن تسلی شد ورنہ میر — نہایت نبود آرزوی مرا

ز ضعف ہر نفسم چشم بستہ می گردد
ترا جہاں کہ مایل بخواب می گردم

میر کی رباعیوں میں بھی حسرت و یاس، مایوسی، و نومیدی کی جھلک دکھائی دیتی ہے ؎

دل کہ در سینۂ من تپید مرا — این زبان از مژہ چکید مرا
دست ہر دم بہ تیغ بردن او — میر در خاک و خون کشید مرا

عمرِ من بر درِ کسی بگذشت — کہ نیامد یکی بخانۂ ما
حیف در شورزار عالم میر — سبز ناگشتہ سوخت دانۂ ما

میر کے کلام ان کا شاعرانہ آرٹ صورت پذیر ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں میر نے شعر نہیں کہے ہیں بلکہ "دل" اور "دلی" کے مرثیے لکھے ہیں۔ اور اس طرح محبت اور انسانیت کو جلا بخشی ہے۔

تبصرے

نمازِ جنازہ خارجِ مسجد عہدِ رسالت میں از جناب مولانا عبداللہ خاں کرتپوری، محلہ کوٹلہ، کرتپور ضلع بجنور یوپی۔
صفحات ۹۶ سائز ۲۰ × ۳۰ کتابت و طباعت اوسط قیمت دو روپیہ، خود مصنف کے پتے سے اور مکتبہ دینیہ دیوبند سے مل سکتی ہے۔

مولانا عبداللہ خاں صاحب بڑے محقق عالم اور علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ذی علم تلامذہ میں ہیں، موصوف نے بہت کم لکھا ہے مگر جب لکھا ہے بہت تحقیق کے ساتھ بہت مبسوط و مفصل لکھا ہے، علل حدیث و اسماء الرجال کی دقیق بحثوں اور اُلجھے ہوئے اختلافی مسائل پر اُن کی بڑی گہری نظر ہے چنانچہ اب تک ہماری نظر میں ان کے تین مقالے آئے ہیں اور تینوں ہی اختلافی موضوعات میں ہیں جن کو موصوف نے بڑی دقّتِ نظر اور نہایت تحقیق و تدقیق سے لکھا ہے

(۱) الاقوال الصحیحۃ فی تابعیۃ الامام ابی حنیفہ۔ شائع شدہ ۱۳۲۵ھ

(۲) نماز بوقتِ خطبہ پر محققانہ بحث۔ یہ ۱۹۶۱ء میں قسط وار اسی برہان میں شائع ہوا تھا صفحات ۸۸۔

اور تیسرا مقالہ یہی زیرِ تبصرہ ہے جو کتابی شکل میں شائع ہوا ہے، نمازِ جنازہ

مسجد کے اندر پڑھی جائے یا باہر یہ اختلافی مسئلہ ہے حنفی مسلک کی رو سے نماز جنازہ مسجد سے باہر ہونی چاہیئے، اس مقالے میں حنفی مسلک کی تائید کی گئی ہے اور اس کے لئے بہت سارے دلائل فراہم کئے گئے ہیں اور دوسرے مسالک کے حامیوں نے جو جوابات اور حنفی مسلک پر اعتراضات کئے ہیں ان کے جوابات دیئے گئے ہیں اور حدیث و اسماء الرجال کی کتابوں سے ایسی ایسی نادر بحثیں پیش کی ہیں کہ اہل علم اور اربابِ درس ان سے بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں مصنف علام نے بڑے بڑے محدثین اور علماء اسماء الرجال پر ایرادات و تعقبات کئے ہیں اور بڑی دور رس گرفتیں کی ہیں، بحث چونکہ تمام تر فقہی ہے اس لئے عام لوگ اس میں دلچسپی کم لیں گے مگر علماء محققین اور اہل درس اساتذہ و طلباء کو ضرور اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

اس میں چوں کہ ایک خاص مسلک کی نمائندگی کی گئی ہے اس لئے قدرتی بات ہے اس میں کہیں کہیں مناظرانہ رنگ جھلکتا ہے مگر کوئی بات بے تحقیق نہیں لکھی گئی ہے ہماری رائے میں مولانا موصوف اگر اس رسالہ کو کسی علمی مجلّہ میں قسط وار شائع کرتے جیسا کہ اس سے قبل اپنا ایک مقالہ وہ شائع کر چکے ہیں تو زیادہ اچھا ہوتا اور اس رسالے کی اشاعت کا جو بار مصنف پر پڑا وہ نہ پڑتا اور مضمون اہل علم کے سامنے آجاتا، بعد کو جب مناسب ہوتا کتابی شکل میں شائع کر دیتے بہرحال ہم اہل علم و اربابِ درس اور خاص طور پر حدیث سے تعلق رکھنے والے فضلاء سے اس کے مطالعہ کی پُرزور سفارش کرتے ہیں۔ طلبۂ حدیث کے سامنے اس کے مطالعہ سے تحقیق کا بلند معیار سامنے آئے گا۔

کنز الآخرہ معروف بہ شریعت نامہ: از مولانا چودھری عبداللطیف خاں صاحب۔ صفحات ۴۰۰ سائز کلاں، کتابت و طباعت بہتر

پتہ: ممتاز علی خاں ایم اے پی ایچ ڈی، قصبہ سہاور ضلع ایٹہ

یہ کتاب شرح وقایہ کا منظوم اردو ترجمہ ہے جس میں جا بجا کنز الدقائق اور در مختار وغیرہ سے بھی مسائل اخذ کئے ہیں، اس کتاب میں تمام مسائل طہارت نماز، روزہ، زکوٰۃ حج مسائل میراث وغیرہ کا بیان ہے، نظم کے ساتھ اس سے بھی زیادہ شرح وبسط سے حاشیہ میں مسائل کی وضاحت کی گئی ہے، کتاب کے شروع میں مصنف کے حالات تفصیل سے دئے گئے ہیں۔

کتاب کی ترتیب کی صورت یہ رہی ہے کہ مؤلف موصوف مسائل کو نظم کرتے اور اپنے استاذ مولانا حافظ امیر حسن سہسوانی انصاری کو دکھا دیتے وہ اس میں اصلاح وترمیم کر دیتے تھے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ نظم کا دامن نثر کے مقابلہ میں تنگ ہوتا ہے، نثر میں کسی بات کو جس عمدگی سے کہا جا سکتا ہے۔ خصوصاً مسائل فقہ کو اتنا نظم میں نہیں کہا جا سکتا خصوصاً جب کہ نظم کرنے والا کوئی بہت قادر الکلام شاعر بھی نہ ہو، چنانچہ گزشتہ دور کی اکثر اردو کتابوں کی طرح اس میں بھی مسائل پوری طرح واضح نہیں ہو سکے اور جو اصل مقصد ہے یعنی مبتدی طلبہ اور طالبات اس سے مسائل ضروریہ کو جان سکیں وہ مقصد اس سے بخوبی حاصل نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ اس کی شرح کی ضرورت پڑی، تاہم منظوم متن اور اس کی نثر میں شرح دونوں سے مل کر یہ مسائل ضروریہ کا بہت اچھا مجموعہ تیار ہو گیا ہے، مسائل کو سمجھانے کی امکانی کوشش کی گئی ہے، البتہ کتاب کی زبان عام فہم نہیں ہے۔

کتاب پر قیمت درج نہیں ہے، کتاب کے ساتھ ایک دستی سلیپ (پرچی) بھیجی گئی ہے جس میں پبلشر جناب ممتاز علی صاحب نے لکھا ہے کہ کتاب مفت تقسیم ہوتی ہے، باہر سے منگوانے والے حضرات دو روپیہ ڈاک خرچ بھیج کر ممتاز علی خاں شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ جذبہ قابل قدر ہے کہ بڑے سائز کی چار سو صفحات کی ضخیم کتاب مفت تقسیم کی جا رہی ہے خدا تعالیٰ منتظم حضرات اور مؤلف مرحوم کو جزائے خیر عطا فرمائے اور مطالعہ کرنے والوں کو نفع بخشے۔ (عبداللہ طارق)

بقیہ صفحہ ۲۵۴

اجمالاً امیر کے کلام میں ادب و سماج اور جذبہ و فکر کا وہ گہرا رشتہ ہے جو ان کی حقایق میں حسن اور زندگی پیدا کر دیتا ہے اور اس طرح ان کی شاعری سے سالہا سال کی تہذیبی روایات، تمدنی وراثت اور تاریخی عوامل کی جلوہ گری ہوتی ہے۔

جلد ۸۲ | جمادی الاخری ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۷۹ء | شمارہ ۵

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

نظرات

گذشتہ ماہ اپریل میں پاکستان میں مسٹر بھٹو کو پھانسی کی سزا جو اسلام کے قانون عقوبات وحدود کے خلاف ہے۔ ایران میں فوج اور انتظامیہ کے بڑے بڑے لوگوں کا بتعدادِ کثیر مسلسل قتل، اور اس طرح فتح مکہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ کو نظر انداز کر کے کمیونسٹ گورنمنٹوں کے طریق کار کی پیروی کرنا اور پھر ہندوستان کے مختلف شہروں میں عموماً اور کشمیر میں خصوصاً جماعت اسلامی کے دفتروں اور مرکزوں پر بے پناہ حملے اور عظیم جانی اور مالی نقصانات پہونچانا، وہ واقعات ہیں جن پر جتنا بھی افسوس اور ماتم کیا جائے کم ہے، یہ واقعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہم زبان سے اسلام کا نام ضرور لیتے اور بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں۔ لیکن ان کا مقصد اپنے سیاسی اغراض کی میل ہے نہ کہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی بے لوث اطاعت اور ان کی تعمیل، اس سے انکار ممکن نہیں ہے کہ ان واقعات نے دنیا کی نظروں میں اسلام کے وقار و اعتبار کو شدید نقصان پہونچایا ہے۔

گذشتہ ماہ اپریل میں دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ میں طلبا کی انجمن جمعیۃ الاصلاح کی طرف سے چند توسیعی خطبات کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں ۲۴ تاریخ کو ایک خطبہ خاکسار راقم الحروف کا بھی ہوا، جس کا موضوع تھا: سیرتِ شیخین اور حضرتِ عثمان" جلسہ کی صدارت مولانا سید ابوالحسن علی نے کی، اساتذہ و طلبا کے علاوہ شہر کے ارباب

علم وفضل کی ایک خاصی تعداد بھی جلسہ میں موجود تھی۔ مقالہ جو ایک گھنٹہ کا تھا ختم ہوگیا تو فاضل صدر نے اپنی تقریر میں فرمایا: مقالہ بڑا تحقیقی اور بڑا زمعلومات ہے۔ میں نے خود اس سے استفادہ کیا ہے، مولانا محمد منظور نعمانی جو نقل وحرکت میں سخت دشواری کے باوجود جلسہ میں تشریف فرما تھے، بڑے اچھے نقاد ہیں۔ اور کسی کی مدح وذم میں لب ولہجہ ہمیشہ محتاط رکھتے ہیں، انہوں نے جلسہ کے فوراً بعد گلوگیر آواز میں یہ فرمایا: یہ مقالہ سُن کر واقعہ یہ ہے کہ آپ کی کتاب کو دیکھنے کا اشتیاق بہت بڑھ گیا؛ پھر دوسرے دن میں مولانا کے مکان پر حاضر ہوا تو فرمایا آپ کا مقالہ بڑا تحقیقی اور موثر ہے، حضرت عثمان پر آج تک کوئی مقالہ اس انداز کا نظر سے نہیں گذرا، ندوہ میں ایک سے ایک فاضل اساتذہ موجود ہیں، ان سب حضرات نے بھی اسی قسم کے تاثرات کا اظہار فرمایا، فالحمد للہ علیٰ ذالک، اب مولانا ابوالحسن میاں کی ہدایت کے مطابق یہ مقالہ اور اس کا عربی ترجمہ دونوں رسالہ کی شکل میں ندوہ کی طرف سے شائع ہوں گے۔

گذشتہ ماہِ مارچ کے برہان میں پہلا مقالہ جو "اسلامی نظامِ معیشت" کے عنوان سے شائع ہوا ہے اس کے متعلق نہایت افسوس کے ساتھ یہ اطلاع دیجاتی ہے کہ اس مقالہ کو پڑھکر ڈاکٹر یوسف الدین صاحب، جامعۂ عثمانیہ نے ہمیں ایک طویل خط لکھا ہے جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ مقالہ نگار نے اپنے بارہ صفحات کے مقالہ میں دس صفحات لفظ بلفظ ان کی کتاب "اسلام کے معاشی نظریے" کی جلد اول باب سوم سے از صفحہ ۲۳۹ تا صفحہ ۲۵۱ بغیر حوالہ کے نقل کر لئے ہیں، ہم نے خود بھی ڈاکٹر صاحب کی کتاب الماری سے نکال کر دیکھی اور اس کے متعلقہ صفحات کا مقابلہ مقالہ کے صفحات سے کیا تو جو کچھ ڈاکٹر صاحب نے لکھا تھا اسے حرفاً حرفاً درست پایا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ مقالہ نگار کی یہ حرکت پہلی نہیں ہے، بلکہ اس سے پہلے وہ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے مقالات کے ساتھ بھی یہ سلوک کر چکے ہیں، اگر یہ صحیح ہے تو اس کو 'چہ دلاور ست'

وزدے کہ بکف چراغ دارد" کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے، مقالہ نگار جامعہ عثمانیہ کے گریجویٹ ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں، ہو سکتا کہ ایسے گریجویٹ اپنی یونیورسٹی کے لئے باعث ننگ و عار ہیں۔ بہرحال ہمیں سخت افسوس ہے کہ برہان میں یہ مقالہ شائع ہو گیا، ہم قارئین سے اس کے لئے معذرت خواہ ہیں

اللہ کی شان ہے، میں کالیکٹ یونیورسٹی سے سبکدوش ہو کر ۱۵ر مارچ کی شب میں علی گڑھ پہونچا۔ اور ۱۶ر مارچ کی صبح کو علی گڑھ کے پتہ پر آئی ہوئی اپنی ڈاک دیکھی تو اس میں ایک خط عزیز مکرم ڈاکٹر سید سلمان ندوی (فرزند ارجمند مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ) صدر شعبۂ اسلامیات، ڈربن یونیورسٹی جنوبی افریقہ) کا ملا جس میں لکھا تھا کہ یونیورسٹی نے شعبۂ اسلامیات کو ایک فیکلٹی بنا کر اس کے ماتحت متعدد ڈپارٹمنٹ قائم کر دیئے ہیں، ان میں شعبۂ دینیات کی صدارت اگر آپ سال دو سال کے لئے بھی قبول کرلیں تو ہم سب بڑے شکر گذار ہوں گے اس کے بعد ۳۰ر اور ۳۱ر مارچ کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اگزیکٹو کونسل کی میٹنگ ہوئی اس میٹنگ میں ڈاکٹر محمد اقبال انصاری صدر شعبۂ اسلامیات کے اتفاق رائے اور رضامندی سے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے بحیثیت ڈین، فیکلٹی آف سوشل سائنسیز جس میں شعبۂ اسلامیات بھی شامل ہے۔ خاکسار راقم الحروف کو ایک برس کے لئے شعبۂ اسلامیات میں وزیٹنگ پروفیسر مقرر کرنے کی تجویز پیش کی، جناب وائس چانسلر صاحب نے پُرزور تائید کی اور کونسل نے باتفاق آرا یہ تجویز منظور کر لی۔ چنانچہ ۲ر اپریل سے میں شعبۂ اسلامیات سے وابستہ ہو گیا ہوں، یہ سب کچھ اچانک اس سرعت سے ہوا کہ ۳ر اپریل کو جب مجھے اس کی اطلاع ہوئی تو مسرت کے ساتھ حیرت بھی ہوئی۔ میں ان سب دوستوں کا اس قدر افزائی پر صمیم قلب سے شکر گذار ہوں، ایک اردو شعر ترمیم کے ساتھ:

دائم رہی ہے شفقتِ اہل نظر سعیدؔ
گذری ہے اپنی عمر ادائے سپاس میں

شیخ عبدالرحمٰن چشتی رح

از

(جناب ڈاکٹر محمد عمر صاحب ریڈر شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

(۳)

اس کے بعد پاروتی نے مہادیو سے دریافت کیا کہ "قادر مطلق اس شخص کو اس متبرک اور بابرکت مقام میں پیدا کرے گا یا کسی دیوتا یا راکشس کے گھر میں یا وہ خود بخود وجود میں آجائے گا۔ حقیقتِ حال کو بیان کریں۔ مہادیو نے جواب دیا: "اے پاروتی وہ کانتن ہوسچھ (۱) کے صلب سے پیدا ہوگا اور اس میں دریا کے مثل دانش اور عرفان پایا جائے گا۔ اس سے مرد اید پیدا ہوں گے۔ اس کی بیوی کا نام اساکھ رکھا تھا۔ وہ تینوں بید (وید) یعنی سام وید، رِگ وید اور یجر وید کا مطالعہ کر چکا ہوگا اور چوتھے وید، اتھر وید کو الف لام حروف تک پڑھ کر چھوڑ دے گا، اس کے آگے نہ پڑھے گا۔ شوت اور شونک نے بشست مُنی سے سوال کیا: جب اس میں دریا کے مثل عِرفان پایا جائے گا تو کلامِ (ربانی) سے وہ کس طرح انکار کرے گا اور چوتھے وید کا مطالعہ صرف الف لام کے آگے کیوں نہ کرے گا؟" بشست نے جواب دیا: "چوں کہ برہما نے چاروں وید خلق اللہ پر ستجگ میں ظاہر کر دیئے تھے یعنی دیوتا و منی عنصری نے لوگوں کو تربیت کی تھی۔ اور اُنھیں چاروں ویدوں کو بامعنی پڑھا دیا تھا اور اُنھیں وصیت کی تھی کہ ستجگ کے دور میں وہ لوگ سام وید کی تعلیمات کے مطابق عمل کریں۔ دورِ ترتیا میں رِگ وید کے مطابق عمل پیرا ہوں اور دواپر میں یجر وید پر عمل کریں۔ کلجگ کے زمانے میں قادرِ مطلق مٹی کے ڈھیلے سے مخلوق

کو جنم دیں گے ۔ وہ لوگ اتھروید کی تعلیمات پر عمل کریں گے - اتھروید میں چار حصے ہوں گے۔ یعنی چار چرٹن - تین حصے آدم اور ان کے بیٹے پڑھیں گے اور چوتھا حصہ جس میں چاروں بیدوں کی تلخیص ہے، مہامت یعنی محمد رسول اللہ علیہ السلام کے علاوہ آدم کی اولاد میں سے کوئی دوسرا شخص اس پر عمل نہ کر سکے گا - اگر چوتھی قسم کو کوئی شخص مہامت کی بلا اجازت پڑھے گا، اُسے اس کا کوئی اجر نہ ملے گا - لہذا کانت بہو سمجھ یعنی حضرت عبداللہ اپنی دیانت داری کی وجہ سے وید کی چوتھی قسم کا مطالعہ نہ کریں گے کیوں کہ ان کے پاس یہ دوسروں کی امانت تھی اور خدا کے کلام سے انکار کرنا لازم نہیں آتا ہے"۔ یہاں تک بششت کی گفتگو تھی - اس کے بعد مہادیو نے کہا" اے پاروتی - وہ اپنی برادری میں بزرگ ہو گا اور اس قبیلے کے تمام لوگ ان کے دروازے پر آئیں گے، ان کی اطاعت کریں گے - پہلے ان سے تین لڑکے پیدا ہوں گے اور ان کے بعد جب چوتھا لڑکا پیدا ہو گا وہ کسی بھی جاندار سے خوفزدہ نہ ہو گا - ان لڑکوں میں سے وہ ہر ایک بہادر اور صاحب عرفان ہو گا - اس کا نام مہامت ہو گا یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم - ان کے طور طریقوں کو دیکھ کر ان کے قبیلے کے لوگ حیران رہ جائیں گے - اور ان میں غیر معمولی باتیں دیکھیں گے - سُرین کے آگے انسانوں میں جو پوست پایا جاتا ہے وہ اُن میں نہ ہو گا - چند سالوں کے بعد جب ان کے داڑھی نکلے گی - سر اور داڑھی کے علاوہ ان کے جسم میں کہیں کثرت سے بال نہ ہوں گے کہ انھیں حجام کی ضرورت پڑے - جس طور پر ان کے قبیلہ کے لوگ عبادت کریں گے وہ اس طرز پر عبادت نہ کریں گے - وہ اپنی قوم کے لوگوں سے کہیں گے کہ " قادر بے چون نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہارے طریقے کے مطابق عبادت نہ کروں - میں ذاتِ مُطلق کے علاوہ کسی دوسرے فرد کو رجوع نہیں کرتا ہوں اور تم لوگوں کو میری پیروی کرنی چاہیئے"۔

اِن کلمات کو سُن کر ان کے قبیلے کے لوگ ان سے علیحدہ ہو جائیں گے - بیاس مُنی نے بھاگوت پُران میں لکھا ہے کہ " کلجگ کے دور میں مہامت کا جنم ہو گا اور مسلمان لوگ مہامت کو محمد کے نام سے موسوم کریں گے - نہ تو ان کے جسم پر مکھی بیٹھی ہو گی اور وہ کثرت سے سفر کریں گے ، ان میں کثرت سے قوت

جماع ہوگی اور ان پر مادیت کا غلبہ ہوگا۔ وہ نہ تو دنیاوی ملکیت کے متلاشی ہوں گے، وہ دین کی تلاش کریں گے اور جو کچھ انھیں دستیاب ہوگا۔ سب کچھ وہ اللہ کے راستے میں صرف کر دیں گے وہ کم خور ہوں گے۔ عرب کا بادشاہ ان کا دشمن ہو جائے گا۔ وہ خدا کے دوست ہوں گے اور قادرِ دانا ان پر قرآن کے تیس روہپانہ (؟) یعنی سیپارے نازل کرے گا۔ جو شخص اس کتاب کی تعلیمات کے مطابق عمل کرے گا وہ خدا رسیدہ ہو جائے گا۔ اس زمانے میں اللہ کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہ ہوگا۔ یہاں تک بیاس کا بیان تھا۔

اس کے بعد مہادیو نے پھر کہا۔" اے پاروتی!

مہامت گزشتہ تمام عبادتوں اور قوانین کو منسوخ کر کے اپنی شریعت جاری کریں گے اور تمام خلقت کو اپنی شریعت کی تعلیم دیں گے۔ وہ ایسی کوشش کریں گے کہ تمام دنیا کو اپنے رنگ میں ڈھال لیں۔ رفتہ رفتہ بے شمار لوگ ان کے دین میں داخل ہو جائیں گے اور ان میں سے بیشتر خدا رسیدہ ہوں گے جس طرح کہ شاکت نے سنہ لکھا ہے۔ اُسی طرح کلجگ کے زمانے کی کتابوں میں وہ سنہ لکھیں گے۔ اے پاروتی!" مہامت کی منکوحہ سے جو بھی لڑکا پیدا ہوگا تو قادرِ مطلق کے حکم سے وکید (؟) نامی گندھرب یعنی فرشتہ ان کی جانیں قبض کرے گا اور اُنھیں آسمان پر لے جائیگا۔ دہست (؟) نامی یم یعنی قابض الارواح کا اُن کی متبرک جانوں تک گذر تک حاصل نہ ہوسکے گا۔ اس کے بعد خداوندتعالیٰ مہامت کے ہاں ایک لڑکی پیدا کرے گا جو ہزار لڑکوں سے برتر ہوگی۔ وہ بہت حسین و بے مثل ہوگی اور عبادت الٰہی میں منہمک رہے گی۔ دروغ اس کی زبان پر کبھی نہ آئے گا اور تمام صغیرہ و کبیرہ گناہوں سے پاک و مبّرا ہوگی۔ اپنے والد کے توسط سے وہ مقرب درگاہِ الٰہی ہوگی۔ قادرِ مطلق مہامت کی بیٹی کو سعادتمند دو بیٹے عطا کرے گا۔ وہ دونوں خوبرو باہمت اور محبوب الٰہی ہوں گے۔ وہ بے حد قوی، صاحبِ عرفان، بہادر اور نیک کاموں میں بے نظیر ہوں گے۔ ان کے بعد قادرِ مطلق بیچوں صوری اور معنوی اعتبار سے ان کی طرح دوسرے لڑکے پیدا نہ کرے گا۔ مہامت کے نواسے ان کے جانشین ہوں گے اور یہ حدیث اس واقعہ کی طرف

اشارہ کرتی ہے

قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم اِنَّ اللّٰہَ جَعَلَ ذُرِّیَّۃَ کُلِّ نَبِیٍّ فِیْ صُلْبِہٖ وَجَعَلَ ذُرِّیَّتِیْ فِیْ صُلْبِ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ رضی اللّٰہ عنہُ - کذا فی المشکوٰۃ

[نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی ذرّیت بنائی ہے جس میں اس کی نسل ہوتی ہے اور اس کی اپنی ذرّیت کو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی صلب میں بنایا - ایسا ہی مشکوٰۃ میں آیا ہے]

پھر اُن سے بہت سی اولادیں پیدا ہوں گی - روز بروز دینِ محمدی کو روشن کریں گے - مہامت نہ صرف اپنی تمام قوم بلکہ اپنی بیٹی کے مقابلے میں اُن دونوں نواسوں کو زیادہ عزیز رکھیں گے - وہ دونوں لڑکے دینِ محمدی میں کامل ہوں گے - وہ حظِ نفس کے لئے کوئی کام نہ کریں گے - اُن کے تمام اعمال و افعال قادرِ مطلق کی مرضی کے مطابق ہوں گے اور وہ ہمیشہ خداوند تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے کوشاں رہیں گے - ہر ایک نامراد و نادار کے حالات کو بڑے غور و خوض سے سماعت کریں گے اور ان کی مُرادوں کو بار آور کریں گے - اے پاروتی! مہامت کی رحلت کے چند سال بعد اُن کے دونوں نواسوں پر اس قوم کے بعض حرام زادے ظلم و ستم کر کے دنیاوی عظمت حاصل کرنے کی غرض سے انھیں قتل کر ڈالیں گے - ان کے قتل ہو جانے کے باعث ساری روئے زمین ایسی ہو جائے گی جیسے کہ بلا سر کے دھڑ - اُن کے قاتل ملیچھ یعنی مرتد و ملحد ہو جائیں گے، تمام دین و دنیا میں اُن کا شمار مردودوں میں ہوگا - ان کے باطن میں مہامت کے لئے کوئی خلوص باقی نہ رہے گا - بظاہر تو وہ لوگ دینِ محمدی کے پیرو ہوں گے اور شدہ شدہ بہت سے دوسرے لوگ بھی ان کے ہم نوا ہو جائیں گے - اور وہ لوگ اس راہِ روشن کے مخالف ہو جائیں گے جس پر مہامت کی اولاد گامزن تھی - اور دشمنی کی وجہ سے ان کی مخالفت کریں گے - کچھ ہی لوگ مہامت کی اولاد کی پیروی کرتے رہیں گے - اس کے برعکس بیشتر لوگ قاتلوں کی قوم کے مطابق عمل کرتے رہیں گے اور بظاہر مہامت کے عاشقوں میں ان کا شمار ہوگا - کلجگ

کے زمانے میں اس قوم کی تعداد میں بڑا اضافہ ہو جائے گا۔ اور وہ لوگ تمام دنیا میں فساد برپا کریں
اے پاروتی اس وقت خداوند تعالیٰ مہامت کے دین کی مدد کے لیے ایک کامل شخص کو بھیجے گا۔ تمام
روئے زمین کو وہ اپنے تصرف میں لاکر کے اکثر منافقین کو قتل کر دے گا۔ بعد ازیں اپنے اعمال پر نادم ہو کر
وہ لوگ راہِ راست پر آجائیں گے۔ اس کے بعد اُس راہِ روشن کو احیاء ہو گا جس راستے کو مہامت
اور ان کی اولاد نے بتایا تھا۔ اور مشرق تا مغرب کوئی بھی ایسا شخص نہ رہے گا جو اس راستے کی خلاف
ورزی کرے۔ جو راستہ مہامت اور اُن کے بیٹوں کا تھا۔ اُس وقت وہ انسانِ کامل ہر چند اس بات
کا پتہ لگائے گا لیکن کہیں بھی کسی کافر اور منافق کا پتہ نہ چلے گا۔ تمام دنیا کے انسان دینِ مہامت کا اتباع
کرنے لگیں گے۔ کلجگ کے آخری زمانے میں اُن کے دین کا مکمل طور پر غلبہ ہو جائے گا جس کا قادرِ مطلق نے اتھرو وید
یعنی کتابِ چہارم میں حکم دیا تھا۔ مہامت کے پیرو اس شریعت پر پوری طرح سے عمل کرنے لگیں گے اور
مرتبۂ کمال کو حاصل کر لیں گے۔ اے پاروتی۔ ہر چند وہ لوگ پایۂ کمال پر پہنچ جائیں گے لیکن اُن کا زوال
پھر بھی دور نہ ہو گا۔ اس کے بعد وہ مردِ کامل پوشیدہ ہو جائے گا۔ دنیا دوسرا رنگ اختیار کر لے گی اور ہر جگہ خلل
فساد رونما ہو جائے گا۔ کوئی بھی شخص اپنی ماں اور بہن کو نہ پہچانے گا اور انسان حیوانات کی زندگی اختیار
کر لیں گے۔ اُس زمانے میں زمین یہ فریاد کرے گی کہ یا الٰہی میں ان لوگوں کے گناہوں کے بوجھ سے ہلاک ہو
رہی ہوں مجھے نجات عطا فرمائیے۔ اے پاروتی اس فریاد کو سُن کر قادرِ قہار زمین کی مُناجات کو قبول کر
لیں گے۔ سنبھل نامی مقام میں رہنے والے ایک کافر زنّار دار برہمن کے گھر سے قہّاری کی صفت سے متّصف
ایک کلکی اوتار ([illegible]) ظاہر ہو گا۔ اس وقت زمین و آسمان حرکت میں آجائیں
گے اور تیز و تند ہوا چلنے لگے گی۔ خلقت پر قیامت آجائے گی روئے زمین کے تمام موجودات معدوم ہو
جائیں گے۔ دنیا میں تاریکی چھا جائیگی اور کچھ عرصے دنیا خراب اور ویران رہے گی۔ اُسی زمانے میں قادرِ
مطلق آدم کو معہ اُن کی قوم کے دوبارہ زندہ کریں گے۔ جب سب لوگ زندہ ہو جائیں گے تو قادرِ مطلق بھارت کی
بیٹی سے کہیں گے " اپنے بیٹوں کے لئے تم نے جو فریاد کی تھی اس وقت وہ تمہارے دونوں بیٹے موجود ہیں ان
کو اپنے ساتھ لو اور بہشت میں چلی جاؤ۔" اپنے بیٹوں سے مل کر وہ اپنی جگہ پر کھڑی رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ کا پھر

حکم ہوگا" اے مہامت کی بیٹی! تمہاری کیا خواہش ہے؟ اس کو بیان کرو۔ لہٰذا مہامت کی بیٹی اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں گی اور کہیں گی "یا خداوند عالم جس کسی نے بھی محمد رسول اللہ کا کلمہ پڑھا ہے ان سب لوگوں کو بخش دے" قادرِ کریم مہربان ہو کر فرمائیں گے۔ "مسلمانوں کی جماعت کو میں نے بخش دیا" مہامت کی بیٹی یعنی حضرت فاطمہ معہ اپنے بیٹوں کے سربسجود ہو جائیں گی اور تمام مسلمانوں کو اپنے ہمراہ لے کر سورگ ([illegible]) یعنی بہشت میں چلی جائیں گی۔ اس طرح ان کے دور کا خاتمہ ہو جائے گا اور کلجگ کا دور ختم ہو جائے گا۔ یہ بیان مہادیو کا تھا جس کو پاربتی نے بیان کیا۔ واللہ اعلم بالصواب (اللہ ہی حقیقتِ حال کو جانتا ہے)

غرضکہ مہادیو کے ان بیانات سے تناسخ کی تردید ہوتی ہے کیوں کہ تناسخ میں تسلسل لازم آتا ہے۔ اور یہاں ایک دور کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اس قوم (ہندوؤں) کے بعض متکلمین اپنی کوتاہ علمی کے سبب سے تناسخ کے اصول میں عقیدہ رکھتے ہیں۔ بیاس نے جو اس قوم کے مقتدا تھے، دلائل اور براہین کے ذریعہ عقیدۂ تناسخ کی تردید کی ہے اور دوسرے رشی بھی اس بات پر اتفاق کرتے ہیں۔ اس لیے ان تینوں شلوکوں کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

شلوک اول: نسخہ ہشتم اوتار ([illegible]) یعنی اس سے تناسخ کا اصول ثابت ہوتا ہے اور اس اصول کی تائید میں یہ دلیل پیش کی گئی ہے کہ جس طرح تمام دنیا میں ایک بادشاہ ہوتا ہے، دوسرا غریب ہوتا ہے۔ ایک شخص اندھا ہوتا ہے اور دوسرا کوئی لنگڑا۔ کوئی عاجز اور کوئی قادر ہوتا ہے۔ لہٰذا ان باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر وہ فرد جو دنیا میں نیک اعمال کرتا ہے انہی اعمال کی مناسبت سے دوسری مرتبہ ایک اوتار کی صورت میں جنم لیتا ہے۔ ورنہ خداوند تعالیٰ پر ظالم ہونے کا الزام لازم آتا ہے کہ بلا وجہ ایک کو وہ بادشاہ بناتا ہے اور دوسرے کو عاجز اور نادار۔ شنکر اچاریہ نے بیاس کی اس تکرار کو بطور دلیل پیش کر کے عقیدۂ تناسخ کی تردید کی ہے۔ چنانچہ ان کا بیان ہے کہ اوتار نہیں ہوتے ہیں اور اس بات کا جواب یوں دیتے ہیں کہ خدا قادر اور حکمت

والا ہے۔ جو وہ چاہتا ہے ویسا ہی کرتا ہے۔ کیا تم اس بات کو نہیں دیکھتے ہو کہ ایک بڑھئی درخت کی لکڑی سے بادشاہ کے لیے تخت اور غریب کے دروازے کے لیے تختہ بناتا ہے۔ چنانچہ ایک کمہار ایک ہی قسم کی مٹی سے بادشاہ کے لیے کوزہ اور فقیر کے لیے کاسۂ گدائی بناتا ہے۔ لہٰذا اس لکڑی اور مٹی سے کون سی نیکی یا بدی سرزد ہوئی تھی کہ انھیں اس کا اجر عطا کیا گیا۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ابتداء میں جب مخلوق کا وجود نہ تھا انہوں نے کون سی نیکی یا بدی کی تھی کہ ایک نے انسان، دوسرے نے حیوان اور تیسرے نے فرشتہ کی صورت اختیار کی۔ لہٰذا اس بات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصولِ تناسخ کے معتقد اپنے عقیدے کے بارے میں واضح طور پر علم نہیں رکھتے۔

شلوک دوم۔ کیولا اودیت ([illegible]) میں دُنا چاریہ نے جیمنی کے بیان کی تردید کی ہے۔ جیمنی کا قول ہے کہ ہم لوگ خالق کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ روح کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات نہیں ہے۔ روح کو کوئی پیدا نہیں کرتا ہے وہ خود بخود آتی ہے اور خود بخود چلی جاتی ہے اودیتا چاریہ اس قول کی تردید کرتے ہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ "تم خود ہی آتما اور پرم آتما کہتے ہو"۔ لہٰذا آتما سے مراد روح ہے اور پرم آتما سے مراد وہ خدا ہے جو ازل سے باقی ہے۔ اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیا میں جو کوئی بھی چیز پائی جاتی ہے، بظاہر وہ کسی نہ کسی چیز سے جنم لیتی ہے اور مجھ میں اور تم میں اس بات کی قدرت نہیں ہے کہ تمام دنیا کو یا اپنے کو خود بخود پیدا کریں اور اگر تم یہ کہو کہ تمام اشیاء خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں تو یہ سب باتیں بے بنیاد ہیں۔ کیوں کہ اگر وہ سب چیزیں خود بخود پیدا ہو جائیں تو کسی بھی شئے میں کسی بھی قسم کی تبدیلی رونما نہ ہوتی۔ ہر چیز اپنی اصلی حالت ہی میں رہتی اور تغیر پذیر نہیں ہوتی ہے جب اُن میں تبدیلی وقوع پذیر ہوتی ہے اور معدوم ہوتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسا خالق ہے جو اُن سب چیزوں کو پیدا کرتا ہے اور نیست و نابود کرتا ہے۔ اور اگر تم یہ بات کہو کہ یہ تغیر و تبدل از راہ گردش زمانہ ہوتا تو میں کہوں گا کہ جو شخص تخلیق کرتا ہے اور معدوم کرتا ہے تو اُسے قدرت اور علم وغیرہ حاصل ہونا چاہیئے۔ اگر زمانہ میں یہ قدرت اور صفت نہیں پائی جاتی ہے تو وہ کیسے خالق ہو سکتا ہے۔ اگر وہ خالق ہے تو تم نے اس کے نام میں غلطی کی۔ ہم سب لوگ اُسے

خالق کہتے ہیں۔ تم اُسے زمانہ کہتے ہو اور ایسا ہی تصور کرتے ہو۔ اس لیے اس بات سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ اوتار نہیں ہوتا ہے۔

شلوک سوم۔ ویدانت کے چرن سوم (حصۂ سوم) میں جیسپال[1]، رشیوی اور بیاس کا یہ قول پایا جاتا ہے کہ جیمنی و گوتم کا بیان یہ ہے کہ وہ لوگ اصولِ تناسخ میں عقیدہ رکھتے ہیں اور اس طرح سے وہ اپنی حیثیت کو اوتار ثابت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسی وہم کی وجہ سے لوگوں نے عقیدۂ تناسخ اختیار کر لیا ہے۔ جیسپال (کپل) اور بیاس کا کہنا ہے کہ ان لوگوں نے اس بات کو غلط سمجھا ہے کیوں کہ نیکی و بدی کا اجر سورگ اور نرگ یعنی بہشت اور دوزخ کی صورت میں دوسری دنیا میں ملے گا۔ دراصل وہ اجر اسی دنیا میں مل جاتا ہے۔ بدیں صورت اُن روحوں کو دوسرے قالب میں دوبارہ دنیا میں آنے کی کیوں کر ضرورت پڑتی ہوگی۔ یہ یقینی امر ہے کہ نیکی اور بدی کا بدلہ جنت اور دوزخ کی صورت میں ملتا ہے۔ جب ان اعمال کا بدلہ اسی دنیا میں مل گیا تو تخم منقطع ہو جاتا ہے اور بلا تخم کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی ہے۔ ان دلائل کی روشنی میں عقیدۂ تناسخ کی تردید ہوتی ہے ان کی قوم میں بیاس اور جیسپال (کپل) مجتہد کی حیثیت رکھتے ہیں اور راہِ سلوک کے مالک تھے جیمنی اور گوتم دانشور فلسفی تھے۔ انھوں نے دوسرا راستہ اختیار کر لیا تھا اور افلاطون فلسفی گوتم ہندی کے شاگرد تھے۔ الغرض میں پھر اپنے اصلی مباحث کی طرف رجوع ہوتا ہوں۔

سُوت اور شونک نے بشست سے یہ سوال کیا کہ مہادیو اور پاروتی نے آدم کی پیدائش کے بارے میں جو کچھ کہا تھا کیا آپ اس بات کو جانتے تھے یا یہ کہ آدم اور ان کی اولاد کی ولادت آپ کے زمانے میں ہوئی تھی۔ مہادیو نے جس طرح ان کی ولادت کے متعلق پیشین گوئی کی تھی، کیا اُسی طرح ان کا جنم ہوا تھا یا اس میں کسی قسم کا فرق آیا تھا؟" بشست نے جواب دیا:

تم لوگوں نے ابھی تک مرتبہ عرفان حاصل نہیں کیا ہے کیوں کہ تم لوگ بھی اسی لوک میں تھے یعنی اسی دنیا میں تھے اور میں بھی تھا۔ وہ لوگ ہماری اور تمہاری موجودگی میں پیدا ہوئے ہیں۔ اسی لیے ہم

---

[1] کپیل

لوگ کس طرح اُس فرق کو دیکھ پاتے۔" انھوں نے پھر سوالات کیے۔ اور اُن سے مہادیو کی روایت بیان کرنے کی درخواست کی۔ انھوں نے کہا: "اے عزیزو! مہادیو نے پیدائش کی حقیقت کو بذاتِ خود بیان نہیں کیا ہے بلکہ انھوں نے سورگ یعنی بہشت میں جو کچھ لکھا دیکھا ہے اس بات کو بیان کیا ہے۔ اس لیے فرق کس طرح وقوع پذیر ہو سکتا ہے لیکن چوں کہ تم لوگوں کو اُن کلمات کے سُننے کا اشتیاق تھا، بدیں وجہ میں چند دوسری باتیں بھی کہتا ہوں۔ کان لگا کر سنو۔" قادرِ مطلق نے جب آدم صفی کو پیدا کر کے اُنھیں بہشت کے لباس سے ملبوس کیا تو تمام مخلوق نے اُنھیں سجدہ کیا جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ تمام خلقت آدم کے اِرد گِرد کھڑی تھی عالمِ غیب سے یہ آواز آئی کہ "میں نے تمام روئے زمین کو آدم کے حوالے کر دیا اور روئے زمین پر تم لوگوں کا کوئی دخل باقی نہ رہا۔ اس پہاڑ یا جنگل میں تمہارے لیے جگہ ہے جو جزیرہ میں واقع ہے۔ اس لیے اس ندا کو سُن کر بعض دیوتا آسمان پر گئے اور مہادیو پاروتی کو ساتھ لے کر کوہِ کیلاش پر چلے گئے اور عیش و عشرت میں مصروف ہو گئے۔ اکثر وبیشتر رشی لوگ اور وہ لوگ جو صاحبِ فہم تھے" زمین چھوڑ کر پہاڑوں پر چلے گئے۔ چوں کہ اسی قوم کا بادشاہ اور دوسری مخلوق روئے زمین پر آباد تھی اس لیے یکایک کہاں جاتے۔ آدم کی اولاد اس کثرت سے بڑھی کہ انھوں نے جنوں کی قوم کو علیحدہ کر دیا اور ان کی جگہ پر خود آباد ہو گئے۔ جب آدم کی اولاد نے زیادہ بے باکی سے کام لیا تو جنوں کے بادشاہ نے اپنی قوم سے کہا کہ اُنھیں اپنے مُلک پر قبضہ حاصل نہ کرنے دیں۔ اس لئے جنوں کی قوم غالب آگئی اور اُنھیں مغلوب کر لیا۔ اُس زمانے میں آدم کے بعض لڑکوں نے جو اپنی ریاضت کی بنا پر مقربِ درگاہِ الٰہی ہو چکے تھے، جنوں کے مظالم سے تنگ آ کر اللہ تعالیٰ سے اس بات کی شکایت کی۔ قادرِ مطلق نے اُن کی دعا قبول فرمالی۔ نارد کو یہ حکم ہوا کہ وہ روئے زمین پر جا کر جنوں وغیرہ کی قوم سے یہ بات کہے کہ "میں نے آدم کے بیٹوں کو تمام سرزمین عطا کر دی ہے میں نے اس شریعت کو منسوخ کر دیا ہے جو میں نے تینوں ویدوں کے ذریعہ عطا کی تھی۔ اب نہ تو تمہاری عبادت اور نہ تمہارے شلوک کا اثر روئے زمین پر ہو گا۔ اب بلا وجہ تم لوگ اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ وہ زمین جو بڑے پہاڑوں اور دریاؤں پر مشتمل ہے، وہ میں

نے تمہیں عطا کی۔ تمہاری شریعت میں گائے کی پرستش عبادت تھی۔ میں نے انھیں (اولادِ آدم) کو حکم
دیا کہ وہ گائے ذبح کریں اور کھائیں۔ گاؤکشی دیکھ کر تمہیں جسمانی اذیت پہونچے گی۔ تمہاری فلاح
و بہبود کا انحصار اس بات پر ہے کہ تم اگر اپنی زندگی چاہتے ہو تو پہاڑ پر چلے جاؤ یا عارضی زندگی
کو ترک کر دو اور افلاک پر آکر عالم ارواح میں رہنے لگو۔ فی الحال تم لوگ روئے زمین کی لالچ
اپنے دل سے نکال دو تاکہ زمین اور دار یعنی سنجگ ترتیا اور دوا پر یگ تمہارا عمل و دخل باقی رہے
اس وقت کلجگ کا دور آگیا ہے، روئے زمین پر تمہارا قیام باعثِ خرابی و ہلاکت ہے۔ اس لیے
نارد نے استدعا کی کہ "یا الٰہی میں حسب الحکم روئے زمین پر جاتا ہوں اور اس قوم کو آپ کا حکم
پہونچائے دیتا ہوں۔ لیکن وہاں جانا معصیت میں ملوث ہونا ہے۔ اس لئے آپ میرے احوال
سے باخبر رہیں تاکہ میں گناہ کا مرتکب نہ ہوں۔" اُس وقت قادرِ مطلق کا ارشاد ہوا۔ "تم خاطر جمع
ہو کر جاؤ جس طرح کمل نامی پھول پانی میں رہتا ہے تاہم اس پر پانی کا اثر نہیں ہوتا، اُسی
طرح میں اس لوک (دنیا) میں تمہاری نگرانی کروں گا۔ اُس لوک کا تم پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ لہذا
روئے زمین پر اتر کر نارد نے اُس قوم کے بزرگوں، دیوتاؤں اور جنوں کو محولا بالا پیغام پہونچایا اور
اُن سے کہا کہ "تم لوگ اگر پروردگار کے حکم سے روگردانی کروگے تو تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ تمہاری بھلائی
اسی بات میں ہے کہ اس لوک سے چلے جاؤ۔ ورنہ کشن نامی شخص کو قادرِ مطلق اپنی صفات سے
متصف کر کے تمہاری قوم میں پیدا کرے گا جو تمہاری ہلاکت کا باعث ہوگا۔ بہریں وجہ روئے زمین پر
تمہارا نام و نشان باقی نہ رہے گا۔" بیس سال کی مدت تک نارد اس پیغام کا اس لوک میں پرچار کرتے
رہے۔ اُن کلمات کو سن کر تمام دیوتا روئے زمین سے کنارہ کش ہو کر کیلاش پہاڑ پر چلے گئے جہاں
انہوں نے مہادیو سے درخواست کی کہ "وہ لوگ قادرِ قہار کے حکم کے مطابق روئے زمین کو چھوڑ کر
یہاں چلے آئے ہیں۔ اب آپ جہاں کے لیے حکم دیں، وہیں ہم سکونت اختیار کر لیں۔ قادرِ مطلق کی عبادت
میں مشغول ہو جائیں۔" اس موقع پر مہادیو نے جواب دیا "کیلاش پہاڑ کے حصے میں میں رہتا ہوں
ابھی دو حصے خالی ہیں، تم لوگ ان میں استقامت کرو اور عبادت میں لگ جاؤ۔" سارے دیوتا

کیلاش کے اُن حصوں میں چلے گئے۔ اللہ کی قدرت سے مذکورہ مقام اُن کے لیے آبِ حیات کے
مثل ثابت ہوا۔ یہاں تک بشسٹ کی گفتگو کا ذکر تھا۔

بیاس پھر کہتے ہیں کہ "جب جنوں کی اس قوم کے رِشیوں یعنی عابد بزرگوں نے بشسٹ
کی زبانی یہ بات سُنی کہ قادرِ مطلق کے حکم سے دیوتا لوگ روئے زمین چھوڑ کر کیلاش پہاڑ پر چلے گئے
تو انھیں اس بات کو سُن کر حیرت ہوئی۔ تمام کامل لوگ جمع ہوئے اور نیمی سار (निमसार)
کے مقام پر آ کر سُوت اور شونک سے التجا کی۔ "ہماری قوم میں آپ ہی بزرگ ہیں، چاروں
ویدوں کا آپ کو گیان حاصل ہے اور قادرِ مطلق کی مرضی سے بھی واقف ہیں، آپ جو کچھ فرمائیں گے،
ہم لوگ انھی باتوں پر عمل کریں گے۔ لہٰذا سُوت اور شونک نے فرمایا۔" چند دنوں اور توقف کرو
کیوں کہ دواپر کے دور کے ختم ہونے میں ابھی چند دن اور باقی رہ گئے ہیں۔ جس وقت کلجگ کا دور
شروع ہو گا تو اس عارضی زندگی کو ہم خود ترک کر دیں گے اور تم لوگ بھی ترک کر دینا۔ کیوں کہ اس
لوک میں ہم لوگ ہرگز نہیں رہ سکتے۔ اور ظاہری لوک کے تجنے کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ نہیں ہے
اس کے چند سالوں کے بعد وہ تمام راکھچس، سُوت اور شونک کے ساتھ غائب ہو گئے۔ لیکن بعض
جن مثلاً ارجن، کنس، سِسُپال، جراسندھ، بجرناتھ، کیسیتے (؟) وغیرہ نے، جو بڑے راجا تھے،
اپنے گھمنڈ میں اس مُلک کو نہ چھوڑا۔ اور دنیا کی خاطر اللہ تعالیٰ کے حکم سے روگردانی کر کے انواع واقسام
کے فساد اس مُلک میں پیدا کر دیئے۔ اُن مغرور لوگوں میں بیشتر ہندوستانی تھے۔ آدم کی اولاد نے
دوسرے ملک پر تصرف حاصل کر لیا تھا لیکن متذکرہ جنوں کے زور و تندی کی بنا پر ہندوستان
پر قبضہ نہیں کر پا رہے تھے۔ واقعہ حال کو دیکھ کر نارد نے آسمان پر واپس جا کر قادرِ مطلق کے حضور
میں عرض کیا۔ ان کے ساتھ بشسٹ بھی آسمان پر گئے۔ اس زمانے میں قادرِ مطلق کی مرضی کے
مطابق کنس نامی دیو کی بہن دیوکی کے حمل قرار پایا، اور کشن کا باپ باسدیو دیوتاء عنصری کی
حیثیت رکھتا تھا۔ کنس ایک ظالم و جابر بادشاہ تھا اور متھرا اس کا مستقر تھا۔ اپنی بہادری
اور لشکری قوت کے زور پر اس نے ہندوستان کے تمام راجاؤں کو اپنا مطیع بنا لیا تھا۔ اور طرح

طرح کے فساد برپا کرتا رہتا اور سرکشی کرتا تھا۔ اس کے مظالم سے عاجز آکر لوگوں نے اُس قوم کے تمام کامل افراد سے رجوع کیا۔ انھوں نے اُنھیں مژدہ سُنایا کہ خاطر جمع رکھو' دیوکی کے بطن سے کشن نامی لڑکا پیدا ہوگا اور وہ کنس کو ہلاک کردے گا۔ بعض نجومیوں نے اُس مفسد کو اس بات کی پیشین گوئی کردی تھی کہ دیوکی کے بطن سے جو لڑکا پیدا ہوگا وہی اس کا قاتل ہوگا۔

بدیں وجہ دیوکی کے بطن سے جو لڑکا تولد ہوتا وہ اُسے قتل کروا دیا کرتا۔ چناں چہ یہ قصہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ کشن کے قتل کرنے کا اس نے بہت قصد کیا لیکن قادرِ مطلق نے اُسے محفوظ رکھا اور چند دنوں کے بعد کشن نے کنس کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے ملک پر قبضہ کرلیا۔ کنس کے اس واقعہ کی خبر سُن کر جراسندھ (کنس کا خُسر تھا) نے دوسرے راجاؤں کو اپنے ساتھ لے کر متھرا آکر کشن پر لشکر کشی کردی۔ کشن اُنھیں بھی پسپا کرنے میں کامیاب ہوا۔ انھوں نے کالے جمن (یعنی جمشید) کو ساتھ لے کر دوبارہ کشن پر چڑھائی کردی۔ حملہ آور سے مقابلہ کرنے کو دور از مصلحت سمجھ کر کشن تمام لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر دوارکا کی طرف چلا گیا اور سب قبیلوں کو وہاں چھوڑ کر تنِ تنہا کالے جمن کے پاس آیا اور اُسے دھوکا دے کر جادو کے زور سے مار ڈالا۔ اس کے تمام مال و اسباب اور خزانوں پر قبضہ کرلیا۔ واپس جا کر دوارکا میں سکونت پذیر ہوگیا۔ تھوڑی سی مدت کے بعد جراسندھ و جرناتھ اور دوسرے دیوتاؤں اور بڑے راجاؤں کو ہلاک کردیا جو جنوں کے قوم سے تھے۔

قادرِ دانا نے خود کو اپنی قدرتِ کاملہ سے کشن کے روپ میں ظاہر کیا تھا اس لئے کوئی بھی فرد اس پر فتح نہ پاسکا۔ کامروپ نامی ملک میں کرور نامی (नरकासुर) ایک بڑا راجا صاحبِ جاہ و حشم تھا۔ اس ملک کے راجاؤں کی اٹھارہ ہزار لڑکیاں ظلم و تشدد کے ذریعہ اس نے اپنے قبضہ میں کرلی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کشن نے گرڑ (गरुड़) پر سوار ہو کر اس پر حملہ کیا۔ گھمسان کی جنگ ہوئی۔ آخرکار اُسے قتل کرکے اُن اٹھارہ ہزار لڑکیوں کو مع بے شمار اموال و خزائن پر قبضہ کرکے ان کے ساتھ عیش کی زندگی گذارنے لگے۔ اس کے بعد کوروؤں اور پانڈووں

میں مہابھارت کی جنگِ عظیم کروائی۔ کورو ایک سو ایک تھے۔ چوں کہ کرشن، پانڈوؤں کا ساتھ دے رہے تھے اس لئے کوروؤں کے ساتھ جو چند لاکھ افراد تھے اُن کا قلع قمع ہو گیا۔ اس کے بعد کرشن نے پانڈوؤں کو وصیت کی کہ اشومیدھ یگ کریں۔ (گھوڑے کی قربانی) اس لئے فوجیں ساتھ لے کر انھوں نے تمام روئے زمین کا چکر لگایا۔ جہاں کہیں بھی انہوں نے کسی بڑے راجا کو حکومت کرتے پایا اُسے بھی اُنہوں نے مطیع کر لیا۔ جب کسی مقام پر مغرور لوگ باقی نہ رہے تو کرشن کی یہ خواہش ہوئی کہ اس لوک سے انتقال کر کے غائب ہو جائے۔ اُس وقت اُس نے ارجن، اُددھو اور اکرور کو بلا کر یہ وصیت کی کہ "زمانہ کلجگ آگیا ہے اور میں غائب ہونا چاہتا ہوں۔ پانڈو قبیلے کے تمام لوگ برف کے پہاڑ پر جا کر عارضی وجود تج دو اور اب ایسا وقت نہیں رہا ہے کہ تم لوگ روئے زمین پر قیام کرو۔" اور اددھو کو مخاطب کر کے کہا "کوہ بدری کیدار پر جا کر عبادتِ حق میں مشغول ہو جاؤ۔" اور اکرور سے کہا "مان سرودر کے کنارے جا کر تم ذاتِ باری تعالیٰ کی عبادت میں لگ جاؤ۔" اس کے بعد وہ کرشن غائب ہو گئے۔ ایک سو بیس سال اس لوک میں رہ کر پانڈوؤں نے جا کر اس پہاڑ پر جان دیدی۔ پانڈوؤں کی نسل کے بعض راجا روئے زمین پر ہی رہ گئے تھے۔ آدم کی اولاد نے جا بجا سکونت اختیار کر لی۔ اور دن بدن ان کی طاقت میں اضافہ ہوتا رہا۔ آدم کی نسل کے بعض لوگوں نے جو اپنے بھائی کو قتل کر کے بھاگ گئے تھے یعنی قابیل نے بہت قوت حاصل کر لی اور ہندوستان پر حکومت کرنے لگا۔ جنوں کی بیٹیوں سے شادی کر لی اور اپنے والد کے نام نامی پر قنوج شہر آباد کیا۔ اس نے دیوؤں اور جنوں کے دین و مذہب کو اختیار کر لیا تھا۔ بیدوں کو پڑھتے تھے اور آدم کے صحیفوں کے مطالعہ سے محروم رہے۔ کچھ مدت کے بعد جب ہمارے پیغمبر مہا مت یعنی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کا وقت قریب آیا تو جنوں کے قوم کے جو لوگ روئے زمین پر رہ گئے تھے ان کی پیدائش اور تناسل کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ لہٰذا بدرجۂ مجبوری انہوں نے آدم کی اولاد کو متبنیٰ کی صورت میں اختیار کر کے اُنھیں اپنا جانشین مقرر کر دیا اور خود وہ لوگ غائب ہو گئے۔ اس طرح

ساری دنیا پر آدم کی اولاد کا قبضہ ہو گیا۔ حق تعالیٰ کی جو منشاء تھی وہ وقوع پذیر ہوئی۔ قال اللہ تعالیٰ یفعل اللہ ما یشاء و اللہ یحکم ما یرید۔ (اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے اور جس بات کا ارادہ کرتا ہے اس کا حکم دیتا ہے) یہ آیت اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ غرضکہ ہندوؤں کے اوضاع و اطوار سے جو کچھ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ لوگ آدم کی نسل سے تھے اور اب وہ لوگ اپنا سلسلۂ نسب جنوں کی قوم سے منسوب کرتے ہیں۔ اس زمانہ میں محولا بالا گفتگو سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ اپنی جہالت کی بنا پر انہوں نے اپنے آباد اجداد کے حسب و نسب، دین و مذہب کو فراموش کر دیا ہے اور وہ لوگ خود اپنے آپ کو پہچاننے میں قاصر ہیں۔ قولہ تعالیٰ من یھدی اللہ فما لہ من مضل و من یضللہ فما لہ من ہاد (اللہ جس کو گمراہ کرتا ہے اس کو ہدایت کرنے والا کوئی نہیں ہے اور جس کی ہدایت کرتا ہے اُسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا۔)

بتوفیق الملک المنان تمام شد (اللہ تعالیٰ کی توفیق سے یہ رسالہ مکمل ہوا)

حسب المقدور ذیل کے شلوک کے بارے میں تحقیق کی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فی الواقع گائے تری سے ہے اور گائے تری عمدہ تحریر ہے اور یہ گائے تری برہمنوں کی تصنیف ہے۔ گیان گائے تری ہندوؤں کا وظیفہ ہے جسے وہ اسم اعظم کہتے ہیں۔

اُدٓ آبھُو بھوہ سُوہ تت سوہ دیہُر گو دیوٗ اسیہ دھیم دیو نہ ہرتا یم پرو پیہ سر آنند آسن جنی نامہ مہامت (نام پیغمبر علیہ السلام) مُحمّد وِیگہ [1]

---

[1] بعض ہندو عالموں سے میں نے محولہ بالا شلوک کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا ہے۔ اور ان سے میں نے یہ دریافت کیا تھا کہ کیا وہ شلوک انہی الفاظ میں ہے جس طرح عبدالرحمٰن چشتی نے نقل کیا ہے؟ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ شلوک صرف اتنا ہے اور اُسی کا ہندو وظیفہ کرتے ہیں:۔ "اُدم بھوہ بھووہ سُوہ تت سویے تُر ورینیم بھرگو دیو سیہ۔ دھی مہیہ دھیو یونہ پرچودیات"

بقیہ حصے کا غالباً عبدالرحمٰن چشتی نے خود ہی اضافہ کر دیا ہے۔

کیا علماء انگریزی تعلیم کے مخالف تھے

جناب مولوی رفیع احمد صاحب بستوی مرکزی دارالعلوم بنارس

(۲)

حضرت مولانا نانوتویؒ دارالعلوم کے سالانہ جلسہ میں فرماتے ہیں -

آج کل علوم جدیدہ تو بوجہ کثرت مدارس سرکاری اس ترقی پر ہے کہ علوم قدیمہ کو سلاطین زمانِ سابقہ میں بھی نہ ہوئی ہوگی یا ان علوم نقلیہ کی عام اشاعت کا یہ تنزل بھی کسی کے زمانے میں نہ ہوا ہوگا۔۔۔۔ اگر طلبہ مدرسہ ہٰذا بعد تکمیل مدارس سرکاری میں جاکر علوم جدیدہ کو حاصل کریں تو ان کے کمالات میں یہ تعلیم زیادہ موثر ہوگی [۱]

سرسید نے مولانا کے بیان کا اکثر حصہ یکم ذی الحجہ ۱۲۹۰ھ کے تہذیب الاخلاق میں نقل کردیا ہے اور لکھا ہے کہ "ہم کو اس بات کی خوشی ہوئی کہ مولوی صاحب ممدوح بھی مسلمانوں کے حق میں علوم دنیوی جدیدہ کا حاصل کرنا ضروری تصور فرماتے ہیں [۲]

مولانا کی اس واضح رائے کے بعد ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی کہ مزید شہادتیں فراہم کی جائیں ویسے اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مولانا نانوتوی کی تمنا تھی "کاش کہ میں انگریزی جانتا تو اس سے بڑا فائدہ ہوتا [۳]

(۴) مولانا یعقوب نانوتوی (مدرس مدرسہ دیوبند (م ۱۸۸۴ء) مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ کے تذکرہ میں گذر چکا ہے کہ سرسید نے جب ان کو اور مولانا نانوتوی کو مدرستہ العلوم میں شامل

---

[۱] سوانح قاسمی ۲ / ۲۸۱ [۲] امداد صابری تاریخ صحافت اردو ۲ / ۳۶۸ بحوالہ تہذیب الاخلاق یکم ذی الحجہ ۱۲۹۰ھ [۳] قاری محمد طیب مسلک دارالعلوم ۲۸

کرنا چاہا تو ان لوگوں نے یہ عذر کیا کہ اس میں شیعہ بھی شامل ہیں۔ اس لئے ہم شرکت سے معذور ہیں، یہ جواب مولانا یعقوب صاحب نانوتوی ہی کے قلم سے لکھا گیا ہے[۱]

گویا ان دونوں بزرگوں کو مدرسۃ العلوم سے ہرگز کوئی اختلاف نہ تھا طفیل احمد منگلوری کا بھی خیال ہے کہ یہ لوگ مدرسۃ العلوم کی اسکیم سے متفق تھے۔ مگر سرسید سے اختلافِ عقائد کے سبب سے شرکت سے معذوری ظاہر کر دی تھی،

شیخ الہند مولانا محمود الحسن [م ۱۹۲۰] نے جامعہ ملیہ کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے کہا تھا کہ آپ میں سے جو حضرات باخبر ہیں، وہ جانتے ہوں گے، کہ میرے اکابر سلف نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان کے سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون کو حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا ہے[۲]

شیخ الہند کے اس واضح اعلان سے کم از کم اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ بزرگانِ دیوبند میں کسی بھی ذمہ دار عالم نے انگریزی تعلیم پر حرمت کا حکم نہیں لگایا تھا۔

(۵) نواب صدیق حسن خاں بھوپالی [۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۶ء] - نواب صاحب اپنی علمی اور دینی خدمات کی وجہ سے تعارف سے بے نیاز ہیں اور سرسید کے عقائد اور مشن کے متعلق آپ کی جو رائے تھی وہ بھی محتاجِ بیان نہیں۔ لیکن انگریزی تعلیم کے متعلق آپ کا عمل بالکل واضح تھا، آپ کے صاحبزادے جناب محمد علی حسن صاحب [۱۹۳۷] لکھتے ہیں" والا جاہ مرحوم نے برادر معظم مرحوم و مغفور اور راقم الحروف کو انگریزی تعلیم کی طرف توجہ دلائی اور ہم دونوں بھائیوں کی تعلیم انگریزی کا خاص طور سے اہتمام کیا"[۳]

مزید لکھتے ہیں" والا جاہ نے تعلیم انگریزی کے ذکر میں کہا کہ میں نے انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے بہت نقصانات اٹھائے "[۴]

---

[۱] ملاحظہ ہو۔ پورا مراسلہ۔ تاریخ صحافت اردو ...... ۲۶۰ [۲] شیخ الہند، خطبہ صدارت مع فتویٰ ص ۶-۵ المطابع دہلی [۳] نواب حسن خاں، مآثر صدیقی ۴/ ۶۲ (نور الکشنول ۱۹۲۱ء) [۴] مآثر صدیقی، ۴/۶۲

(۶) مولانا رشید احمد گنگوہی {۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء} مولانا مرحوم ایک استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں کہ "انگریزی زبان سیکھنا درست ہے، بشرطیکہ کوئی معصیت کا مرتکب نہ ہو اور نقصان دین اس سے نہ آئے" ۱

(۷) مولانا ناصر الدین ابو المنصور دہلوی امام مناظرہ اہل کتاب [م ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۳ء] مولف نوید جاوید وغیرہ موصوف سر سید اور ان کے عقائد کے سخت مخالف تھے انھوں نے ان کی تکفیر کا فتویٰ دیا۔ ۲ اور سر سید کی تفسیر کے رد میں ایک مستقل تفسیر "تنقیح البیان فی الرد علی تفسیر القرآن لسید احمد" کے نام سے لکھی ۳

ان تمام باتوں کے باوجود آپ نے خود انگریزی تعلیم حاصل کی۔ صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں، "تعلم اللغۃ الانجلیزیۃ" ۴ اس کے علاوہ اپنے صاحب زادہ مولوی نصرت علی دہلوی کو انگریزی کی اعلیٰ تعلیم دلائی چنانچہ مولانا نصرت علی کی متعدد انگریزی تصانیف موجود ہیں ۵

(۸) مولانا ابراہیم آروی [م ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۲ء] اپنے وقت کے مشہور عالم تھے آپ نے ۱۸۹۰ء میں مدرسہ احمدیہ آرہ قائم کیا مولانا سید سلیمان ندوی [۱۹۵۳ء] لکھتے ہیں کہ اس میں انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی ۶ مزید لکھتے ہیں کہ "ندوہ میں جب مولانا منصور علی مراد آبادی نے یہ تجویز پیش کی کہ نصاب میں علوم جدیدہ کا اضافہ کیا جائے تو مولانا شبلی مرحوم مولانا ابراہیم آروی نے اس اضافہ کی تائید کی اور یہ تجویز منظور ہو گئی" ۷ آپ کے سوانح نگار نے لکھا ہے کہ "آپ کو انگریزی میں دخل تھا" صاحب الحیاۃ بعد المماۃ کا بیان ہے کہ "آخری عمر میں یورپ کے تبلیغی دورے پر جانے والے تھے" ۸

---

۱ رشید احمد گنگوہی، فتاویٰ رشیدیہ ۱/ ۶۰ ۲ امداد الآفاق: فتاویٰ علماء دہلی ۳ رحمٰن علی تذکرہ علمائے ہند صفحہ ۲۳۳ نول کشور ۱۹۱۴ء ۴ عبد الحی حسنی: نزہۃ الخواطر صفحہ ۴۴۸ ۵ رحمٰن علی، تذکرہ علمائے ہند اردو، مرتبہ ایوب قادری ۸۰- ۵۱۰- اس بات کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مولوی نصرت علی سر سید کے سخت مخالف تھے سر سید کے رد میں آگرہ سے شائع ہونے والے رسالہ تیرھویں صدی کے ایڈیٹر آپ ہی تھے ملاحظہ ہو کرزن گزٹ دہلی ۱۵ مارچ ۱۹۱۲ء ۶ سید سلیمان ندوی حیات شبلی (۱۱- ۳۰۸)

نزہۃ الخواطر ۸ صفحہ ۱۱

(۹) مولانا محمد حسین بٹالوی [م ۱۳۳۸ھ] آپ کا مشہور اخبار "اشاعۃ السنۃ" امرتسر سے شائع ہوتا تھا[1]۔ آپ اس کے رد میں کافی مشہور ہے۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ "تہذیب الاخلاق" کے توڑ کے لئے پنجاب سے شائع ہوا[1]

مولانا شمس الحق ڈیانوی [م ۱۳۲۹ھ] لکھتے ہیں "ثم تعاقب تعاقبا حسنا الفاضل اللاہوری ابوسعید محمد حسین حیث اطنب الکلام فی الرد علی تلک الطائفہ فی اشاعۃ السنۃ والرسائل الاخری[2]" مگر انگریزی تعلیم کے سلسلہ میں موصوف کی رائے بالکل دو ٹوک ہے۔ چنانچہ اشاعۃ السنۃ میں ایک طویل مضمون انگریزی تعلیم کے جواز پر تحریر فرمایا[3] اور برابر اس قسم کے خیالات ظاہر کرتے رہے (۱۰) مولانا لطف اللہ علی گڑھی [م ۱۳۳۴ھ]۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ "آپ نے انگریزی میں اتنی شد بد پیدا کرلی تھی کہ تار وغیرہ پڑھ لیتے تھے"[4]

(۱۱) مولانا محمد سعید بنارسی [م ۱۳۲۲ھ] اپنے وصیت نامہ میں جو ۱۳۱۴ھ میں مرتب کیا گیا ہے لکھتے ہیں "یہ چند کلمات وصیت کے لکھ دیتا ہوں میری اولاد و احباب عمل کریں گے تو انشاء اللہ دنیا و آخرت میں نفع میں رہیں گے" آگے لکھتے ہیں "احمد و محمود کو علم انگریزی و انٹرنس یا ایف اے تک پڑھا یا جائے پھر کوئی روزگار کریں"[5]

(۱۲) مولانا نواب وحید الزماں حیدر آبادی [م ۱۹۲۰ء / ۱۳۳۸ھ] مولانا موصوف صحاح ستہ وغیرہ متعدد کتب کے تراجم کی وجہ سے کافی مشہور ہیں اور آپ نے اپنی مختلف کتابوں میں نیچریت کا زبردست رد بھی کیا ہے۔ مولانا عبدالحی حسنی [م ۱۳۴۱ھ] لکھتے ہیں "درس الانگلیزیۃ فی کبر سنہ وحصلت لہ مشارکۃ فیہا"[6] مولانا عبدالحلیم چشتی لکھتے ہیں "۱۸۸۸ء میں جب کاروانِ عمر بیسویں منزل طے کر رہا تھا آپ نے انگریزی کی طرف توجہ کی اور کم و بیش چھ مہینے میں اتنی استعداد پیدا کرلی کہ اپنا مافی الضمیر

---

[1] اخبار اہلحدیث امرتسر ۲۲ اکتوبر ۱۹۱۹ء، فضل حسین مظفرپوری الحیاۃ بعد المماۃ صفحہ ۳۴۲ [2] حالی حیات جاوید صفحہ ۲۲۰ [3] شمس الحق ڈیانوی عون المعبود ۴ / ۲۰۰ طبع بیروت [4] محمد حسین بٹالوی اشاعۃ السنۃ [5] سید سلیمان ندوی حیات شبلی صفحہ ۳۰۲ [6] ابوالقاسم سیف بنارسی: تذکرۃ السعید ۲۵-۲۳ اخبار ص ۱۹۱۰ء [7] نزہۃ الخواطر ۸ / ۵۱۵

انگریزی میں بخوبی ادا کر لیتے تھے اور بعد میں موصوف نے انگریزی میں اچھی استعداد پیدا کر لی تھی جیسا کہ لکھتے ہیں "زبانہائے عربی فارسی اور انگریزی بقدر کتابت حاصل کیں" [۱]

(۱۳) بشیر الدین قنوجی (م ۱۲۹۶ھ) شاید یہ چیز ان بہنوں کیلئے موجب حیرت ہو کہ "امداد الآفاق برجم اہل النفاق فی ما فی تہذیب الاخلاق" نامی کتاب مولانا امداد العلی اکبر آبادی کی تالیف نہیں ہے بلکہ اس کے مولف یہی مولانا قنوجی ہیں مولانا شمس الحق ڈیانوی لکھتے ہیں: فقام علی ردہ مقالتہ شیخنا العلامۃ القاضی بشیر الدین القنوجی فصنف کتابا سماھا بامداد الآفاق برجم اھل النفاق ورد تھذیب الاخلاق "یعنی سرسید کے رد کیلئے میرے استاذ قاضی بشیر الدین قنوجی تیار ہوئے اور ایک کتاب امداد الآفاق کے نام سے تصنیف کی پھر ملا ڈیانوی کے صاحبزادے حاشیہ پر لکھتے ہیں" وھو کتاب صنفہ العلامۃ القاضی رحمۃ اللہ ونسب الی الرئیس امداد العلی الاکبر آبادی ولذا اشتھر باسمہ [۲] ڈپٹی صاحب کی تحریروں کے متعلق سرسید نے بھی شک وشبہ کا اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں: ان کے مضامین جناب حاجی مولوی سید امداد العلی صاحب بہادر کے طبع زاد معلوم ہوتے ہیں مگر بعض لوگ ان مضامین کو بے پالک بناتے ہیں۔ [۳]

سرسید کے رد میں آپ کے متعدد رسائل موجود ہیں حتیٰ کہ مولانا ڈیانوی لکھتے ہیں وجری بین شیخی ورئیس تلک الطائفۃ تحریرات شتیٰ الی عدۃ سنین بطول ذکرھا [۴] مگر انگریزی تعلیم کے سلسلے میں ان کی بھی رائے وہی ہے جو دوسرے علمائے عصر کی تھی لکھتے ہیں کسی متعصب سے متعصب وہابی یا بدعتی کو ہم نے نہیں دیکھا کہ کسی قوم کی زبان انگریزی ہو یا سنسکرت سیکھنے کو عموماً حرام کہتا ہو غیر مذہب والوں کے مذہبی علوم کو بہ نسبت کسی شخص خاص کے یا ان تاریخوں کے پڑھنے کو جن میں بزرگوں کو برا کہا ہو گو وہ انگریزی زبان میں ہوں حرام بنایا ہو تو وہ دوسری بات ہے [۵]

---

[۱] عبد الحلیم چشتی، حیات وحید الزماں [۲] شمس الحق ڈیانوی، عون المعبود، ۴/ ۲۰۶

[۳] امداد صابری، تاریخ صحافت اردو ۲/ صفحہ ۴۸۳، بحوالہ تہذیب الاخلاق (محرم ۱۲۹۱ھ)

[۴] شمس الحق ڈیانوی، عون المعبود، ۴/ ۲۰۱ [۵] امداد الآفاق صفحہ ۵۹

(۴۱) حافظ عبد اللہ غازیپوری (م ۱۳۳۷ھ) حافظ صاحب موصوف کی متعدد تحریریں ان افکار و عقائد کے رد میں موجود ہیں سر سید جن کے داعی تھے لیکن انگریزی تعلیم کو آپ نہ صرف جائز قرار دیتے تھے بلکہ اس کی حمایت بھی کرتے تھے آپ نے اپنی لڑکی کو انگریزی کی عمدہ تعلیم دلائی تھی [۱] اپنے فتاویٰ میں ایک جگہ لکھتے ہیں "کوئی زبان فی نفسہٖ مذموم نہیں ہے ہاں ناجائز بات بولنا کسی زبان میں ہو البتہ مذموم ہے۔ زبان کا اختلاف اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ (سورہ روم رکوع ۳) یعنی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے، آسمان و زمین کا بنانا اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا، اور اللہ تعالیٰ نے ہر ایک امت میں یقیناً رسول بھیجا ہے اور جب کبھی کسی قوم کی طرف کوئی رسول بھیجا ہے تو اسی قوم کی زبان میں بھیجا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا (سورہ نحل رکوع ۵) یعنی بے شبہ اور بالیقین ہم نے ہر ایک امت میں کوئی رسول بھیجا ہے اور فرماتا ہے وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ (سورہ ابراہیم رکوع ۱) یعنی ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی قوم کی زبان میں ان آیات سے بخوبی ثابت ہے کہ انگریزوں کی طرف بھی بالیقین رسول بھیجا گیا ہے، اور جو رسول بھیجا گیا ہے انہی کی زبان میں بھیجا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ کوئی زبان انگریزی ہو یا اور، فی نفسہٖ مذموم نہیں۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ فی نفسہٖ کسی زبان کا سیکھنا یا سکھانا ممنوع نہیں ہے بلکہ اگر کسی زبان کے سیکھنے یا سکھانے سے کوئی نیک غرض متعلق ہو تو اس کا سیکھنا یا سکھانا موجب اجر و ثواب ہے" [۲]

(۵) مولانا امداد العلی اکبر آبادی سر سید سے مولانا موصوف کی مخالفت و مخاصمت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ مولانا حالی ان کے اور مولانا علی بخش کے بارے میں لکھتے ہیں: "ہندوستان میں جس قدر مخالفتیں اطراف و جوانب سے ہوئیں ان کا منبع انہیں دونوں صاحبوں کی تحریریں ہیں" علامہ حالی نے ان کو مدرسۃ العلوم کا سب سے پہلا مخالف بتایا ہے [۳] اور مخالفت کی بنیاد ذاتیات

[۱] عبد اللہ شائق مئوی: ضمیمہ فیصل احمدی، شائع کردہ ندوہ المعارف بنارس، [۲] عبد اللہ غازیپوری مجموعہ فتاویٰ، صفحہ ۱۷۶، قلمی محزونہ مرکزی دار العلوم بنارس [۳] حیات جاوید ۲/ صفحہ ۲۳۶

قرار دی ہے [1]

لیکن ہم شروع میں مدرسۃ العلوم کے ساتھ ان کی ہمدردی اور نرم رویہ کا تذکرہ کر آئے ہیں اور اس کا تذکرہ بھی ہو چکا ہے کہ آپ نے سرسید کے عقائد سے اختلاف کی وجہ سے مدرسہ میں شرکت سے انکار کیا تھا

رہا انگریزی تعلیم کی حرمت یا عدم جواز کا خیال۔ تو یہ بات بالکل غلط ہے مولانا بشیر الدین کا رسالہ امداد الآفاق آپ ہی کی طرف سے لکھا گیا ہے اور آپ اس کے مندرجات سے اس حد تک متفق تھے کہ اسے اپنے نام سے شائع کرایا اس کا ایک اقتباس قاضی صاحب کے تذکرہ میں درج کر چکا ہوں جس سے مولانا کا موقف سمجھنے میں کافی مدد ملے گی۔ رہی مدرسۃ العلوم کی مخالفت تو اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ

"چھوٹے چھوٹے اسکول مانند اسکول مراد آباد اور فرخ آباد اور علی گڑھ میں جس قدر علوم مذہبی وغیر مذہبی حاصل ہونے کی امید ہے اس قدر بھی اس مدرسے میں توقع نہیں (امداد الآفاق)

مزید لکھتے ہیں، علوم انگریزی کی تعلیم ہونا کسی ہندوستانی کے مدرسے میں گورنمنٹ کالجوں سے بہتر نہیں خیال کرتے" مولانا امداد العلی اکبرآبادی کے اس خیال کو ہم بے بنیاد بھی نہیں کہہ سکتے مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے بھی ایک بار ایسا ہی خیال ظاہر کیا تھا اور کہا تھا کہ "بسبب کثرت مدارس سرکاری رعایا کو مدارس علوم جدیدہ کا بنانا تحصیل حاصل نظر آیا"[2]

(۱۶) مولانا حمید اللہ صاحب سرادی میرٹھی [م ۱۳۰۳ھ] مولف خطبات التوحید۔ مولانا موصوف کے بعض سوانح نگاروں نے تصریح کی ہے کہ آپ نے انگریزی تعلیم حاصل کی تھی[3] اور اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم دلائی تھی[4] (۱۷) مولانا ذو الفقار علی [م ۱۳۲۲ھ] آپ شیخ مولانا محمود الحسن دیوبندی کے والد ماجد ہیں) دار العلوم دیوبند کے بانیوں میں آپ کا بھی شمار ہوتا ہے لیکن ان کے بارے میں گارساں دتاسی کا بیان ہے کہ ڈاکٹر بٹلر کا کہنا ہے کہ فارسی کے علاوہ علوم مغربی سے بھی واقف

---

[1] حیات جاوید ۲/۶۷ [2] ایضاً [2] سوانح قاسمی ۳ صفحہ ۲۷۹ [3] اخبار اہل حدیث امرتسر ۲ جنوری ۱۹۱۶ء
[4] الوحی، امام خان نوشہروی: تراجم علمائے حدیث / ۲۱۹ (دہلی ۱۹۳۸ء)

تھے ان کے کلام سے قطع نظر یہ ہے کہ انھوں نے اردو میں تسہیل الحساب کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو بریلی سے ۱۸۵۰ء میں چھپی ہے اس کو Jates Pestolozzian Arithmetic by H-S Reid کی مدد سے تیار کیا گیا ہے [۱] گویا مولانا ذوالفقار علی صاحب نے بھی انگریزی زبان کم از کم اتنی سیکھ لی تھی کہ جس سے استفادہ کر سکیں۔

(۱۸) مولانا فاروق چریا کوٹی (م ۲۷-۹-۱۹۰۹ء / ۱۳۲۷ھ) مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ندوہ میں انگریزی تعلیم کے سخت مخالف تھے [۲] سید صاحب نے ایک اور موقع پر یہ تاثر دیا ہے کہ جو لوگ ندوہ میں انگریزی تعلیم کی مخالفت کر رہے تھے ان کے نزدیک اس کی تعلیم ناجائز تھی [۳]

لیکن یہ بات قابلِ قبول نہیں خصوصاً مولانا فاروق چریا کوٹی کے بارے میں تو یہ کسی طرح باور نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ آپ نے علوم دین کی تکمیل کے بعد انگریزی تعلیم حاصل کی تھی، ڈاکٹر معتصم عباسی نے اس کو بتصریح ذکر کیا ہے [۴] اس کے علاوہ آپ نے اپنے بیٹوں کو بھی انگریزی کی اعلیٰ تعلیم دلائی تھی۔ مولوی امین عباسی ان کے فرزند انگریزی کے اچھے عالم تھے اسی طرح محمد امین کیفی نے بھی متعدد زبانوں میں مہارت حاصل کی تھی۔ اس لئے یہ ممکن نہیں کہ مولانا انگریزی تعلیم کو حرام سمجھتے رہے ہوں۔

ممکن ہے حالات کی ناسازگاری کے باعث مولانا نے وقتی طور پر کوئی مخالفت کی ہو لیکن اس کا مقصد اس عوامی مخالفت کو فرو کرنا رہا ہو گا جو ندوہ میں انگریزی تعلیم کے انتظام کی وجہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی، یہ مخالفت کتنی شدید تھی کہ اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجئے کہ ایک صاحب ندوہ پر اپنی کچھ جائداد وقف کرنا چاہتے تھے مگر انھوں نے کہا کہ یہاں اگر نصاب میں انگریزی شامل کی گئی تو میں اپنا وقف واپس لے لوں گا [۵] ظاہر ہے ایسی شدید عوامی خواہش کا احترام نہ کرنا بھی دانشمندی نہیں جب کہ ادارہ کا بقا عوام ہی کے تعاون پر منحصر ہو۔

---

[۱] ایوب قادری - ۲۷/ - [۲-۳] حیات شبلی صفحہ ۱۱/۳، ۴۲۱/۳ [۴] ڈاکٹر معتصم عباسی: اسلام اور عصر جدید شمارہ ۱-۳، ۵ [۵] محمد حسنی سیرت محمد علی مونگیری - (لکھنؤ ۱۹۱۹ء)

پہلی فہرست کی طرح یہ فہرست بھی مکمل نہیں متعدد علمائے کرام کے بارے میں وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے یا تو خود انگریزی سیکھی یا اپنے بچوں کو سکھائی ہے ان میں مولانا شہید الدین بنارسی مع لانا جلال الدین [م ۱۲۹۷ھ] بنارسی مولانا بشیر احمد سہسوانی [م ۱۳۲۶ھ] مفتی غلام سرور [م] مولانا محمد علی مونگیری [م] جیسے افراد خصوصیت سے قابل ذکر ہیں مگر ہم نے دانستہ ان بزرگوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔

یہ تو ان علماء کا تذکرہ ہے سرسید سے جن کا اختلاف بالکل واضح ہے لیکن ایسے علماء جنہوں نے سرسید کا کھل کر تعاون کیا۔ لیکن ان کے مخصوص عقائد و نظریات سے کبھی اتفاق نہ کیا ان کی تعداد تو بیشمار ہے ان میں مولانا شبلی نعمانی [م ۱۹۱۴ء] مولانا اسمٰعیل علیگڑھی [م ۱۳۱۱ھ] ایڈیٹر انسٹیٹیوٹ علی گڑھ مولوی فیض الحسن صاحب سہارنپوری [م ۱۲۹۴ھ] نواب علی حسن بن نواب صدیق حسن خاں بھوپالی [م ۱۳۵۶ھ] خصوصیت سے قابل ذکر ہیں

سرسید سے پہلے ایسے علماء تو شاید تلاش کرنے سے مل بھی جائیں جن کا خیال رہا ہو کہ تعلیم دنیاوی منافع کے لئے حرام ہے اور انگریزی تعلیم کا مقصد دنیا حاصل کرنا ہے اس لئے حرام ہے۔ [1] مگر سرسید کے زمانے میں ایسے علماء تو تلاش کرنے پر بھی نہیں ملتے جنھوں نے انگریزی تعلیم کو حرام بتلایا ہو جہر بھی معلوم نہیں کیوں مسلسل علماء کو کوسا جاتا ہے کہ یہ لوگ انگریزی تعلیم کو حرام کہتے تھے [2] علماء سے بدگمانی ذہنیت آج اسے باآسانی باور بھی کرلیتی ہے۔ شیخ اکرام صاحب آئی سی ایس نے بڑا صحیح تجزیہ کیا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ علماء کو ہر اچھی چیز کا مخالف سمجھنے کا فیشن اس قدر عام ہے کہ بڑے بڑے لوگ بھی اس سے نہیں بچ سکتے اور ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے واقعات کو نہیں پرکھتے اس کے علاوہ قوم کو ہر حالت میں ظالم بنایا جاتا ہے اور ہیرو کو مظلوم یہ خیال بھی واقعات سے خالی ہے [3]

مولانا حالی کا ایک بیان پڑھیئے "جو شخص مسلمان مولوی ہو کر اپنی قوم کا بدخواہ نہ ہو اس کی زیارت کرنی چاہیئے کیونکہ دنیا میں کوئی چیز اس سے زیادہ عجیب نہیں ہے" [4] کیا شیخ اکرام صاحب کے بیان کی صداقت میں اب بھی کوئی شبہ باقی رہ جاتا ہے۔ (حاشیہ ص ۲۸۴ پر ملاحظہ فرمایئے)

ایک گذارش سرسید یقیناً مسلمانوں کے ایک عظیم محسن تھے ان کے حامیوں کو یہ چیز مدنظر رکھنی چاہیئے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے سرسید کے لئے یہ کوئی فخر کی بات نہیں کہ علماء کی کسی حرام کردہ چیز کو حلال کر دیں اور پورے اسلامی معاشرے میں اسے عام کر دیں بلکہ ان کی اصل عظمت اس میں ہے کہ انھوں نے ایک جائز اور حلال کو فروغ دیا جو مسلمانوں کے حق میں سود مند تھی مگر مسلمان مختلف عوامل کی بنا پر اس سے غافل تھے

سرسید کے اس کارنامے کے اعتراف کا عمل علماء کو سب و شتم سے نوازے بغیر بھی مکمل ہو سکتا ہے لہذا اس منفی ذہنیت کو اب ترک کر دینا چاہیئے کہ "علماء کو مطعون کئے بغیر سرسید کے کارنامے کو اجاگر نہیں کیا جا سکتا"

اسی طرح یہ ذہنیت بھی بڑی تکلیف دہ ہے کہ مولانا شبلی اور محمد علی مونگیری وغیرہ کی شخصیت کو اس وقت تک اجاگر نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ "دیوبند اور ارباب دیوبند کو جدیدیت سے ناآشنا "منطق و فلسفہ کی لاش سے چمٹا ہوا" نہ قرار دیا جائے، افسوس کہ اس طرح کا طرزِ عمل ایسے بہت سے بلند پایہ افراد اپنائے ہوئے ہیں کہ ان کا نام بھی لینا بے ادبی میں شمار ہوگا۔ فالی اللہ المشتکی،

پچھلے صفحہ کے حاشیہ کا بقایا۔ سے قاضی صبغت اللہ بدر اسی دام) مولوی جمال الدین مولوی محمد یوسف مولوی شہاب الدین وغیرہ نے یہی خیال ظاہر کیا تھا مولوی یوسف کرکنوی نے اس کی تفصیلات کچھ اس طرح بیان کی ہیں کہ بال فور نے جب مسلمانوں کو صرف انگریزی پڑھنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ عربی تعلیم میں ان کی غربت و افلاس کا سبب ہے تو قاضی صاحب نے اس پر سخت رد عمل کا اظہار کیا انھوں نے کہا کہ ہمارے مذہب کا مدعا اللہ تعالیٰ کے واسطے علم حاصل کرنا ہے دنیا کے کار خدمت حاصل کرنے کے واسطے علم پڑھنا ہمارے مذہب کی رو سے صحیح نہیں بلکہ حرام ہے۔ خانوادۂ قاضی بدر الدولہ۔ (ص ۱۲۱) قاضی صاحب نے یہ رائے جس پس منظر میں دی تھی اس کا اندازہ کرکنوی صاحب کے اس بیان سے ہوتی ہے لکھتے ہیں (انگریزی تعلیم کا انتظام اور دینی تعلیم کو بند کرنے) سے ان لوگوں کی اصل غرض و غایت یہی تھی کہ مسلمان طلباء قرآن وحدیث کی تعلیمات سے غافل ہو کر جہاد کی اسپرٹ سے عاری ہو جائیں مگر انگریز اس مقصد میں کامیاب

اسلام اور سامانِ تعیّش

از: سید جلال الدین عمری

(۵)

اسلام نے سونے، چاندی اور ریشم کے استعمال پر بعض پابندیاں عائد کی ہیں۔ یہ پابندیاں اس نے دوسری دھاتوں اور دوسرے کپڑوں کے استعمال پر نہیں لگائی ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ سونے اور چاندی کے برتن استعمال کرنے سے تو اس نے منع کیا ہے لیکن کسی دوسری دھات کے برتن استعمال کرنے سے اس نے منع نہیں کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سادگی کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ سامان تعیش کے لئے اس میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ آپ نے مٹی، لکڑی اور چمڑے کے برتن بھی استعمال فرمائے ہیں اس کے ساتھ آپ سے تانبہ، پیتل اور شیشہ کے برتنوں کا استعمال بھی ثابت ہے۔

ام المومنین حضرت زینب بنت جحش کے پاس تانبہ کا ایک تسلا تھا اس سے وہ سر مبارک دھلایا کرتی تھیں۔ ایک اور روایت ہے۔ حضرت زینب رض فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تانبہ کے تسلے سے وضو فرمایا کرتے تھے[۱] یہ تسلا بعد میں حضرت زینب رض کے خاندان میں موجود تھا[۲]

حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور میں تانبے کے ایک تسلے سے غسل کیا کرتے تھے[۳]

حضرت عبداللہ بن زید رض کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف لائے تو ہم نے تانبہ کے برتن میں پانی پیش کیا۔ آپ نے اس سے وضو فرمایا۔[۴]

---

[۱] مسند احمد ۶/۳۲۴ [۲] مصنف عبدالرزاق ۱/۶۰

[۳] ابو داؤد کتاب الطہارۃ، باب الوضوء فی آنیۃ الصفر [۵] بخاری کتاب الوضوء، باب الغسل والوضوء فی المخضب، [۴] ابو داؤد کتاب الطہارہ باب الوضوء فی آنیۃ الصفر

حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شیشہ کا پیالہ تھا، اسے آپ پینے کے لئے استعمال فرماتے تھے۔[1]

تانبہ پیتل اور شیشہ وغیرہ تو نسبتاً سستی چیزیں ہیں بعض دھاتیں سونے اور خاص کر چاندی سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔ اسلام نے ان کے استعمال کو بھی حرام نہیں قرار دیا۔ فقہ حنفی میں ہے

ولا باس باستعمال آنیة الرصاص والزجاج والبلور والعقیق[2] شیشہ، کانچ، بلور اور عقیق کے بنے ہوئے برتن استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے

ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں "سونے اور چاندی کے علاوہ دوسری دھاتوں سے بنے ہوئے برتنوں کا رکھنا اور ان کا استعمال کرنا مباح ہے" چاہے وہ بیش قیمت ہوں جیسے یاقوت، عقیق، بلور، تانبہ اور صاف کئے ہوئے شیشہ کے برتن۔ یا کم قیمت ہوں۔ جیسے لکڑی، مٹی اور چمڑے کے برتن۔ دونوں طرح کے برتنوں کا استعمال عام اہل علم کے نزدیک جائز ہے امام شافعیؒ سے اس مسئلہ میں دو قول منقول ہیں ایک یہ کہ بیش قیمت برتنوں کا استعمال حرام ہے، اس لئے کہ سونے اور چاندی کے برتنوں کو حرام قرار دینا اس بات کی دلیل ہے کہ جو چیزیں ان سے بھی زیادہ قیمتی ہوں ان کا استعمال بھی حرام ہے۔ علاوہ ازیں بیش قیمت برتنوں کے استعمال میں دولت کا اسراف ہے اور اس سے تکبر کا اظہار ہوتا ہے۔ اس سے غریبوں اور ناداروں کی دل شکنی بھی ہوتی ہے۔ اس لئے سونے اور چاندی کے برتنوں ہی کا حکم ان کا بھی ہوگا۔[3]

دوسرا قول یہ ہے کہ سونے چاندی کے ظروف کے علاوہ دوسرے قیمتی ظروف کا استعمال ناجائز نہیں ہے امام نووی فرماتے ہیں کہ یہی شافعی کا راجح قول ہے

---

[1] ابن ماجہ ابواب الاشربہ [2] ہدایہ ۴/۴۵۱ [3] ابن قدامہ: المغنی ۱/۶۵

چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

واما اناء الزجاج النفیس فلا یحرم بالاجماع واما اناء الیاقوت والزمرد والفیروزج ونحوھا فالاصح عند اصحابنا جواز استعمالھا وبعض منھم من حرمھا ؎

اس بات پر تو اجماع ہے کہ نفیس شیشہ کے بنے ہوئے برتنوں کا استعمال حرام نہیں ہے باقی رہے یاقوت، زمرد اور فیروزہ (ایک قیمتی سبز پتھر) وغیرہ کے برتن تو ہمارے اصحاب (شوافع) کے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ اس کا استعمال جائز ہے ان میں سے بعض نے اسے حرام بھی کہا ہے

حافظ ابن حجرؒ علامہ قرطبی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ عمدہ قسم کے جواہر سے بنے ہوئے برتنوں کا استعمال جائز ہے حالانکہ ان میں سے بیشتر سونے اور چاندی سے زیادہ نفیس اور زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔ ان کے جواز سے شاید ہی کسی نے اختلاف کیا ہے۔ ابن صباغ اور ان کے اتباع میں رافعی اور بعد کے لوگوں نے تو اس کے جواز پر اجماع نقل کیا ہے۔ بعض لوگوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ انھوں نے اس سلسلہ میں جواز اور عدم جواز دونوں ہی رائیں نقل کی ہیں۔ ؎

اس کا مطلب یہ ہے کہ شاذ و نادر رائیں تو اس طرح کی موجود ہیں کہ قیمتی برتنوں کا استعمال ناجائز ہے ورنہ اس کے جواز پر امت کا قریب قریب اجماع ہے۔

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ اسلام نے سونے، چاندی، ریشم اور دوسری چیزوں کے درمیان فرق کیوں کیا ہے؟ ان تین چیزوں کے استعمال پر اس نے جس طرح کی پابندیاں لگائی ہیں اس طرح کی پابندیاں اس نے ان سے زیادہ قیمتی چیزوں کے استعمال پر کیوں نہیں عائد کی ہیں۔

؎ شرح مسلم ۱۴/۳۰ ؎ فتح الباری ۱۰/۸۵

اس کے مختلف اسباب بیان کئے جا سکتے ہیں۔ جہاں تک سونے اور چاندی کے استعمال پر پابندی کا تعلق ہے۔ بظاہر اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہر زمانہ میں ان کو زر کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اسی لئے ان کو نقدین کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ہی میں زر بننے کی صلاحیت بھی ہے اس لئے کہ کسی چیز کے زر بننے کے لئے بعض خصوصیات کا اس کے اندر پایا جانا ضروری ہے۔ مثلاً

۱۔ وہ بے قیمت یا ارزاں نہ ہو بلکہ گراں بہا اور بیش قیمت ہو۔ ۲۔ نادر الوجود یا بہت ہی کم یاب نہ ہو بلکہ اچھی خاصی مقدار میں وہ پائی جائے۔ ۳۔ اس کا حاصل ہونا محال یا سخت دشوار نہ ہو بلکہ ممکن الحصول ہو۔ ۴۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس میں کمی نہ آئے تاکہ بطور زر اسے محفوظ کیا جا سکے ۵۔ اس کے کل کی طرح اس کا ہر جزء قیمت کا حامل ہو۔ ٹکڑے ہونے اور اجزاء میں تقسیم ہونے کی وجہ سے وہ بے قیمت نہ ہو جائے۔ ۶۔ اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ آسانی سے منتقل کیا جا سکے۔ وغیرہ۔

ان میں سے بعض خصوصیات تو مختلف دھاتوں میں موجود ہیں لیکن یہ ساری خصوصیات سونے اور چاندی کے علاوہ دنیا کی کسی بھی دھات میں نہیں پائی جاتیں۔ بعض دھاتیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ اور آسانی سے دستیاب ہیں لیکن کم قیمت اور ارزاں ہیں۔ ان کے کم قیمت ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ سہل الحصول ہیں۔ ان کو دولت کا ذریعہ بنانے کے لئے بہت بڑی مقداریں انہیں رکھنا پڑتا ہے۔ یہی چیز ان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں دشواری کا باعث ہے۔ اس کے برخلاف بعض دھاتیں اور بعض پتھر سونے اور چاندی سے زیادہ قیمتی ہیں لیکن وہ بہت ہی کم یاب اور نادر الوجود ہیں۔ ان کو اگر کوئی شخص حاصل کرنا بھی چاہے تو آسانی سے حاصل نہیں کر سکتا۔ پھر بیشتر دھاتیں وہ ہیں جنہیں عرصہ دراز تک محفوظ رکھنا آسان نہیں ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ تحلیل ہوتی رہتی ہیں۔ اسی طرح

بیش قیمت لعل وجواہر کو اگر توڑ دیا جائے تو وہ بے کار ہیں۔ ان کی ساری قدر و قیمت ان کے حسن اور تناسب ہی میں پوشیدہ ہے۔ یہی اگر بگڑ جائے تو ان کی قیمت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

اب سونے اور چاندی کو دیکھئے۔ قدرت نے کوئلہ، لوہے اور تانبہ اور پیتل کی طرح ان کے بہت بڑے ذخیرے تو اس زمین میں نہیں رکھے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ نایاب کے حکم میں بھی نہیں ہیں۔ وہ بیش قیمت بھی ہیں اور ان کا حاصل کرنا بھی ممکن ہے۔ یہ ایسی دولت ہے کہ اسے آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اگر اسی قیمت کا لوہا یا تانبہ آدمی منتقل کرنا چاہے تو اسے بہت زیادہ زحمت پیش آئے گی۔ ان کا ہر ذرہ قدر و قیمت رکھتا ہے اس لئے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے بھی حسب ضرورت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ان کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کا ذخیرہ کیا جا سکتا ہے۔ وقت گزرنے سے ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ان ہی وجوہ سے ان کو زر کی پوزیشن متمدن دنیا میں ہمیشہ حاصل رہی ہے۔

سونے اور چاندی کے استعمال پر پابندی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر ان کے استعمال کی کھلی اجازت دے دی جائے تو سرمایہ داروں کے پاس مختلف شکلوں میں ان کا ذخیرہ ہونے لگے گا۔ اسلام چاہتا ہے کہ افراد کے پاس سونا اور چاندی جمع نہ ہوں بلکہ مسلسل گردش میں رہیں کیونکہ ان کا اکتناز معیشت پر برا اثر ڈالتا ہے۔ اسلام دولت کی گردش کا قائل ہے۔ اس نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ سونا اور چاندی افراد کے قبضہ میں کم سے کم رہیں اور وہ ان کی ذخیرہ اندوزی نہ کر سکیں۔

ان کے استعمال پر پابندی کی تیسری وجہ یہ ہے کہ سوسائٹی کے اندر تعیشات میں مسابقت اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جذبہ نہ پیدا ہو۔ اس لئے کہ بعض اہم اخلاقی قدروں کو نقصان پہونچائے بغیر آدمی اس میدان میں دوڑ نہیں

رکھا سکتا ۔ اس مقصد کے لئے سونے اور چاندی کے استعمال پر پابندی بہت ضروری تھی ۔ کیونکہ تعیشات میں مسابقت کا یہی بہت بڑا ذریعہ ہیں اس میں شک نہیں کہ ہیرے جواہرات اور بیش قیمت دھاتیں بھی اس دنیا میں موجود ہیں لیکن ایک تو ہر شخص ان کی قدر و قیمت سے واقف نہیں ہو سکتا ، دوسرے یہ کہ ان کے کم یاب اور نادر الوجود ہونے کی وجہ سے ان میں مسابقت بھی نہیں ہو سکتی

چوتھی وجہ یہ ہے کہ اسلام دولت کی نمائش کو سخت ناپسند کرتا ہے ۔ اس کے لئے اس نے جہاں اور طریقے اختیار کئے ہیں وہیں سونے اور چاندی کے استعمال کو بھی محدود سے محدود تر کیا ہے ۔ سامان تعیش سے اگر فخر و غرور پیدا ہو جائے اور آدمی دوسرے کو کم تر اور حقیر سمجھنے لگے تو اس کا جواز باقی نہیں رہتا

حقیقت یہ ہے کہ سونے اور چاندی کی نوعیت دوسری دھاتوں سے مختلف ہے ۔ ان کو جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی بھی دوسری دھات کو نہیں ہے کرنسی نوٹ اور چیک کے اجرا سے ان کی اہمیت کس قدر کم محسوس ہوتی ہے ۔ لیکن ان کی بھی بنیاد چاندی نہ سہی سونا بہر حال ہے ۔ نہ معلوم کب تک اس کی یہ اہمیت باقی رہے گی ۔۔

سونے ، چاندی اور ریشم کے بارے میں اسلام نے جو خاص رویہ اختیار کیا ہے اس پر ایک اور پہلو سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے ۔ وہ یہ کہ تعیشات کا اظہار کھانے پینے ، لباس ، پوشاک ، مکان ، زیور ، ظروف ، فرنیچر ، سواری ، آلات حرب و طرب ، کھیل کود اور تفریح کے سامان غرض مختلف چیزوں سے ہوتا ہے ۔ ان کی نہ تو کوئی ایک خاص شکل ہے اور نہ ان کی متعین فہرست ۔ زمانہ اور ماحول کے ساتھ ان میں تبدیلی آتی رہتی ہے ۔ ایک وقت میں جن چیزوں کو تعیشات میں سمجھا جاتا ہے دوسرے وقت میں ان کا شمار ناگزیر

ضروریات میں ہونے لگتا ہے۔ ایک ماحول میں جو چیزیں عیش و عشرت کی علامت ہوتی ہیں ماحول بدلنے کے بعد ان کی وہ حیثیت باقی نہیں رہتی اور وہ معمولات میں سمجھی جانے لگتی ہیں چنانچہ آج سے پہلے جو چیزیں عیش و عشرت اور فخر و مباہات کی نشانی سمجھی جاتی تھیں اب ان میں سے بہت سی چیزوں کا استعمال نہیں رہا اور ان کی جگہ دوسری چیزوں نے لے لی۔ اس لئے اسلام نے تعیشات کی فہرست پیش کرکے ان کے بارے میں متعین احکام نہیں دئے بلکہ سونے، چاندی اور ریشم کے محدود استعمال بتاکر اسباب تعیش کے بارے میں اپنا رجحان واضح کردیا۔ اس نے تعیشات پر قانونی پابندی عائد نہیں کی لیکن سونے، چاندی اور ریشم کے استعمال پر بعض قانونی بندشیں لگاکر یہ ظاہر کردیا کہ تعیشات کی ایک حد کے اندر تو اجازت ہے لیکن اس حد سے آگے بڑھنا اس کے نزدیک کم از کم ناپسندیدہ ضرور ہے۔ اس پہلو سے تعیشات کے سلسلہ میں سونے، چاندی اور ریشم کی حیثیت علامت (SYMBLE) کی ہے۔ یہ دراصل اسلام کے مزاج اور فکر کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی یہ اہمیت ہمیشہ رہے گی۔ حالات کی تبدیلی سے اس میں کوئی فرق واقع نہ ہوگا۔ ○○○

(بقیہ صفحہ ۳۰۵)

حضرت شیخ نے سنہ ۵۴۰ھ میں ولادت پائی تھی اور شہادت ۶۱۸ھ میں پائی اس حساب سے عمر ۷۸ سال کی تھی۔ دن کی تعیین صرف دارا شکوہ نے کی ہے یعنی ۱۰ جمادی الاول ۶۱۸ھ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ حضرت شیخ کو باطنیوں نے شہید کیا ہے اس کی تائید کہیں سے نہیں ہوتی ہے۔ مولانا غلام سرور لاہوری نے حسب ذیل اشعار سے تاریخ وفات اخذ کی ہے ؎

شیخ کبریٰ جناب نجم الدین   پیر عالی مقام دل والا

گفت سرور پئے سال ترحیلش   نجم دین پیر زاہد کبریٰ

باقی آئندہ

حالات حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ

از

(مولوی سید محمد فاروق بخاری، لیکچرر شعبۂ عربی گورنمنٹ ڈگری کالج سوپور کشمیر)

ہندوستان میں جس طرح چشتیہ سلسلہ کے مشائخین کرام نے اسلام پھیلانے میں غیر معمولی رول ادا کیا ہے اسی طرح کبرویہ سلسلہ سے وابستہ چند نامور بزرگوں نے بھی تبلیغ اسلام جیسا فریضہ انجام دینے میں عظیم الشان خدمت انجام دی ہے۔ بلکہ بعض جگہوں پر کفر و ضلالت ختم کرنے اور اس کی جگہ دین حنیف کا بیج بونے میں فقط کبروی سہروردی مشائخ ہی نظر آتے ہیں۔ جہاں تک کشمیر لداخ اور کسی حد تک تبت کا تعلق ہے یہاں چشتیہ و قادریہ سلسلے سے متعلق بزرگوں کا سراغ برائے نام ملتا ہے اور یہ جگہیں مشائخ کبرویہ کی رہین منت ہیں۔ کشمیر میں حضرت امیر سید علی ہمدانی المتوفی ۱۳۸۶ء پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے تبلیغ الاسلام کی باضابطہ بنیاد ڈالی۔ انہوں نے اپنے ساتھ سینکڑوں ہم مشرب بزرگوں کو ایران وغیرہ سے لائے اور جگہ جگہ مساجد، مدارس اور خانقاہیں بنوانے کی کوشش کی۔ ان کی سعی نے نہ صرف کشمیر کی مذہبی زندگی میں انقلاب عظیم پیدا کیا بلکہ یہاں کی سینکڑوں سالوں کی راسخ تہذیب و ثقافت کا رُخ بدل دیا۔ ڈاکٹر احسان اللہ کا یہ قول بالکل درست ہے:-

"شاہ ہمدان و ہمراہان علاوہ بر آنکہ کشمیریاں را باسلام رہبری کردند، ہنر و فرہنگ و زبانِ شیرین و نظم نمکین فارسی را ہم باخود بارمغاں بردند و بمردم کشمیر تسپردند۔ ازیں روی است کہ اہالی خطہ کشمیر ہمہ مظاہر حیات و مبانی سعادت خود را از حضرتِ شاہ ہمداں و برکات فیوضاتِ وے می دانند" ؎۱

۱۳۷۹ھ

؎۱۔ اصولِ تصوف: خیابانِ لالہ زار، طہران ص ۲۹۵

یہاں فی الحال ہندوستان میں اس سلسلے کے منتسبین اور اُن کے خدمات پر روشنی ڈالنی مقصود نہیں ہے بلکہ خود اس سلسلہ کے سرچشمہ کے حالاتِ زندگی اور علمی کارناموں کا قدرے تذکرہ کرنا ہے۔ کیوں کہ اسلامی تصوّف کی تاریخ میں حضرت شیخ نجم الدین کُبری رح ایک بلند مرتبہ کے مالک ہیں اور صوفیائے کرام میں "چیزے دیگر" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ بیک وقت ایک ممتاز فاضل، ایک باکمال مناظر، چوٹی کے شاعر، سیّاح، مصنّف اور مجاہد فی سبیل اللہ تھے۔

باوجود اس مسلّمہ قاعدہ کے کہ معاصرت، منافرت کی جڑ ہوتی ہے، حضرت شیخ کُبریٰ کے سارے معاصرین جو خود آسمانِ علم و تقویٰ کے آفتاب و ماہتاب تھے، اُن کی جلالتِ قدر، اور عظمتِ شان کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں۔ ان میں شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی، امام فخر الدین رازی مولانا بہاؤ الدین ولد (والد ماجد مولانا رومی) خود مولانا رومی، شیخ فرید الدین عطار رحمہم اللہ قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر براؤن نے لکھا ہے کہ شیخ نجم الدین کُبریٰ کی جلالت و عظمت کا اندازہ لگانے کیلئے بس یہی ثبوت کافی ہے کہ جس دن تاتاریوں نے چھ لاکھ مسلمانوں کا خاتمہ کیا ان شہیدوں میں فقط ایک شیخ نجم الدین ہیں جن کا صاحبِ جمعیۃ التواریخ نے ذکر کیا ہے۔ [۱]

حضرت شیخ کا عہد

حضرت شیخ کا عہد بالخصوص وہ دَور جس میں انہوں نے ولادت پائی۔ اکثر اسلامی ممالک کے زوال و انحطاط کا آخری اور کچھ سلطنتوں کے عروج و اقبال کا ابتدائی دَور تھا۔ خلافتِ بغداد نے حضرتِ شیخ کے سالِ ولادت تک ۳۱ ۲ سال جیسی طویل مدت تنزل کی حالت میں گزاری تھی۔ سیاسی اور اخلاقی زوال کا یہ حال تھا کہ حضرتِ شیخ کے زمانے میں مستنجد باللہ (زمانۂ خلافت ۵۵۵ھ تا ۵۶۶ھ) کا گلا گھونٹ کر مار اگیا [۲] جب اس کا بیٹا مستضئی تختِ خلافت پر متمکن ہوا تو اس نے سب سے پہلے یہ کام کیا اپنے باپ کے لائق وزیر شرف الدین البلدی کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ مستضئی کے بعد بھی یہی سلسلہ جاری رہا جہاں تک برائے نام خلفا کے اختیارات کا تعلق ہے تو مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے لفظوں میں "خلیفہ مختلف سلطنتوں اور حکومتوں کے درمیان ایسا مُقید تھا جیسے ایک زبان دانتوں کے حلقہ میں محصور رہوتی"

---

[۱] A Literary History of Persia vol-2, P/26 [۲] الفخری ص ۱۳۶

ہے ۔[1]

اسپین اور شمالی افریقہ کے اسلامی ممالک بھی انتہائی ذلت اور پستی کی حالت میں تھے۔ حضرت شیخ ہی کے زمانے میں قسطنطنیہ کی جنگ مسلمانوں اور فرنگیوں کے درمیان چھڑ گئی۔ فرنگیوں کے عظیم الشان لشکر کے ہاتھوں مسلمانوں کو ایسی شکست کھانی پڑی جس میں پروفیسر ہٹی Hitti کے بقول (اگرچہ یہ مبالغہ سے خالی نہیں ہے) چھ لاکھ لوگوں پر مشتمل اسلامی لشکر میں سے صرف ایک ہزار افراد بچ گئے۔[2] اگرچہ مشہور اسلامی جرنیل زکریا بن ابی حفص کی بہادری کے بدولت الموحدون کو مزید گیارہ سال تک حکومت کرنے کا موقعہ ملا۔ مگر زوال انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ حضرت شیخ ہی کے زمانے میں غزنوی حکومت بھی فنا ہوتی ہے اور اس کی جگہ غوریوں کی سلطنت وجود میں آتی ہے مگر قدرت کی کاریگری دیکھئے سلطان محمد غوری بھی حضرت شیخ ہی کے دورانِ حیات میں (۶۰۲ھ) ایک اسماعیلی ملحد دمیک نامی کے ہاتھوں شہید ہوتے ہیں۔

ولادت اور وطن | یہ تھے وہ حالات جو حضرت شیخ کے زمانے میں اسلامی دنیا پر چھائے ہوئے تھے مگر اس سیاسی اور سماجی تنزل و تعطل کے باوجود علم و تقویٰ کا بازار بھی گرم تھا جس کا ذکر ہم حضرتِ شیخ کے معاصرین میں کریں گے۔

آپ کا اسمِ گرامی احمد، والدِ بزرگوار کا نام عمر، کنیت ابو الجناب، لقب کبریٰ اور دلی تراش تھا۔ آپ خوارزم کے ایک گاؤں خیوق میں تولد ہوئے۔ بعض فارسی تذکرہ نگاروں نے خیوف لکھا ہے مگر معجم البلدان سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ یاقوت نے لکھا ہے کہ "خیوق کو بعض لوگ (خ) کے زیر کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اہل خوارزم اسے خیوہ کہتے ہیں۔ یہاں ایک بڑا قلعہ بھی ہے۔ خوارزم کے لوگ اگرچہ حنفی ہیں مگر خیوق والے شافعی ہیں۔"[3] غرض اسی جگہ آپ نے ۵۴۰ھ میں ولادت پائی۔

کنیت اور القاب | بعض مشہور اہل علم اور صاحبحال بزرگوں کی طرح آپ کا نام لوگوں کے ذہنوں

---

[1] مسلمانوں کا عروج و زوال ص ۸۹
[2] History of the Arabs: p 549
[3] معجم البلدان، ج ۳ ص ۵۰۳ مطبعۃ السعادۃ مصر

سے محو ہوا اور سب آپ کو کنیت اور القاب ہی سے یاد کرنے لگے۔ آپ کی کنیت جیسے ابوالجناب اور القاب جیسے کبریٰ، ولی تراش، نجم الدین وغیرہ کے پیچھے جو وجوہات تذکروں میں ملتے ہیں ہم انھیں ذکر کرتے ہیں۔

ابوالجناب ابوالجناب کنیت رکھنے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک بار حضرتِ شیخ حصولِ علم کے خاطر ہمدان تشریف لے گئے۔ وہاں کہیں سے یہ معلوم ہوا کہ اسکندریہ میں ایک ممتاز محدث ہیں حضرت شیخ فوراً اسکندریہ گئے۔ وہاں محدثِ موصوف سے اجازت حاصل کی۔ واپس لوٹتے وقت ایک رات خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ خود فرماتے ہیں: میں نے عرض کیا کوئی کنیت عطا فرمائیے۔ آپؐ نے فرمایا: ابوالجناب۔ جب نیند سے بیدار ہوا تو اس کنیت کے معنیٰ و مقصد پر غور کیا۔ آخر میں یہ معنیٰ اخذ کر کے اطمینان ہوا: از دنیا اجتناب می باید کرد۔ یعنی دنیا سے علیحدگی اختیار کرنی چاہیئے۔

کُبریٰ حضرت شیخ کا دوسرا لقب یا خطاب کُبریٰ ہے اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ آپ نرے صوفی نہیں تھے بلکہ بلند پایہ محدث، متکلم اور مناظر بھی تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں آپ کو بحث مباحثہ میں حصہ لینے کا شوق تھا۔ جب کسی سے مباحثہ یا مناظرہ کرتے تو اس پر غالب آتے تھے۔ اس وجہ سے علماء نے آپ کو الطَّامَّۃُ الکُبریٰ (بڑی آفت) سے مخاطب کیا۔ یہ خطاب آپ کے نام پر اس طرح غالب آیا۔ کہ لوگ اصلی نام بھول گئے۔ کثرتِ استعمال سے طامۃ حذف ہوا۔ اور کُبریٰ رہ گیا[1] سلسلۂ کبرویہ بھی اسی وجہ سے کُبروی کہلایا جاتا ہے۔ مولانا جامیؒ لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کے نزدیک کُبریٰ میں "ب" ساکن نہیں ہے بلکہ اس پر زبر ہے یعنی نجم الکُبَریٰ کہ آپ بڑوں کے تارے ہیں۔ مگر وہ اس قول کو رد کر کے اوّل الذکر کُبریٰ ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

وھٰذا الوجہ صحیح نقلہ جماعۃ من	پہلی وجہ ہی صحیح ہے اسی کو حضرت شیخ کے اصحاب میں
اصحابہ ممن یوثق بھم[2]	سے ایک ایسی جماعت نقل کرتی آئی ہے جو قابلِ اعتبار ہے

[1] شذرات الذہب ج ۵ ص ۸۰ [2] نفحات الانس ص ۴۲۲ مطبع حیدری ۱۲۸۹ھ

آگے لکھتے ہیں :-

والصحیح الاول کذا فی تاریخ الامام الیافعی رحمۃ اللہ علیہ[۱]

صحیح وہی ہے جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا یعنی کبریٰ - ایسا ہی حضرت امام یافعی نے اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے -

ولی تراش مذکورۂ بالا لقب کے علاوہ آپ کا ایک اور لقب ولی تراش تھا - بیان کیا جاتا ہے کہ حالتِ وجد میں جس پر آپ کی نگاہ پڑتی تھی وہ ولی بن جاتا تھا - یہ نظر کیمیا اثر انسانوں تک ہی محدود نہ تھی بلکہ کتے اور چڑیا بھی اس خدنگ کے ہدف بن جاتے تھے - کہا جاتا ہے ایک تاجر سیر و تماشا کی غرض سے حضرتِ شیخ کی خانقاہ میں آیا حضرتِ شیخ کھڑے تھے - آپ کی نگاہ اس تاجر پر پڑی وہ اسی وقت مرتبۂ ولایت پر فائز ہوا - آپ نے پوچھا: کس جگہ کے ہو اور کہاں جانے کا ارادہ ہے - اس نے وطن کا نام بتلایا - آپ نے اجازت دے دی اور اپنے وطن میں ابلاغ و تبلیغ اور دعوت الی الحق کا کام شروع کرنے کی ہدایت کی - اسی طرح ایک باز نے ہوا میں چڑیا کو شکار کرنے کی غرض سے پیچھا کیا اچانک حضرتِ شیخ کی نگاہ اس پر پڑی وہ چڑیا پلٹ گئی اور باز پر غالب آگئی اور اس کو پکڑتے ہوئے شیخ کے سامنے زمین پر اُتار لائی - تذکروں میں ایک اور فوق العقل[؟] واقعہ مذکور ہے وہ یہ ہے کہ آپ ایک دن خانقاہ کے دروازے پر کھڑے تھے یہاں سے ایک کتا گزرا - آپ کی نظر اس پر پڑی کتے کی حالت فوراً بدل گئی - وہ بے خود ہوا شہر سے نکلا اور قبرستان کی طرف آیا - اپنا سر بار بار زمین پر دے مارا - جہاں کہیں جاتا شہر کے کتے جمع ہو جاتے تھے - یہی حالت اس کتے پر چند دنوں تک طاری رہی - اس کے بعد مر گیا" تعجب ہے کہا جاتا ہے کہ حضرت شیخ نے اس کتے کو دفن کرنے کا حکم دیا اور یہ بھی کہا کہ کتے کے مدفن پر عمارت کھڑی کی جائے - ہمارے تذکرہ نگار یہ بھی لکھتے ہیں کہ حضرت مولانا رومی کے حسب ذیل شعر میں اسی محیر العقول واقعہ کی طرف اشارہ ہے :-

یک نظر فرما کہ مستغنی شوم از ابنائے جنس
سگ چو شد منظور نجم الدین سگاں را سرور است

اگرچہ اولیاء اللہ کے کشف و کرامات سے انکار نہیں ہے پھر بھی واللہ اعلم مندرجہ بالا واقعات میں کتنی صحت ہے اور کتنی عقیدتمندی اس میں ملی ہوئی ہے - اتنا تو بہر حال یقینی ہے کہ حضرت شیخ

۱؎ نفحات الانس ۲۵۱ ۲؎ شذرات الذہب ج ۵ ص ۷۸

نجم الدین کبریٰ کی صحبت معجزانہ اثر رکھتی تھی۔ جس کا اندازہ اُن کے اور امام فخرالدین رازی کے مابین گفتگو سے ہوگا۔ جس کا ذکر آگے آئے گا۔

تحصیل علم اور سفر و سیاحت | یہ تو وضاحت سے معلوم نہیں ہوتا ہے کہ آپ نے کس وقت تعلیم شروع کی اور کس وقت کونسی کتابیں پڑھیں۔ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ صغر سنی ہی میں آپ علوم ظاہری کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ اس کے لئے دور و دراز ممالک کی سیاحت بھی اختیار کی ہے۔ ابوالفلاح عبدالحی بن العماد الحنبلی المتوفی ۱۰۸۹ھ لکھتے ہیں:۔

رحل الی قطار راکباً وماشیاً وادرک من المشائخ مالا یحصی کثرۃً۔[1]

سوار اور پیدل دونوں طرح سے اطراف و ممالک کی سیاحت کی اور بے شمار مشائخ سے ملے۔

حضرت محی السنہ کے کسی شاگرد کے پاس "شرح السنہ" پڑھی۔ ہمدان گئے جہاں حافظ ابوالعلیٰ سے فیض حاصل کیا پھر سکندریہ میں حافظ سلفی سے علم حدیث حاصل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ اپنے تمام ہم جماعتوں میں قرآن مجید کا فہم اور دیگر علوم دینیہ عربیہ میں عبور کامل حاصل تھا۔ صاحب شذرات الذہب لکھتے ہیں۔

تسبق اقرانہ فی صغرہ الی فہم المشکلات والغوامض۔[2]

چھوٹی عمر ہی میں اپنے ساتھیوں سے مشکلات و غوامض کے فہم میں سبقت حاصل کی۔

علوم ظاہری سے کنارہ کشی | حضرت شیخ کی طالب علمی کا زمانہ تھا ابھی تصوف کی راہ میں قدم نہیں رکھا تھا۔ تبریز میں شرح السنّۃ پڑھتے تھے۔ حضرت شیخ اس کو مکمل کرنے کے قریب تھے اچانک انہی آخری دنوں میں درسگاہ میں موجود تھے کہ ایک درویش اندر آئے۔ کسی نے کہا یہ بابا فرج تبریزی ہیں۔ بابا فرج مجذوب قسم کے بزرگ تھے۔ انہوں نے اس موقعہ پر اگرچہ حضرت شیخ کو کچھ نہ کہا مگر رات حضرت شیخ نے اضطراب کی حالت میں گزاری۔ دوسرے دن جب درسگاہ میں حاضر ہوئے تو بابا فرج سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ استاد نے نہ صرف رضامندی کا

---

[1] شذرات الذہب ج ۵ ص ۸۰ [2] ایضاً

اظہار کیا بلکہ خود بھی ساتھ ہو لئے۔ وہاں پہونچے تو اندر آنے کی اجازت دی۔ بابا فرخ کی حالت بدل گئی۔ انھوں نے کپڑے چاک کئے جب تھوڑی دیر بعد ہوش سنبھالا تو اپنے ملبوسات حضرت شیخ کو پہنائے اور کہا: ترا وقت دفتر خواندن نیست۔ یہ وقت اب تمہارے علم پڑھنے کا نہیں ہے اب تمہیں عالم کا سر دفتر ہونا ہے۔ مولانا غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں۔

بجرد پوشیدن جامہائے بابا فرخ شیخ نجم الدین را عرش تا فرش ہرچہ بود در نظر منکشف گشت باطن خود را از غیر حق خالی یافت [1]	بابا فرخ کا شیخ نجم الدین کو کپڑے پہنانا ہی تھا کہ وہ تمام چیزیں جو عرش سے لیکر فرش تک موجود ہیں حضرت شیخ پر منکشف ہوئیں۔ اور اپنے باطن کو غیر حق سے خالی پایا

جب باہر آئے تو استاد نے جو خود بھی بابا فرخ کی ملاقات کے لئے آئے تھے، حضرت شیخ سے کہا: شرح السنہ جواب مکمل ہونے کے قریب ہے جلدی جلدی پوری کرو۔ میرا یہ مشورہ ہے کہ اسے دو تین دنوں کے اندر اندر ہی پورا کیا جائے۔ شیخ نجم الدین نے مشورہ قبول کیا۔ دوسرے دن جب درسگاہ میں درس کیلئے تشریف لائے تو اچانک بابا فرخ آموجود ہوئے۔ اور کہا:

دی روز ہزار مرتبہ از علم الیقین بگزشتی امروز باز بر سر علم می آمدی	کل دن علم الیقین کے ہزار منزل طے کئے آج پھر علم ظاہر کی طرف لوٹ آئے ہو؟

یہ سن کر حضرت شیخ درس گاہ سے علیحدہ ہو کر گھر چلے آئے وہاں پہنچ کر کوٹی اور کتاب لکھنے بیٹھے۔ انہی دنوں حضرت شیخ جب یہ کتاب لکھنے میں منہمک تھے اچانک بابا فرخ حاضر ہوئے اور کہا:

شیطان ترا در کارہائے دیگر انداز د	شیطان نے تمہیں دوسرے کاموں میں لگادیا ہے

بعض حضرات لکھتے ہیں کہ درس میں جو اسباق پڑھ نہ پائے تھے وہی لکھ رہے تھے۔ دفعتاً بابا فرخ آئے اور کہا۔

شیطان ترا تشویش می دہد کہ این سخن ہارا بنویس [2]	شیطان تمہیں یہ باتیں (علم ظاہر) لکھنے کے لئے تذبذب میں ڈالتا ہے۔

بابا فرخ کی اس مسلسل تنبیہ نے حضرت شیخ کا دل و دماغ پلٹ دیا اور بقول مولانا غلام سرور لاہوری

۱؎ خزینۃ الاصفیاء ج ۲ ص ۲۶۰ ۲؎ نفحات الانس ص ۲۷۲

قلم را از دست بینداخت و دوات را بشکست و دل بخدا بست [1] — شیخ نے قلم ہاتھ سے پھینک دیا۔ دوات توڑ دی اور دل خدا کو سپرد کیا۔

اب حضرتِ شیخ نے دنیا و مافیہا سے تمام روابط و علاقات منقطع کئے۔ اِدھر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا کی ہوئی کنیت (ابو الجناب میں بھی یہی راز (از دنیا اجتناب می باید کرد) پایا اِس لئے اصحابِ دل کی تلاش میں نکلے۔

تلاش مُرشد اِس تلاش و جستجو کے عالم میں جس بزرگ سے ملتے مطمئن نہ ہوتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ حضرت شیخ زبردست عالم دین تھے۔ وہ علم ہی کی عینک سے تمام صلحاء و صوفیاء کو دیکھنے لگے۔ اِس میدان میں اُن کی مثال حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ مُنیری کے ساتھ ملتی جلتی ہے وہ بھی ایک عرصے تک کسی بزرگ سے ارادت قائم نہ کر سکے حتیٰ کہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ سے بھی پوری طرح مطمئن نہ ہوئے۔ بالآخر حضرت شیخ نجیب الدین سہروردیؒ اُن پر چھاپہ مارنے میں کامیاب ہوئے اور ایک ہی ملاقات میں اپنے پنجرے میں بند کر لیا۔ غرض ایک مدت کی تلاش و تفحص کے بعد حضرت شیخ نجم الدین کا مقصد پورا ہوتا ہے یعنی خوزستان میں اُن کی ملاقات شیخ اسماعیل قصری سے ہوتی ہے۔

شیخ اسماعیل قصری کے دامن ارادت میں مُرشد کی تلاش کے دوران ایک دن حضرتِ شیخ خوزستان پہنچے۔ یہاں سخت بیمار ہوئے اور بیٹھنے کے لئے کسی نے جگہ نہ دی۔ جب بیماری نے شدّت اختیار کی تو ایک آدمی سے کہا: اِس شہر میں کوئی بھی مسلمان نہیں ہے جو ایک بیمار اور اجنبی کو صحت ٹھیک ہونے تک جائے پناہ دے۔ اس شخص نے کہا: یہاں قریب ہی ایک بزرگ رہتے ہیں۔ اگر آپ وہاں جائیں گے تو وہ ضرور بیٹھنے کے لئے جگہ دے گا۔ حضرت شیخ نے اس بزرگ کا نام پوچھا اُس نے کہا کہ ان کا نام شیخ اسماعیل قصری ہے۔ حضرت شیخ وہاں چلے گئے تو شیخ قصری نے انہیں خانقاہ میں بیٹھنے کے لئے جگہ دے دی۔ اس خانقاہ میں اور بہت سے درویش آیا کرتے تھے۔ حضرت شیخ کی بیماری نے یہاں طول پکڑا مگر اس سخت بیماری سے زیادہ تکلیف دہ درویشوں کی محفل سماع کی

[1] خزینۃ الاصفیا صفحہ ۲۶۹

گرم بازاری ہوئی۔ اِدھر سے حضرت شیخ سماع کے بغایت منکر تھے۔ اب اتنی ہمت نہ تھی کہ نقل مکان کرتے۔ اسی دوران جب ایک دن پھر مجلسِ سماع گرم ہوئی اسی حالت میں شیخ اسماعیل قصری مجلس سے اُٹھے اور حضرتِ شیخ کے پاس آئے کہا: کیا آپ اُٹھنا چاہتے ہیں؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیا۔ شیخ قصری نے اُن کا ہاتھ پکڑا اور مجلسِ سماع کے عین درمیان بٹھایا۔ یہاں حضرتِ شیخ کے حواس قدرے زائل ہوئے۔ جب افاقہ ہوا تو اپنے آپ کو تندرست پایا گویا کوئی بیماری ہی نہ تھی۔ یہیں ارادت حاصل ہوئی۔ دوسرے دن شیخ اسماعیل کا دستِ ارادت پکڑا اور راہِ سلوک کے منازل طے ہوئے ¹ حضرتِ شیخ کے خلیفۂ خاص شیخ مجد والدین بغدادی نے اپنے مُرشد کے خرقہ پوشی کا شجرہ اپنی تصنیفات میں اس طرح درج کیا ہے۔

امیرالمومنین علی بن ابی طالب ــ شیخ کمیل بن زیاد ــ شیخ عبدالواحد ــ شیخ ابویعقوب سوسی شیخ ابویعقوب نہرجوری ــ شیخ ابوعبداللہ بن عثمان ــ شیخ ابویعقوب طبری ــ شیخ ابوالقاسم بن رمضان ــ شیخ ابوالعباس بن ادریس ــ شیخ داؤد بن محمد المعروف بہ خادم الفقراء ــ شیخ محمد بن مانکیل ــ شیخ اسماعیل قصری ــ شیخ المشائخ سلطان الطریقہ ولی تراشِ وقت شیخ نجم الدین الکبریٰ الخوارزمی (رحمہم اللہ) ²

شیخ عمّار یاسر کی صحبت میں

ایک عرصے تک اسی خانقاہ میں قیام رہا۔ حضرت شیخ پہلے ہی علوم شرعیہ سے آراستہ تھے۔ اب باطنی علوم میں کمال حاصل ہوا۔ ایک دن اپنے ظاہر و باطن پر سوچا تو دل سے اپنے تفوّق کا خیال گزرا۔ خیال یہ ہوا کہ میں علم باطن سے بھی خبردار ہوگیا اور علمِ ظاہر میں اپنے مُرشد شیخ اسماعیل سے فائق ہی ہو رہا ہوں۔ اس خیال کا گزرنا ہی تھا کہ دوسرے دن شیخ اسماعیل نے صبح سویرے طلب کیا اور فرمایا: "نجم الدین اُٹھو، اُٹھ جاؤ اور شیخ عمار یاسر کے پاس جاؤ۔" حضرتِ شیخ کو معلوم ہوا کہ شیخ اسماعیل میرے کل رات کے ارادہ سے باطنی طور پر آگاہ ہو گئے ہیں۔" چنانچہ کچھ کہے بغیر حضرتِ شیخ نے حکم بجالانے میں جلدی کی۔ یہاں شیخ عمّار کی خدمت میں

---

¹ نفحات و خزینہ ² رسالہ "فتوتیہ" قلمی مصنفہ میر سید علی ہمدانی رح

مُدّت تک رہے اور باضابطہ طور پر آن کے سلسلے کے ساتھ منسلک ہوئے۔ حضرت امیر سید علی ہمدانی نے اِس شجرۂ طیبہ کو یوں ذکر کیا ہے:۔

اپنے مُرشد کامل شیخ محمود مزدقانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ شیخ محمود۔ شیخ علاء الدولہ سمنانی۔ شیخ عبد الرحمٰن اسفرائنی۔ شیخ احمد کوربانی۔ شیخ رضی الدین علی لالا۔ شیخ مجد والدین بغدادی۔ شیخ نجم الدین کُبریٰ۔ شیخ عمار یاسر۔ شیخ ابو نجیب سہروردی۔ شیخ احمد غزالی۔ شیخ ابوبکر نساج۔ شیخ ابوالقاسم گرگانی۔ شیخ ابوعثمان مغربی۔ شیخ ابو علی کاتب۔ شیخ ابو علی رودباری۔ شیخ جنید بغدادی۔ شیخ سری سقطی۔ شیخ معروف کرخی۔ شیخ داؤد طائی۔ شیخ حبیب عجمی۔ حضرت حسن بصری۔ حضرت سیدنا علی ابن ابی طالب رضؓ۔ [1]

تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ ابھی شیخ عمارؒ کی صحبت ہی میں تھے کہ ایک دن پھر دل میں خیال گزرا جس سے احساس برتری کی بو آتی ہے۔ شیخ عمارؒ بھی باطنی طور پر آگاہ ہو گئے۔ صبح سویرے حضرت شیخ کو بُلایا اور مصر جا کر وہاں شیخ روزبہان بقلی سے استفادہ کرنے کا حکم دیا اور یہ بھی کہا کہ وہی ایک چپت سے تمہارے سر سے سارا سودا نکال پھینکے گا۔

شیخ روزبہان بقلی کی خدمت میں

تعمیل حکم لابُدی تھا۔ حضرت شیخ نے رختِ سفر باندھا اور مصر پہنچے۔ جب شیخ روزبہان عصؒ کی خانقاہ میں داخل ہوئے تو شیخ روزبہان کو موجود نہ پایا۔ مُرید

---

[1] رسالۂ "فقیریہ" قلمی۔ مصنف ابو محمد المعروف بہ شیخ کبیر روزبہان بقلی شیراز قصبہ "فسا" کے مشہور و معروف بزرگ گزرے ہیں۔ ۵۲۲ھ میں ولادت اور محرم ۶۰۶ھ میں رحلت کی ہے۔ ریاضت و مجاہدہ کا یہ عالم تھا کہ ایک ہی خرقہ میں سات سال تک کوہ بموی میں عبادت کی۔ بڑے بڑے عرفاء جیسے شیخ اکبرؒ بھی اُن کی عظمت و جلالت کے قائل تھے۔ خود اپنے بارے میں کہتے تھے سمعتُ مِنْ فلق الصبح الازل حقائق العلوم فصرت عالماً ربانیاً و شطاحاً سبحانیاً وعاد فاً صمد انیاً۔ اس کے علاوہ بلند پایہ مصنف بھی تھے۔ تفسیریں لطائف البیان من تفسیر القرآن اور عرائس البیان فی حقائق القرآن۔ اول الذکر میں فقط مفسرین کے اقوال نقل کیے ہیں اور دوسری میں ائمہ مشائخ جیسے جنید، شبلی، ابو بکر واسطی، سہل بن عبد اللہ تستری وغیرہ کے ارشادات بیان کیے ہیں۔ فقہ اور تصوّف پر بھی اُن کی متعدد کتابیں ہیں۔ اُن کی حیات پر (باقی اگلے صفحہ پر)

سب کے سب مراقبہ کی حالت میں تھے۔ حضرت شیخ نے کسی شخص سے شیخ روزبہان کے بارے میں پوچھا۔ اُس نے کہا شیخ باہر وضو فرما رہے ہیں۔ حضرت شیخ باہر آئے۔ شیخ روزبہان کو یہاں دیکھا کہ ایک جگہ بہت کم پانی سے وضو کر رہے ہیں۔ حضرت شیخ چوں کہ عالم دین تھے۔ فقہی عینک سے اس وضو کی صحت اور عدم صحت پر غور کرنے لگے۔ دل میں کہا کہ اتنے کم پانی سے وضو کرنا کہاں تک درست ہے شیخ نمی داند کہ دریں قدر آب وضو ساختن جائز نیست۔ چگونہ شیخ باشد یعنی کیا شیخ یہ بھی نہیں جانتے کہ اتنے کم پانی سے وضو کرنا جائز نہیں ہے۔ کس طرح مُرشد بن سکتے ہیں۔ شیخ روزبہان جب وضو سے فارغ ہوئے تو شیخ نجم الدین کے چہرے پر پانی کے چھینٹے لگائے۔ چھینٹوں کا پڑنا ہی تھا کہ حضرت شیخ میں بے خودی پیدا ہوئی۔ شیخ روزبہان خانقاہ میں آئے۔ حضرت شیخ ساتھ ساتھ تھے۔ منتظر تھے کہ شیخ طہارت کے کلمات سے کب فارغ ہو جائیں اور میں سلام عرض کروں ابھی اسی حال میں تھے کہ حضرت شیخ دفعتاً اپنے سارے حواس کھو بیٹھے۔ اس کے بعد جو حال گذرا وہ اُن ہی کی زبانی مولانا جامی کے الفاظ میں سُنیئے۔ فرماتے ہیں۔

دیدم کہ قیامت قایم شدہ است۔ دوزخ ظاہر گشتہ مردماں را می گیرند بہ آتش می اندازند و بریں رہ گزر آتش پشتہ است و شخصے بر سرِ آں نشستہ است۔ و ہر کہ می گوید کہ مَن تعلق بوے دارم اُو را رہا می کنند۔ و دیگراں را در آتش

اِسی بے ہوشی کی حالت میں دیکھتا ہوں کہ قیامت آگئی ہے اور دوزخ نمودار ہوا ہے۔ لوگوں کو پکڑا اور آگ میں پھینکا جا رہا ہے۔ دوزخ کے اوپر کے جانب ایک ٹیلہ ہے جس پر کوئی شخص بیٹھا ہے۔ لوگوں میں سے جو بھی کہتا ہے کہ میں

پچھلے صفحہ کا بقایا۔ چار مستند کتابیں ہیں جن میں ایک خود شیخ روزبہان کی تحفۃ العرفان ہے باقی تین تحفہ اہل العرفان مصنفہ شرف الدین ابراہیم، روح الجنان مصنفہ عبداللطیف شمس اور منازل القلوب مصنفہ سیمابی ہے۔ ان چاروں کتابوں کو محمد تقی دانش نے ایڈٹ کیا ہے اور "روزبہان نامہ" کے نام سے انتشارات انجمن آثار ملی۔ طہران کی طرف سے ۱۳۴۷ھ میں شائع ہوئی ہے

می اندازند- ناگاہ مرا بگرفتند- وبکشیدند چوں آنجا رسیدم، گفتم: من تعلق بوے دارم مرا رہا کردند من بر پشتہ بالا رفتم دیدم کہ شیخ روزبہان است، بپیش او رفتم ودرپائے او افتادم- او سیلی سخت بر قفاے من زد- چناں کہ از قوتِ آں بر روی در افتادم وگفت بیش ازیں اہلِ حق را انکار مکن [1]

اس شخص سے تعلق رکھتا ہوں اُس کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور باقی لوگوں کو آگ میں جھونک دیا جاتا ہے اچانک مجھے بھی پکڑا اور آگ کی طرف کھینچا گیا جب قریب پہنچا تو میں نے بھی کہا کہ میں اِس شخص سے وابستہ ہوں۔ اِس پر مجھے چھوڑ دیا گیا- اس کے بعد میں اِس ٹیلے کی طرف چڑھا تو جب قریب ہوا تو دیکھا کہ یہ شخص شیخ روز بہاں ہیں- میں اُن کے پیروں پر پڑا انہوں نے اس زور سے میری گدی پر طمانچہ مارا کہ میں منہ کے بل گر گیا اور فرمایا: خبردار اب کبھی اہلِ حق سے انکار نہ کرنا

حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ جب میں ہوش میں آیا- شیخ روزبہاں حالتِ نماز میں تھے- جب سلام پھیر دیا میں اُن کے قدموں پر پڑا- انہوں نے اُسی طرح طمانچہ مارا اور وہی الفاظ دُہرائے جن سے بے ہوشی کے عالم میں سابقہ پڑا تھا-

خوارزم کی طرف مراجعت حضرت شیخ کے تمام شبہات و وساوس شیخ روزبہاں کی خدمت میں رہ کر ختم ہوئے- احساسِ تفوق بھی کالعدم ہوا- جب شیخ روزبہاں مطمئن ہوئے تو حضرت شیخ کو واپس شیخ عمّار کی طرف بھیج دیا- اور ایک خط بھی اُن کے نام لکھا جس میں بتایا تھا کہ جتنا تانبا تھا وہ دور کر دیا اب خالص سونا بنا کے بھیج رہا ہوں- جب شیخ عمار کی خدمت میں پہنچے یہاں کچھ مدت ٹھہرے اور سلوک کے منازل طے کیے- آخر کار شیخ عمّار نے واپس اپنے آبائی وطن خوارزم جانے کی ہدایت کی- حضرت شیخ خوارزم لوٹے اور خلقِ خدا کی اصلاح و تربیت میں لگ گئے-

شہادت کچھ وقت اطمینان سے گزرا اچانک وہ وقت آگیا جب سب سے خطرناک اور وحشی و درندہ صفت قوم کا سردار "تیموجن" معروف بہ چنگیز خان عزم صمیم کرتا ہے کہ دنیا میں یا خلیفہ

[1] نفحات الانس ص ۲۷۲ مطبع حیدری ۱۲۸۹ھ

رہے گا یا خاقان - اس طرح وہ اسلامی ممالک کو زیر و زبر اور مسلمانوں کی عظیم کثرت کو تہ تیغ کرتا ہے جس دن (بقول مصنف جمعیۃ التواریخ) چھ لاکھ مسلمانوں کو قتل کیا جاتا ہے اسی دن حضرت شیخ بھی شہید ہوتے ہیں - مولانا جامی رقمطراز ہیں کہ جب تاتاریوں نے سلطان محمد خوارزم شاہ سے انتقام لینے کی غرض سے خوارزم کی طرف رُخ کیا (حالانکہ سلطان وہاں سے کب کا بھاگ چکا تھا) تو حضرت شیخ نے اپنے بعض اصحاب جیسے سعد الدین حموی، شیخ رضی الدین علی لالا وغیرہ کو طلب کیا اور فرمایا: فوراً اٹھو اور اپنی اپنی جگہوں کی طرف جا نکلو، اس لئے کہ

آتشے از جانب مشرق برافروخت
تا نزدیک مغرب خواہد سوخت و
ایں فتنہ ایست عظیم کہ در امت
مثل ایں واقع نہ شدہ [1]

مشرق سے ایک آگ نمودار ہونے والی ہے جو مغرب کے قریب تک پھیل کر سب کچھ جلا دیگی - یہ ایک عظیم فتنہ ہے کہ امت میں آج تک اس جیسا فتنہ واقع نہیں ہوا ہے۔

یہ سُن کر شاگردوں نے عرض کیا: دعا فرمائیے تاکہ یہ بلا اسلامی ممالک سے ٹل جائے۔ حضرت شیخ نے فرمایا: ایں قضائیست مبرم دعا بلائے دفع آں نمی تواند کرد - مولانا غلام سرور لاہوری نے شیخ مجد الدین بغدادی (خلیفہ حضرت شیخ) کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ جب سلطان محمد خوارزم شاہ نے شیخ مجد الدین کے حاسدوں کے افتراء کا شکار ہو کر اُن کو دریا میں غرق کروانے کا حکم دیا، تو یہ خبر سُن کر شیخ نجم الدین کی حالت متغیر ہوئی - اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہہ کر فرمایا: فرزندم مجد الدین را در دریا انداختند و بمرد - دیر تک اسی اضطراب میں رہے اس کے بعد آسمان کی طرف سر اٹھایا اور ربّ العزت سے دعا کی کہ سلطان کی سلطنت چھین لے - یہ خبر جب سلطان کو پہنچی تو پاپیادہ حاضر ہوا - اپنے ساتھ ایک سونے کی تلوار، ایک طشت اور ایک کفن لایا - حضرت شیخ کے حجرے میں جوتیاں رکھنے کی جگہ کھڑا ہوا اور کہا: اگر دیت (خونبہا) منظور ہے تو سونا حاضر ہے - اگر قصاص ہی مطلوب ہے تو تلوار حاضر ہے میں سر بکفن آیا ہوں - حضرت شیخ نے فرمایا - کان ذٰلِکَ عِنْدَ اللّٰہِ مَسْطُوْرًا تمہارا سارا ملک مجد الدین کی دیت ہے، جو تم سے چھینا جائے گا - تمہارا سر بھی عام لوگوں کے ساتھ جائے گا۔

---

[1] نفحات الانس ص ۴۲۳، نیز شذرات الذہب -

اور ہم بھی قتل کئے جائیں گے۔" یہ سُن کر بادشاہ نااُمید ہو کر واپس لوٹا[1] غرض جب شاگردوں
کو رخصت کیا تو دور تک اُن کے ساتھ ہو لئے، کچھ اور آگے بڑھے تو رُک گئے اور فرمایا: من اینجا
شہید خواہم شد، مرا اذن نیست کہ بیرون روم - میں اسی جگہ شہید ہو جاؤں گا۔ مجھے اس
جگہ سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس پر اصحاب چل دیئے۔ تاتار شہر میں داخل ہوئے۔
شیخ اپنے مستقر پہ گئے اپنے مُرشد کا خرقہ زیب تن کیا - دونوں جیب کنکروں سے بھر دیئے۔
تیر و کمان ہاتھ میں لیا - میدان میں اُترے بلند آواز سے پکارا توموا نقاتل فی سبیل اللہ
پہلے دشمن پہ پکڑ کر برسائے حتیٰ کہ دونوں جیب خالی ہوئے - پھر تیر کمان ہاتھ میں لیا، لڑنے کے
دوران حالت یہ تھی -

جعل یدور و یرقص[2] گھومنا اور جھومنا شروع کیا -

اسی حالت میں ایک تیر سینہ میں پھنس گیا - اسے کھینچا اور آسمان کی طرف پھینکا - خون بہنا شروع ہوا۔
زبان سے بار بار کہتے تھے: ان اردت فاقتلنی بالفراق او بالوصال - اس کے بعد گر گئے۔
پھر کچھ دیر بعد شوقِ جہاد سے مست و بے خود اور عشق و محبت سے سرشار جان، جان آفرین کو سپرد کی
تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ کے ہاتھ میں کفار کا جھنڈا تھا جو انہوں نے اُن سے چھین لیا تھا اور اس کو
ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ حضرات تذکرہ نگار یہ بھی لکھتے ہیں کہ مولانا رومی کے حسبِ ذیل اشعار میں اسی کی طرف
اشارہ ہے۔

ما ازاں محتشمانیم کہ ساغر گیرند — نہ ازاں مفلسگاں کہ بز لاغر گیرند
بیکے دست مئے خالص ایماں نوشند — بیکے دستِ دگر پرچمِ کفار گیرند

واللہ اعلم! اس میں کتنی حقیقت ہے البتہ اسمیں شبہ نہیں کہ حضرتِ شیخ نے جہاد فی سبیل اللہ میں
حصہ لے کر ثابت کیا کہ تصوف گوشہ نشینی کا نام نہیں ہے بلکہ حضرات صوفیہ صافیہ جہاد کے وقت
ایک بڑے سے بڑے مجاہد سے کم نہیں ہوتے۔ ؎

فلسنا علی الاعقاب تدمی کلومنا — ولکن علی اقدامنا تقطر الدماء

---

[1] نفحات الانس ص ۷۲۳ نیز شذرات الذہب [2] شندلو ج ۵

میسور میں دو دن

سعید احمد اکبر آبادی

جنوری کے ہفتہ کی کوئی تاریخ تھی کہ محب قدیم میر محمود حسین صاحب صدر شعبۂ اردو، میسور یونیورسٹی کا گرامی نامہ موصول ہوا کہ پروفیسر بی۔ شیخ علی صدر شعبۂ تاریخ و ڈائرکٹر، سنٹر آف مڈل ایسٹ اسٹڈیز، میسور یونیورسٹی اپنے شعبہ کے ماتحت "ماڈرن عربک لٹریچر" پر میرا ایک توسیعی لکچر چاہتے ہیں۔ میں نے شکریہ کے ساتھ یہ دعوت منظور کرلی۔ پروفیسر صاحب فروری کے پہلے ہفتہ میں چاہتے تھے، مگر میں فارغ نہیں تھا۔ اس لئے باہم رضامندی سے ۲۶ر فروری مقرر ہوگئی، ۲۵ر فروری کو دن کے گیارہ بجے کالیکٹ سے بذریعہ بس روانہ ہوا۔ اس راستہ کی خوبصورتی ضرب المثل ہے، بارہا اس کی تعریف سنی تھی۔ میرے لئے یہ پہلا موقع تھا۔ واقعی کالیکٹ سے میسور تک پورا راستہ چھوٹے بڑے سرسبز و شاداب پہاڑوں، وادیوں، اونچے اونچے نہایت گنجان ناریل کے درختوں اور درمیان میں کہیں کہیں پانی کی ندی نالوں پر انہیں میں منتشر آبادیوں اور کئی میل تک طویل وعریض نیشنل فورسٹ جس میں قسم قسم کے جانور کھلے بندوں آزاد پھرتے ہیں۔ ان سب کی وجہ سے فطرت کے جمال و نزہت کا مرقع ہے۔ یوں تو پورا کیرالا ہی جنوبی ہند کا کشمیر ہے، تاہم یہ راستہ حسین مناظر میں آپ اپنی نظیر ہے۔

ان مناظر سے لطف اندوزی کے عالم میں پانچ بجے بس میسور پہونچی تو اڈہ پر میر محمود حسین صاحب اور سید منظور احمد صاحب جو ایک کالج میں اُردو کے لکچرر ہیں۔ ایک کار کے ساتھ استقبال کے لئے موجود تھے۔ بس سے اتر کر ان دونوں احباب کے ساتھ پہلے مسجد آیا۔ جماعت کے ساتھ عصر کی نماز پڑھی، اس سے فراغت کے بعد قریب میں ہی ایک نہایت شاندار رستوران تھا وہاں کار

میں بیٹھے بیٹھے ہی ایک ایک سموسہ کھایا اور کافی کی ایک ایک پیالی پی اور پھر ہم لوگ سیدھے سرنگا پٹم کے لئے روانہ ہو گئے جو یہاں سے دس میل کے فاصلہ پر ہے۔

سرنگاپٹم، سلطان ٹیپو شہید اور ان کے خاندان کے مقبرہ کے باعث عوام وخواص کی زیارت گاہ اور علی الخصوص مسلمانوں کے لئے بارگاہِ عقیدت وارادت ہے، اس لئے اس سفر میں مقبرہ پر حاضری کا پہلے سے پکا ارادہ تھا۔ برسوں پہلے جب بنگلور آیا تھا تو اس وقت بھی سرنگاپٹم آیا تھا۔ لیکن جناب میر محمود حسین صاحب نے اس خیال سے کہ کل میرا لکچر ہے اور دوسری مصروفیتیں بھی رہیں گی، آج کی شام کو مجھے فارغ رکھا اور سرنگاپٹم کا پروگرام بنالیا۔ موصوف کی اس کرم گستری اور دلجوئی سے طبیعت نہایت محظوظ ہوئی اور میں نے ان کا شکریہ ادا کیا میر صاحب سے دیرینہ نیازمندی کا تعلق ہے، اردو اور فارسی کے بڑے فاضل، وسیع النظر عالم اور نہایت شگفتہ مزاج اور کریم الاخلاق بزرگ ہیں، برہان کے مقالہ نگار بھی رہ چکے ہیں، عزیزم سید منظور احمد سے پہلی ملاقات تھی لیکن اس طرح ملے کہ گویا برسوں کے ساتھی اور رفیق تھے بالکل نوجوان ہیں، اردو میں لیکچرر ہیں مگر سائنس میں گریجویٹ ہیں اور انگریزی لٹریچر کا اچھا مطالعہ ہے، نہایت فعال اور متحرک ہیں، انتظامی صلاحیت بھی بہت اچھی رکھتے ہیں۔ اسی لئے اپنے کالج میں استادوں کی انجمن کے سکرٹری ہیں۔ میسور میں قیام کے دو دنوں میں ہر مرحلہ پر ان کی معیت ورفاقت کے باعث جو مسرت وراحت نصیب ہوئی اس کی خوشگوار یاد اب تک دل کے خزانہ میں محفوظ ہے،

اب کار روانہ ہوئی اور راستہ میں قابلِ ذکر مقامات آئے تو دونوں رفیق بتاتے گئے کہ یہ وہ عمارت ہے، یہ وہ مقام ہے۔ یہاں تک کہ مہاراجہ کے نہایت عظیم الشان اور پرشکوہ محل کے سامنے سے گذر ہوا تو سید منظور احمد نے کہا کہ علامہ اقبال مہاراجہ کی دعوت پر جب میسور آئے تھے تو اسی قصرِ عالی نشان میں قیام کیا تھا اور محل کے ایک خاص گوشہ کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ یہی وہ گوشہ ہے جس میں علامہ فروکش تھے، اقبال کا نام سنکر اور ان کی جائے قیام پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہی

ایسا محسوس ہوا کہ گویا ربابِ قلب کے تار مرتعش ہو گئے اور دھیمے دھیمے سروں میں نغمہ ریز ہونے لگے میسور کو باغوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ اور واقعی ہے بھی ایسا ہی۔ ایک گھنٹہ سے کچھ کم میں سلطان شہید کا مقبرہ آگیا۔ دروازہ میں داخل ہوتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ بڑی عمدہ اور موثر قوالی ہو رہی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اقبال نے سلطان شہید کی منقبت میں جو اشعار کہے ہیں، قوالوں کی زبان سے ان کو ریکارڈ کر لیا گیا ہے۔ اور یہ ریکارڈ روزانہ عصر و مغرب کے درمیان میں مقبرہ کی چھت پر سے مسلسل سنائے جاتے ہیں، اقبال کے اشعار اور قوالوں کی زبان سے انھوں نے فضا میں عجب کیف و سرور کا عالم پیدا کر دیا تھا۔ ایک گنبد کے نیچے سلطان ٹیپو شہید، ان کے والد اور والدہ تینوں کی قبریں برابر ہیں اور باہر سلطان کے بھائیوں، بہنوں، بیٹوں اور بیٹیوں اور دوسرے اعزاد اقربا کی قبریں مقبرہ سے باہر چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں، ہم نے گھوم پھر کر سب پر فاتحہ پڑھی، سلطان کی قبر پر فاتحہ پڑھتے وقت قلب و ذہن کی عجیب حالت ہوئی جسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

مغرب کا وقت قریب آگیا تھا اس لئے یہاں سے روانہ ہو کر ہم لوگ قلعہ میں آئے۔ راستہ میں وہ میدان بھی دیکھا جہاں انگریزوں سے جنگ ہوئی تھی اور سلطان نے جام شہادت نوش کیا تھا۔ قلعہ میں ایک وسیع اور خوبصورت مسجد سنگ مرمر کی بنی ہوئی کافی بلندی پر ہے، اس میں داخل ہو کر نماز باجماعت ادا کی، گورنمنٹ کی طرف سے جو صاحب یہاں کے منتظم مقرر ہیں اور سلطان کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں وہ مسجد سے متصل ہی ایک مکان میں رہتے ہیں، نماز سے فراغت کے بعد وہ اپنے گھر میں لے آئے، چائے سے تواضع کی اور پھر سلطان کے چند فرامین جو ان کے خاندان میں محفوظ ہیں، ان کی زیارت کرائی، ایک فرمان میں سلطان نے لکھا تھا: سخت افسوس کی بات ہے کہ مسلمان شادی بیاہ کے معاملہ میں فضول خرچی کرتے اور ہندوؤں کے رسم و رواج کی پابندی کرتے ہیں جو احکام شریعت کے خلاف ہیں۔ اس لئے میں قاضیوں کا ایک محکمہ قائم کرتا ہوں تاکہ سب نکاح ان کی نگرانی میں شریعت اسلام کی تعلیمات کے مطابق ہوں، یہ فرمان پہلے کہیں ہمری نظر سے گذر چکا ہے۔ آج اس کی اصل دیکھ کر

خوشی ہوئی،

یہاں سے رخصت ہوکر ہم لوگ کرشنا راج ساگر گئے جو یہاں کیا غالباً ایشیا میں حسن و جمال اور نزہت و لطافت کے اعتبار سے اپنی نوعیت میں منفرد ہے، سلطان نے یہاں ایک نہایت مضبوط، وسیع اور بلند بند (Dam) بنایا تھا۔ مہاراجہ نے اس کے عقب میں اوپر نیچے چند در چند جداول بنا کر پانی کو ان جداول میں رواں دواں کر دیا۔ اور آبشاروں کا منظر پیدا کر کے اِدھر اُدھر چاروں طرف پانی کے اندر اور باہر رنگ رنگ کی روشنیوں سے آراستہ و پیراستہ کر کے اس پورے علاقہ کو بقعۂ رنگ و نور بنا دیا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ تاظورۂ فطرت نے اپنے حسن و شباب کو اس طرح عریاں کر دیا ہے کہ پوری فضا اس میں خود ہو کر رہ گئی ہے۔ میر صاحب تو کار میں بیٹھے رہے، میں اور منظور صاحب چاروں طرف گھومتے پھرتے رہے، نو بجے ہم واپس ہوئے اور یونیورسٹی کے مہمان خانہ پہنچے۔ یہاں ایک کمرہ میرے لئے رزرو تھا۔ کھانا کھایا۔ نماز پڑھی اور ان دونوں حضرات کو رخصت کر کے کمرہ میں پڑ کر سو گیا۔

دوسرے دن صبح کو ناشتہ پر ایک امریکن پروفیسر اور ان کی بیوی سے ملاقات ہوئی۔ شوہر امریکن ہسٹری کے ماہر ہیں یہاں شعبۂ تاریخ کے ماتحت چند ماہ کے لئے وزٹنگ پروفیسر ہو کر آئے ہیں۔ بیوی علم سمع و بصر کی ماہر ہیں، اس پر لکچر دے رہی ہیں۔ میاں بیوی دونوں کو میرے لیکچر کا علم تھا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ لکچر میں ضرور شریک ہوں گے، لکچر شام کو چار بجے تھا۔ اس لئے کمرہ میں ہی رہا۔ یہاں ڈاکٹر سید نصیر الدین صدر انجمن حدیقۃ الادب اور مسٹر نور الحق جو ایک کالج میں سائنس کے لکچرر ہیں ملاقات کے لئے آئے اور دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ اول الذکر نے میر محمود حسین صاحب سے اجازت لے کر انجمن حدیقۃ الادب کے ایک جلسۂ عام میں عشاء کے بعد مولانا محمد علی پر میری تقریر کا پوسٹروں کے ذریعہ اعلان کر رکھا تھا اور موخر الذکر نے اپنے ہاں ڈنر پر مدعو کیا، میر صاحب اور منظور صاحب بھی آئے اور کچھ دیر بیٹھ کر چلے گئے۔

ساڑھے تین بجے منظور صاحب آ گئے۔ ان کے ساتھ روانہ ہوا۔ یونیورسٹی کی مختلف شاندار عمارتوں

سے گذرتا ہوا شعبۂ تاریخ پہونچا۔ شعبہ کے صدر پروفیسر شیخ علی کے کمرہ میں گیا۔ اُن سے اور دوسرے حضرات سے جو وہاں موجود تھے ملاقات ہوئی۔ کافی سے فراغت کے بعد ٹھیک چار بجے شعبہ کے وسیع اور کشادہ سیمنار ہال میں ہم پہونچ گئے۔ صدر شعبہ کی صدارت میں جلسہ شروع ہوا۔ انہوں نے جلسہ کی تقریب اور لکچر کے موضوع کا اظہار کیا، پھر ان کی درخواست پر میر محمود حسین صاحب نے کھڑے ہو کر میرے تعارف میں تقریر کی، اس کے بعد صدر صاحب نے مجھ سے درخواست کی اور میں نے لکچر شروع کر دیا جو باریک انگریزی ٹائپ کے سولہ صفحات فلسکیپ میں پھیلا ہوا تھا۔

لکچر کا موضوع تھا: "ماڈرن عریک لٹریچر" لیکن چوں کہ لٹریچر کا ارتقا زبان کے ارتقا کے بغیر ممکن نہیں ہے اس لئے میں نے اولاً ۱۷۹۸ء سے یعنی ۱۷۹۸ء میں مصر پر نپولین کے حملہ کے بعد سے اب تک عربی زبان میں جو نہایت عظیم الشان جدید اصطلاحات و الفاظ کا اضافہ ہوا ہے اس کا جائزہ تاریخی اور لغوی نقطۂ نظر سے لیا اور پھر ماڈرن لٹریچر پر گفتگو کی۔ لکچر ایک گھنٹہ کا تھا۔ ہال طلبا و طالبات اساتذہ اور دوسرے اربابِ علم سے بھرا ہوا تھا۔ سب نے اسے خاموشی اور دلچسپی سے سنا۔

اس کے بعد پروفیسر شیخ علی کھڑے ہوئے، انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں پہلے لکچر کی تعریف کی اور کہا کہ اس لکچر سے عربی زبان کے ارتقا اور ادب میں جدید رجحانات اور لٹریچر کے متعلق ہمیں پہلی مرتبہ بعض نہایت قیمتی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ پھر انہوں نے فرمایا کہ اس قسم کے خصوصی لکچروں میں حاضری کم ہوتی ہے، لیکن اس وقت یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ پورا ہال بھرا ہوا ہے۔ اس میں بڑا دخل موضوع کی کشش کے علاوہ مقرر کی شہرت اور شخصیت کا بھی ہے۔ اس کے بعد موصوف نے تاریخ اور فلسفہ میں مسلمانوں کے کارناموں کا ایک بلند پایہ مورخ کی حیثیت سے بصیرت افروز تذکرہ کیا۔ پھر ایک صاحب نے عربی کی جدید شاعری پر سوال کیا۔ میں نے جواب میں مختصر تقریر کی۔ اس پر جلسہ برخاست ہو گیا، ہال سے باہر آیا تو بہت سے نئے پرانے احباب سے ملاقات اور گفتگو کر کے بڑی مسرت ہوئی۔

پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق یہاں سے فارغ ہوکر ہم سب لوگ شعبۂ اردو کی عمارت میں آگئے، یہاں شعبہ نے ایک نہایت مکلف اور بہت وسیع عصرانہ کا انتظام کیا تھا جس میں یونیورسٹی کے اساتذہ کے علاوہ شہر کے ادبا اور شعرا کا بھی بڑا مجمع شریک تھا۔ اس سے فراغت کے بعد اقبال صدی تقریبات کے سلسلہ میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ صدر جلسہ میسور کے ایک بڑے صنعت کار حاجی نور محمد تھے، انہوں نے مختصر خطبۂ صدارت پڑھا اور شعبہ کو ایک خطیر رقم اس غرض سے دینے کا اعلان کیا کہ ہر سال ایم۔ اے کے جس طالب علم یا طالبہ کا مقالہ علامہ اقبال پر سب سے اچھا ہوگا اس کو گولڈ میڈل دیا جائیگا اس کے بعد "اقبال اور عشقِ نبوی" کے موضوع پر چالیس منٹ کے لگ بھگ میری تقریر ہوئی، شعبۂ اردو کی سب کارروائی اردو میں تھی۔

اس کے بعد میسور کے نامور شاعر جناب ضمیر عاقل شاہی جو سلطان ٹیپو کے استاد کے خاندان سے ہیں ان کی صدارت میں مشاعرہ شروع ہوا، پہلے نوجوان شعرا نے جن میں ایک خاتون بھی تھیں پھر اساتذہ نے اپنا کلام سنایا۔ مجمع کے اصرار پر میں نے بھی اپنی پرانی دُھرانی غزلوں کے دو چار شعر جو یاد تھے انہیں سناکر شہیدوں میں نام لکھا لیا۔ مشاعرہ صاف ستھرا اور مہذب وشائستہ تھا، میں نام بھولتا ہوں جس نوجوان نے نقیب مشاعرہ کا فرض بڑی خوبی اور خوش سلیقگی سے انجام دیا میں ان سے بہت متاثر ہوا، یہ اردو میں ایم۔ اے ہیں اور خود بھی شاعر ہیں، مشاعرہ ختم ہوگیا تو انھوں نے فرمائش کی کہ مشاعرہ کی نسبت میں اپنے تاثرات بیان کروں، اس لئے میں پھر کھڑا ہوگیا۔ اور ایک خالص ادبی تقریر کی اور یہ نشست ختم ہوگئی ½ ۸ بجے یہ نشست ختم ہوئی تھی کہ پروفیسر عبد القادر جو میسور کے ایک کالج میں اردو کے بڑے لائق و فاضل استاد تھے اور اب ریٹائرڈ ہیں اپنی کار لیکر پہونچ گئے، پروفیسر شیخ علی اور میں ان کے ساتھ روانہ ہوئے اور نور الحق صاحب کے بنگلہ پر پہونچے، جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں۔ نورالحق صاحب ایک کرسچین کالج میں سائنس (نباتات) کے استاد ہیں مگر نہایت صالح اور دیندار نوجوان

ہیں، وضع قطع اور صورت شکل سے مولوی نظر آتے ہیں، یہاں پہونچکر میں نے پہلے جماعت سے نماز ادا کی۔ پھر چند ارباب علم وفضل احباب کے ساتھ نہایت مکلف اور لذیذ ڈنر کھایا اس کے بعد پروفیسر عبدالقادر صاحب ہی کی کار میں روانہ ہوا اور شہر میں انجمن حدیقۃ الادب کے جلسہ میں شرکت کے لئے روانہ ہوگیا نورالحق صاحب بھی ہمراہ تھے۔ یہ جلسہ مسلمانوں کے ایک محلہ کے اندر ایک ہال میں منعقد ہوا۔ مجمع خاصا اچھا تھا۔ قرآن مجید کی تلاوت کے بعد صدر انجمن ڈاکٹر سید نصیرالدین صاحب نے انجمن کی زبان اردو کی خدمات اور اس کی کارگذاریوں اور اس وقت کے جلسہ کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی، پھر پروفیسر عبدالقادر نے بڑی شستہ زبان میں میرا تعارف کرایا اور مولانا محمد علی کی شخصیت پر ایک دلپذیر تقریر کی، اس کے بعد مولانا محمد علی سے متعلق اپنے مشاہدات ومحسوسات کی روشنی میں مولانا کی ذاتی اور شخصی خصوصیات کا میں نے تذکرہ کیا، میں چاہتا تھا کہ اور کہوں۔ لیکن شام کے چار بجے سے اب تک برابر مصروف رہا تھا اس لئے دماغ نے ساتھ نہ دیا۔ چالیس منٹ تقریر کر سکا، آخر میں میسور کے ادیب، اور شاعر نسیم تمنائی صاحب نے شکریہ ادا کیا۔ اور جلسہ برخاست ہوگیا۔

دوسرے دن پروفیسر شیخ علی، میر محمود حسین صاحب، نورالحق صاحب اور بعض اور احباب ملاقات کو آتے رہے، امریکن پروفیسر اور ان کی بیوی بھی آئیں میرا فوٹو لیا اور لکچر کی تعریف کی، گیارہ بجے کے قریب عزیزم سید منظور احمد آئے۔ ان کے ساتھ میسور کے بڑے بازار گیا۔ میوزیم دیکھا میسور کی صنعت وحرفت دیکھ کر جی بہت خوش ہوا، وہاں سے مہاراجہ کے محل گیا۔ اب محل کھل گیا ہے۔ اس لئے اندر سے خوب گھوم پھر کر دیکھا۔ ظہر کی نماز ایک مسجد میں باجماعت ادا کی، واپس آکر کھانا کھایا۔ اور کچھ دیر قیلولہ کیا، اور چار بجے کی بس سے کالیکٹ کے لئے روانہ ہوگیا۔ میر محمود حسین صاحب کے الطاف واکرام کا شکریہ ادا نہیں کرسکتا۔ اہلیہ محترمہ کی سخت علالت اور تنہائی کے باوجود اکثر اوقات میرے ساتھ رہے اور ہر قسم کی راحت وآسائش کا خیال رکھا۔ بس کے اڈہ پر بھی انھوں نے اور سید منظور احمد صاحب نے الوداع کہا۔

تبصرے

عبد الرحمٰن الکواکبی: از ڈاکٹر محمود الحق ریڈر شعبۂ اسلامیات علی گڈھ مسلم یونیورسٹی۔ تقطیع کلاں۔ ضخامت ۴۲۶ صفحات، کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد درج نہیں شائع کردہ ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں ترکوں کے خلاف عرب قومیت کی جو تحریک شام میں اولاً اور ترکی کے مقبوضہ دیگر عرب علاقوں میں ثانیاً پیدا ہوئی شیخ عبدالرحمٰن الکواکبی اُس کے زعماء بلکہ اس تحریک کے بانیوں میں سے تھے۔ عرب قومیت کے متعلق ان کا نظریہ تھا کہ اسلام اور عرب دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں، اسلام اگر سرفراز و سربلند ہوگا تو عرب بھی ترقی پذیر ہوں گے اور عرب ذلیل وخوار ہوں گے تو اسلام بھی رسوا ہوگا۔ اور چوں کہ ترکوں کی مستبدانہ حکومت میں عرب پسماندہ ہیں اس لئے اسلام بھی تنزل پذیر ہے اس نظریہ کے ماتحت الکواکبی اور ان کے رفقا نے عرب قومیت کی تحریک شروع کی جس کا براہ راست نشانہ سلطان عبدالحمید کی حکومت تھی۔ اس سلسلہ میں اُنھوں نے متعدد رسالے نکالے اور اُن میں پُرزور مضامین لکھ کر ایک طرف حکومت پر سخت تنقید کی اور دوسری جانب عربوں میں عرب قومیت کا جذبہ پیدا کیا، اس جرم کی پاداش میں وہ متعدد بار گرفتار ہوئے، مقدمات چلے، قید وبند اور جلا وطنی کی سزاؤں سے دوچار ہوئے، اور آخر وفات (۱۹۰۲ء)

سے تین سال قبل وہ مصر ہجرت کر گئے جو اس زمانہ میں شام کے حریت پسند ارباب قلم کی سب سے بڑی پناہ گاہ تھا، یہاں الکواکبی نے المنار اور المؤید میں اسلام کے عروج وزوال کے اسباب و علل اور استبداد کے فلسفہ اور اس کے محرکات و عوامل پر مسلسل نہایت موثر اور ولولہ انگیز مقالات لکھے جو بعد میں دو کتابوں کی صورت میں یکجا شائع ہوئے اور اب الکواکبی کی شہرت بام عروج کو پہنچ گئی، اپنی تحریک کو عام اور وسیع کرنے کی غرض سے الکواکبی نے عرب اور غیر عرب ممالک کا ایک طویل دورہ بھی کیا تھا۔ لیکن مصر واپس آنے کے چند ماہ بعد ہی ایک دن اچانک ۴۸ برس کی عمر میں حرکتِ قلب بند ہو جانے سے اِن کا انتقال ہو گیا،

شیخ عبدالرحمٰن الکواکبی جس اہم شخصیت کے حامل تھے اس کے پیشِ نظر عربی میں نہیں بلکہ انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں بھی اُن پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن اُردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو اس تحقیق، تفصیل اور ناقدانہ بصیرت کے ساتھ مرحوم کے سوانح حیات، تصنیفی کارناموں اور افکار و نظریات پر ہمارے مطالعہ میں آئی ہے، فاضل مؤلف کا نقطۂ نظر معروضی ہے، جو کچھ لکھا ہے تحقیق سے لکھا ہے، جہاں کہیں اختلافِ آرا ہے وہاں اپنی جچی تلی رائے سنجیدگی سے دی ہے کوئی بات بغیر حوالہ نہیں، آخر میں اشاریہ اور مآخذ کی طویل فہرست بھی ہے، شروع میں مقدمہ بھی پر از معلومات اور بصیرت افروز ہے، زبان و بیان شگفتہ و سلیس اور رواں و دواں ہے۔

فکر اسلامی کی تشکیل جدید : مرتبہ جناب ضیاء الحسن فاروقی و ڈاکٹر مشیر الحق، تقطیع متوسط ضخامت ۴۰۸ صفحات، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد -/۵۵ پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

"فکر اسلامی کی تشکیل جدید" کے موضوع پر دسمبر ۱۹۷۶ء کے اواخر میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ذاکر حسین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے زیر اہتمام و انتظام ایک عظیم الشان سیمینار منعقد ہوا تھا جو تین روز تک چلا، صدر جمہوریہ فخر الدین علی احمد صاحب مرحوم نے اس کا افتتاح کیا اور مولانا قاری محمد طیب صاحب نے اس کی صدارت کی تھی۔ اس سیمینار کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں قدیم و جدید تعلیم یافتہ اور ارباب مدارس و اساتذۂ جامعات نے یکساں سرگرمی اور جوش سے شرکت کی، مقالات پڑھے اور بحث و گفتگو میں حصہ لیا، سیمینار میں جو مقالات پڑھے گئے تھے وہ اور ساتھ ہی جناب صدر کی تقریر جس کو انھوں نے بعد میں قلمبند کر کے بھیج دیا تھا، یہ سب اس کتاب میں یک جائی طور پر خوش سلیقگی سے مرتب و مہذب کر کے شائع کر دئے گئے ہیں، مقالات جن عنوانات پر تقسیم کئے گئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) تشکیلِ نو کیوں اور کیسے؟ (۲) تشکیلِ نو میں احادیثِ نبوی کی اہمیت (۳) تشکیلِ نو اور فقہ و اصول فقہ (۴) تشکیل نو تصوف و کلام کی روشنی (۵) روایت و تجدد (۶) نیا زمانہ، نئے مسائل (۷) مطالعہ شخصیات (۸) نئے نقطہائے نظر، اِن آٹھ عنوانات میں سے ہر عنوان کے ماتحت اوسطاً پانچ چھ مقالات ہیں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ جہاں تک اجتہاد اور اُس سے متعلق مختلف مباحث و مسائل کا تعلق ہے یہ مجموعۂ مقالات کس درجہ جامع اور اپنے موضوع کے چند در چند گوشوں اور پہلوؤں پر مشتمل اور حاوی ہے، اگرچہ بعض مقالات سرسری اور سطحی ہیں، اکثر و بیشتر پر مغز دیر از معلومات ہیں اور توجہ سے لکھے گئے ہیں، اس بنا پر یہ مجموعۂ مقالات قابل قدر اور ذاکر حسین انسٹیٹیوٹ کی یہ کوشش لائق تشکر و امتنان ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کتاب کا انگریزی اور عربی میں ترجمہ شائع کیا جائے۔

دفتر ششم مع خاتمہ: از مولانا قاضی سجاد حسین صاحب صدر مدرس

مدرسہ عالیہ فتح پوری، تقطیع متوسط، ضخامت ۵۳۶ صفحات، کتابت، طباعت، کاغذ اعلیٰ قیمت مجلد 25-5-50 پتہ: سب رنگ کتاب گھر، دہلی — ۶

جناب مترجم نے ستمبر ۱۹۶۶ء میں مثنوی مولانا روم کے دفتر اول کا اردو ترجمہ شائع کر کے جس اہم مگر کٹھن سفر کا آغاز کیا تھا، بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب مثنوی کا دفتر ششم شائع کر کے انھوں نے سفر کی آخری منزل بھی بخیر و خوبی طے کر لی ہے اور اس کی ظاہری و معنوی خصوصیات بھی بہمہ وجوہ وہی ہیں جو اس سے پہلے دفتروں کی تھیں، یعنی سلیس و عام فہم ترجمہ، حواشی میں مشکل الفاظ کے معانی، تلمیحات کی تشریح، اور کہیں اگر ضرورت ہو تو شعر کے مطلب کی وضاحت، شروع میں ایک معلومات افزا مقدمہ جس میں متعلقہ علمی اصطلاحات و رموز تصوف کی تشریح، ان وجوہ سے فارسی اور اردو کی معمولی استعداد رکھنے والا شخص، اگر توجہ سے پڑھے تو مولانا روم کے دریائے بیکران علم و معرفت سے جرعہ کش فیض ہو سکتا ہے۔

کاندھلہ ضلع مظفر نگر کے ایک فاضل اجل مفتی الٰہی بخش (از ۱۱۶۲ھ تا ۱۲۴۵ھ) نے دفتر ششم کا جو نامکمل رہ گیا تھا خاتمہ اس مہارت فن سے لکھا تھا کہ ہو بہو مولانا روم کا کلام معلوم ہوتا ہے قاضی صاحب نے اس خاتمہ کو بھی دفتر کا ایک جزو بنا لیا ہے اور مثنوی کے انداز پر ہی اس کا ترجمہ کیا اور حواشی لکھے ہیں؛ مقدمہ میں مختصراً مفتی صاحب کے حالات بھی لکھ دیے ہیں۔

خار و خس: از جناب سید امیر رضا کاظمی، تقطیع متوسط، ضخامت ۴۴ صفحات، کتابت و طباعت اعلیٰ، قیمت مجلد آٹھ روپیہ، پتہ: مکتبۂ ارتقا، ۵ - سی، سینٹرل اسٹریٹ، کلکتہ - ۱۶

رضا مظہری صاحب کی عمر مغربی بنگال گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم میں گذری ہے

لیکن شعر و ادب کا ذوق موروثی اور خاندانی ہے اور اعلیٰ تعلیم، مطالعہ اور برادرِ اکبر جناب جمیل مظہری کی صحبت و معیت نے اس ذوق کو جلا بخشی ہے اس لیے شعر اگرچہ کم کہتے ہیں، مگر جب کبھی کہتے ہیں بہت خوب کہتے ہیں، لفظی اور معنوی طور پر میر کا رنگ غالب ہے، ہلکا ہلکا درد، سوز و گداز، تپشِ غم، اور طرزِ بیان تیکھا اور روزمرہ کی زبان جو میر کے خصوصیاتِ کلام ہیں وہ یہاں بھی پائے جاتے ہیں، مگر شاعروں کے عام روبہ کے برخلاف انکساری کا یہ عالم ہے کہ مجموعۂ کلام کا نام خار و خس رکھا ہے، موصوف نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے، لیکن طبعاً وہ غزل کے شاعر ہیں، چنانچہ ان کی نظموں میں وہ بات نہیں جو غزلوں میں ہے، امید ہے کہ جدید شاعری کے اس بحرانی دور میں یہ شرابِ کہنہ بجامِ نو اربابِ ذوق میں مقبول ہوگی۔

غالب مدح و قدح کی روشنی میں حصۂ دوم:

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب تقطیع کلاں، ضخامت ۳۹۷ صفحات، کتابت و طباعت بہتر قیمت -/15 پتہ: دار المصنفین اعظم گڈھ۔

اس کتاب کے حصۂ اول پر تبصرہ ہو چکا ہے، اس دوسرے حصہ میں جن ادیبوں اور نقادوں کی غالب پر تحریروں کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے ان کی مجموعی تعداد چھتیس ۳۶ ہے جن میں مشہور اور بلند پایہ یہ حضرات ہیں: غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام عرشی، مالک رام، یوسف حسین خاں، آل احمد سرور، احتشام حسین، رشید احمد صدیقی، قاضی عبدالودود، خواجہ احمد فاروقی، عبادت بریلوی، سید عبداللہ، اسلوب احمد انصاری اور خلیل الرحمٰن اعظمی۔ لائق مرتب نے ان سب اور دوسرے حضرات نے غالب پر جو کچھ لکھا ہے اس کا تجزیہ کر کے ایک جگہ مرتب شکل میں پیش کر دیا ہے اور ساتھ ہی اس پر تبصرہ بھی کرتے گئے ہیں، یہ تبصرے بڑے دلچسپ اور فکر انگیز

ہیں، علی الخصوص شیخ اکرام، آل احمد سرور، کلیم الدین احمد، جوش ملسیانی، نیاز فتحپوری، اور شوکت سبزواری کی تحریروں پر انھوں نے جو تبصرے کئے اور ہلکی ہلکی جو چٹکیاں لی ہیں وہ بڑی معنی خیز بھی ہیں اور ادب لطیف کا ایک نمونہ بھی، اس حیثیت سے کوئی شبہ نہیں کہ یہ کتاب بڑی قابلِ قدر اور لائق مطالعہ ہے، غالب کی مدح یا قدح میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اُس کے بہت بڑے حصہ کا عطر اور لب لباب اس کتاب میں یکجا کر دیا گیا ہے اور چوں کہ اس پر دیدہ ورانہ تبصرہ بھی ہے اس لئے قاری ہر مصنف کے محاسن اور معائب سے واقف ہو جاتا ہے۔

تمام بحث و گفتگو کے بعد کتاب کے آخری صفحہ پر لائق مصنف نے اپنی جو ایک جامع رائے لکھی ہے، ہم حرف بحرف اُس سے متفق ہیں، لکھتے ہیں :-

"مولانا حالی نے اپنی طبیعت کی سنجیدگی، نظر کی ژرف بینی، فکر کی گہرائی اور تنقید نگاری کی نکتہ پروری (؟) سے غالب کی شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے میں جو اعتدال پسندی اور میانہ روی اختیار کی ہے وہی غالب کی شاعری کے تنقیدی لٹریچر کا راس المال ہے، اس کے بعد جو کچھ لکھا گیا، اس میں کچھ تو واقعی مفید اور قابلِ مطالعہ ہے مگر بہت کچھ یا تو تفریحی ہے، یا تنقید نگاری کی ذہنی مشق اور ورزش" ص ۳۹۷

اس میں شک نہیں کہ اگر آج غالب زندہ ہوتے تو اپنے کلام پر ان رنگ برنگ تنقیدوں کو پڑھ کر حسرت سے کہتے۔

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو؟

حج کمیٹی

اعلان بابت حج ۱۹۷۹ء

(۱) ۱۹۷۹ء میں حج کے مبارک سفر کا ارادہ رکھنے والوں سے حج کمیٹی نے درخواستیں طلب کی ہیں۔

(۲) اس سال مغل لائن کے دو جہاز "ایم۔ وی اکبر" اور "ایم وی نور جہاں" کے کل نو پھیرے ہوں گے اور ان کے ذریعہ انشاء اللہ پندرہ ہزار حاجی جدہ جا سکیں گے۔

(۳) کرایہ کی رقم کے ڈرافٹ کے ساتھ براہِ راست حج کمیٹی کو درخواست دی جائے۔

(۴) درخواست قبول کرنے کی آخری تاریخ **۲۶** / مئی ۱۹۷۹ء ہے اس تاریخ سے قبل درخواست حج کمیٹی کے دفتر، صابو صدیق مسافرخانہ، لوکمانیہ تلک مارگ بمبئی ۴۰۰۰۰۱ پہنچ جانی چاہیئے۔

(۵) درخواست کے فارم، کرایہ کی اور دیگر مطالبات کی تفصیل اور درخواست فارم کی خانہ پری کے متعلق مفصل ہدایات جو چھاپی گئی ہیں اپنے صوبے کی حج کمیٹی سے یا خط لکھ کر براہِ راست حج کمیٹی کے دفتر بمبئی سے حاصل کیجیے۔

(۶) درخواستوں کی وصولی کی تاریخ گذر جانے کے بعد ضرورت ہو تو قرعہ اندازی ہوگی اور قرعہ میں کامیاب ہونے والے خوش نصیب عازمین حج کو دفتر سے اس کی اطلاع دی جائے گی۔

(۷) درخواست کے فارم صوبائی حج کمیٹیوں کے دفتر سے اور خط لکھنے پر براہِ راست حج کمیٹی کے دفتر بمبئی سے ملیں گے۔ درخواست اس فارم پر ہو جو حج کمیٹی نے جاری کیا ہے کسی اور فرد یا ادارے کو درخواست فارم چھاپنے کی یا درخواست وصول کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

(۸) چوں کہ ابھی بہت سے بھائی بہن حرف شناس نہیں ہیں اس لئے پڑھے لکھے بھائیوں سے درخواست ہے کہ یہ اطلاع عازمین حج تک پہنچائیں اور اس کام میں ان کی مدد کریں۔

قاضی محمد امین

ایگزیکیٹو آفیسر

حج ۱۹۷۹ء - عارضی پروگرام

حج سے قبل روانگی				حج کے بعد واپسی			
نمبر شمار	جہاز	بمبئی سے روانگی	جدہ میں آمد		جہاز	جدہ سے روانگی	بمبئی میں آمد
	قبل رمضان						
۱	ایم - وی - نورجہاں	۱۰ر جولائی ۷۹ء	۱۹ر جولائی ۷۹ء	۱	ایم - وی - نورجہاں	۸ر نومبر ۷۹ء	۱۵ر نومبر ۷۹ء
۲	ایم - وی - اکبر	۱۴ر جولائی ۷۹ء	۲۳ر جولائی ۷۹ء	۲	ایم - وی - اکبر	۱۰ر نومبر ۷۹ء	۱۸ر نومبر ۷۹ء
	اوائل رمضان						
۳	ایم - وی - نورجہاں	۳۱ر جولائی ۷۹ء	۹ر اگست ۷۹ء	۳	ایم - وی - نورجہاں	۲۵ر نومبر ۷۹ء	۲ر دسمبر ۷۹ء
	بعد رمضان						
۴	ایم - وی - اکبر	۳۰ر اگست ۷۹ء	۸ر ستمبر ۷۹ء	۴	ایم - وی - اکبر	۲۸ر نومبر ۷۹ء	۷ر دسمبر ۷۹ء
۵	ایم - وی - نورجہاں	۸ر ستمبر ۷۹ء	۱۵ر ستمبر ۷۹ء	۵	ایم - وی - نورجہاں	۱۲ر دسمبر ۷۹ء	۱۹ر دسمبر ۷۹ء
۶	ایم - وی - اکبر	۱۹ر ستمبر ۷۹ء	۲۷ر ستمبر ۷۹ء	۶	ایم - وی - اکبر	۱۷ر دسمبر ۷۹ء	۲۶ر دسمبر ۷۹ء
۷	ایم - وی - نورجہاں	۲۵ر ستمبر ۷۹ء	۲ر اکتوبر ۷۹ء	۷	ایم - وی - نورجہاں	۲۹ر دسمبر ۷۹ء	۵ر جنوری ۸۰ء
۸	ایم - وی - اکبر	۸ر اکتوبر ۷۹ء	۱۶ر اکتوبر ۷۹ء	۸	ایم - وی - اکبر	۵ر جنوری ۸۰ء	۱۲ر جنوری ۸۰ء
۹	ایم - وی - نورجہاں	۱۲ر اکتوبر ۷۹ء	۲۰ر اکتوبر ۷۹ء	۹	ایم - وی - نورجہاں	۱۶ر جنوری ۸۰ء	۲۳ر جنوری ۸۰ء

جلد ۸۴ | رجب المرجب ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ جون ۱۹۷۹ء | شمارہ ۶

فہرست مضامین

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نظرات

افسوس ہے ہماری بزم علم و فضل کی ایک اور شمع روشن بجھ گئی، یعنی ۲۳ رمئی کو مولانا سید فضل اللہ الگیلانی نے ۸۷ برس کی عمر میں علی گڑھ میں وفات پائی اور یونیورسٹی کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمہ جن کا سلسلۂ نسب باپ کی طرف سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی تک پہونچتا ہے مولانا کے دادا تھے، والد یعنی مولوی احمد علی کا انتقال جوانی میں ہو گیا تھا جب کہ مولانا صرف سات برس کے تھے اس لئے دادا نے آپ کو تربیت میں لے لیا اور مونگیر میں رہ کر آپ نے علوم دینیہ واسلامیہ کی تکمیل کی، بعض کتابوں کا درس مفتی عبداللطیف سے بھی لیا جو بعد میں آپ کے خسر بھی ہو گئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے شعبۂ دینیات میں لیکچرر ہوئے۔ ۱۹۵۳ء یا ۱۹۵۵ء میں ریڈر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد آپ نے کاروبار شروع کر دیا اور ملازمت کبھی نہیں کی۔

مولانا علم و عمل کے اعتبار سے سلف صالحین کا نمونہ تھے، استعداد نہایت پختہ مطالعہ بیحد وسیع اور نظر دقیق تھی۔ ان کو سب علوم سے یکساں مناسبت تھی، مطالعہ اور درس کے دھنی تھے، لکھتے کم تھے، مگر جب کبھی لکھا بہت خوب لکھا، چنانچہ امام بخاری کی کتاب ادب المفرد کی جو شرح دو جلدوں میں مرحوم نے لکھی اور مدینہ سے شائع ہوئی ہے۔ تحقیق اور علم اور دقت نظر کا شاہکار ہے، اس کے علاوہ چند چھوٹے بڑے رسالے جو بعض جزئی مسائل پر لکھے گئے ان میں بھی تحقیق کی یہی شان ہے، عملاً نہایت عابد و زاہد اور صاحب اوراد و وظائف

جماعت سے نماز ادا کرنے کا اہتمام سخت معذوری کی حالت میں بھی کرتے تھے، اخلاق و عادات کے اعتبار سے بڑے متواضع، خوش مزاج، باوضع اور قلندر منش انسان تھے۔ ضرورتمندوں کی مدد کرنے میں انہیں خوشی محسوس ہوتی تھی، برسوں سے دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے ممبر تھے اُس کے جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے اور کارروائی میں توجہ سے حصہ لیتے تھے، پندرہ سولہ برس سے حیدرآباد کی سکونت ترک کر کے مستقلاً علی گڈھ میں مقیم ہو گئے تھے جہاں ان کی دو صاحبزادیاں یونیورسٹی زنانہ کالج کے شعبۂ دینیات میں علی الترتیب ریڈر اور لیکچرر ہیں اور اپنے خاندانی روایات کو بوجوہ احسن قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء۔ یہاں ان کی زندگی مکمل گوشہ نشینی کی تھی۔ مطالعہ اور درس ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس کے علاوہ کسی اور چیز سے کوئی سروکار نہ تھا۔ برہان کے بڑے قدردان تھے، شروع سے اس کے خریدار تھے اور بڑے شوق سے اس کا مطالعہ پابندی سے کرتے تھے، ان کی وفات علم و ادب، زہد و ورع اور حسن عمل و اخلاق کی دنیا کا عظیم حادثہ ہے۔ رَحِمَهُ اللهُ رَحْمَةً وَّاسِعَةً

---

۱۰ اور ۱۱ مئی کی درمیانی شب میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں جو واقعات پیش آئے اس میں شک نہیں وہ بیحد افسوسناک اور لائق مذمت ہیں، لیکن اس کو محض ایک اتفاقی واقعہ ہی سمجھنا چاہیئے جو کبھی دو حقیقی بھائیوں میں بھی کسی ایک بات پر اشتعال کے باعث پیش آجاتا ہے اور اس کی مستقل کوئی حیثیت نہیں ہوتی، ورنہ دنیا جانتی ہے کہ آزادی کے بعد سے اب تک ملک میں ہزاروں فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے ہیں جن میں مسلمانوں کے نہایت شدید اور عظیم جانی و مالی نقصانات ہوئے ہیں، لیکن مسلم یونیورسٹی کی ہندو مسلم یکجہتی و یگانگت کی خوشگوار فضا کبھی ان فسادات سے متاثر نہیں ہوئی تھی۔ چند ماہ قبل علی گڈھ شہر میں سخت فساد ہو چکا ہے اس زمانہ میں یونیورسٹی اس فساد کے اثر سے کس طرح محفوظ رہی اور نہایت جانفشانی اور تندہی سے بلا امتیاز مذہب و ملت شہر میں

جو ریلیف ورک ہوا بڑے بڑے لیڈروں اور انگریزی اخبارات نے اس کا اعتراف کیا اور داد دی ہے، علی گڑھ کے بعد جمشید پور میں نہایت سخت اور بھیانک فساد ہوا، مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا جمشید پور پہونچ کر ریلیف کا کام کرتے رہے، لیکن یونیورسٹی کی فضا کو اس سے متاثر نہیں ہونے دیا۔ یہ وہ حقائق اور واقعات ہیں جن کی تکذیب یا تغلیط مسلمانوں کا بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں کر سکتا۔

لیکن فرقہ پرستوں نے ان حقائق کا اعتراف اس طرح کیا کہ ۹ رمئی کی صبح کو ایک سازش کے ماتحت منظم طریقہ پر داوری اسٹیشن کے قریب یونیورسٹی کے طلباء پر بے محابا حملہ کر دیا جس کے نتیجہ میں ایک خاصی تعداد زخمی ہو گئی، اس واقعہ سے طلبا کا مشتعل ہونا ایک امر طبعی تھا، لیکن یونین کے پریذیڈنٹ کی طرف سے فوراً ایک اپیل شائع ہوئی جس میں طلبا سے پُرامن رہنے کی پُرزور اپیل کی گئی تھی، اس اپیل کا اثر یہ ہوا کہ ۱۰ر تاریخ کا پورا دن گذر گیا اور کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔ لیکن جب شام کو بغیر کسی وجہ جواز کے پی اے سی یونیورسٹی کے علاقہ میں اچانک آ دھمکی تو طلبا نے اس کو بجا طور پر اپنی توہین سمجھا اور مطالبہ کیا کہ پولیس اس علاقہ سے ہٹ جائے۔ ایک مقررہ وقت تک ہٹ جانے کا وعدہ کرنے کے باوجود جب پولیس نے یونیورسٹی کیمپس نہیں چھوڑا تو طلبا زخم خوردہ تو تھے اور جوانی کا گرم خون ان کی رگوں میں سرد نہیں ہوا تھا اب اُن کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور وہ پولیس سے مقابلہ کرنے کے لئے باہر نکل پڑے اس لئے دراصل طلبا کا مقابلہ پولیس سے تھا، مگر جب ہنگامۂ دار و گیر برپا ہوتا ہے تو اچھے بُرے کی تمیز نہیں ہوتی اور گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتے ہیں۔ چنانچہ سخت افسوس ہے کہ اس لپیٹ میں وہ لوگ بھی آ گئے جو اس علاقہ کے پُرامن شہری اور یونیورسٹی برادری کے ہی افراد تھے۔

بس یہ ہے نفسِ واقعہ۔ ضرورت ہے کہ واقعہ کی نوعیت جو ہنگامی ہونے کی ہے اُس کو اسی حیثیت سے دیکھا جائے، ورنہ اگر اس واقعہ کو بنیاد بنا کر یونیورسٹی میں فرقہ وارانہ تحفظات کا سوال اٹھایا گیا، جیسا کہ فرقہ پرست ہندو کر رہے ہیں تو پھر مسلمان بھی آئے دن کے فسادات کی بنیاد پر پورے ملک میں اپنے تحفظات کا سوال اٹھانے میں حق بجانب ہوں گے۔

ایک عہد آفریں شخصیت ۔ مولانا سید جعفر علی بستوی رح

مولانا عتیق احمد بستوی اُستاذ مدرسہ امدادیہ مراد آباد

مولانا ابو الحسن علی ندوی سید احمد شہید رح اور ان کی تربیت یافتہ جماعت کے بارے میں لکھتے ہیں "سید احمد صاحب کا سب سے بڑا تجدیدی کارنامہ آپ کی سب سے بڑی کرامت اور آپ کی زندہ یادگار آپ کی پیدا اور تربیت کی ہوئی وہ بے نظیر جماعت ہے، جس کی مثال اتنی بڑی تعداد میں اور اس جامعیت اور کاملیت کے ساتھ خیر القرون کے بعد بہت کم ملتی ہے۔ ان کی صحیح اور محتاط تعریف یہ ہے کہ وہ تیرھویں صدی میں صحابہ کرام کے نمونہ تھے اور یہ کسی مسلمان فرد یا جماعت کے لئے آخری تعریف ہے۔ یہ لوگ بلا مبالغہ عقائد۔ اعمال و اخلاق، توحید، اتباعِ سنت۔ شریعت کی پابندی عبادت و تقویٰ سادگی و تواضع، ایثار و خدمتِ خلق، غیرتِ دین جوشِ جہاد و شہادت، صبر و استقامت میں مہاجرین کے نمونہ تھے۔[1]

سید صاحب مرحوم کی جماعتِ مجاہدین میں سینکڑوں ایسے علماء و مشائخ تھے، جو اپنی اپنی جگہ پر آسمانِ رشد و ہدایت کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ ان میں سے ہر ایک میں علم و عمل۔ اخلاص و علمیت کی وہ بے پناہ قوت تھی جس کے ذریعہ وہ لوگ اپنے اپنے معاشرہ میں صالح انقلاب برپا کر دیتے تھے۔ لیکن سورج کے سامنے جس طرح چاند اور ستاروں کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے اسی طرح سید صاحب رح کے حلقے میں شریک ہو کر یہ جبالِ علم و عمل ادنیٰ خادم اور مرید معلوم ہوتے تھے۔ ان پاک طینت مخلص مریدوں اور مستفیدوں نے اپنے پیر کے حلقے میں شریک ہونے

---

[1] سیرت سید احمد شہید جلد دوم ص ۵ طبع چہارم پاکستان

کے بعد اپنے کو اس طرح مٹادیا کہ تاریخ میں ان کا مستقل کوئی وجود نہیں رہا۔ سید احمدؒ کے ادنیٰ نیازمند کی حیثیت سے تاریخ کے صفحات میں ان کا ذکر آتا ہے۔ خود ان کی علمی دینی کیا حیثیت تھی؟ سید صاحب کے حلقہ میں شریک ہونے سے پہلے اور سید صاحبؒ سے جدا ہونے کے بعد انھوں نے کیا کارنامے انجام دیئے؟ ان سوالات کے جوابات تاریخ کے صفحات میں نہ ہونے کے برابر ہیں

سید احمد شہیدؒ کی عہد آفریں قد آور شخصیت، مذھبی علمی کارناموں، مجاہدانہ سرگرمیوں کے بارے میں جتنا لکھا جائے کم ہے لیکن اس کے ساتھ سید صاحب کے خلفاء مریدین، رفقاء کے حالات اور کارناموں کی ترتیب وتدوین پر بھی بھرپور توجہ دینی چاہیئے کیونکہ اس سے سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی پڑے گی۔ اور موصوف کی عظمت اور رفعت کا اندازہ ہوگا

مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے اس موضوع پر کام کیا ہے۔ "جماعت مجاہدین" اور "سرگذشتِ مجاہدین" میں بہت سے حضرات کے تھوڑے بہت حالات جمع کردیئے ہیں لیکن یہ کام ابھی بہت تشنہ ہے۔ مورخین ومحققین کو اس طرف توجہ دینی چاہیئے۔

اس مختصر مضمون میں سید احمد شہید کی جماعت مجاہدین کے ایک سرگرم رکن مولانا سید جعفر علی صاحب کا ذکر کیا جارہا ہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں خاطر خواہ مواد دستیاب نہیں ہوسکا، اور تدریسی مصروفیات کی وجہ سے زیادہ تلاش وجستجو کا موقع بھی نہیں ملا لیکن جو کچھ معلومات فراہم ہوسکیں قارئین برھان کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں۔ شاید کوئی مورخ ومحقق ہمت کرکے موصوف کی جامع سوانح مرتب کرنے پر کمربستہ ہوجائے اور یہ اہم کام کرگذرے۔

"سید احمد شہید" اور "سیرت سید احمد شہید" میں مولانا جعفر علی بستوی کا جستہ جستہ ذکر موجود ہے مولانا غلام رسول مہر نے "جماعت مجاہدین" میں موصوف کا ایک باب

میں قدرے تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ صاحب نزہۃ الخواطر نے بھی ان کا اجمالی تذکرہ کیا ہے مولوی عبدالکریم اودھی مرحوم نے اپنی کتاب "گم گشتہ حالاتِ اجودھیا" میں مولانا جعفر علیؒ اور ان کے خاندان کا تذکرہ کیا ہے "منظورۃ السعداء" کا جستہ جستہ مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا، اس سے بعض باتیں اخذ کی گئیں۔ انھیں متفرق معلومات کو مرتب کر کے یہ مقالہ تیار کیا گیا ہے۔ آخر میں مولانا موصوف کا ایک طویل مکتوبِ گرامی نقل کیا گیا ہے جس سے ان کی علمی بصیرت اور فقہی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔

سید جعفر علی کا خاندان | مولانا غلام رسول مہر مولانا سید جعفر علی نقوی کے خاندان کے ایک فرد سید عبدالسلام۔ محلہ بشیر گنج کان پور) کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔

"۱۔ آٹھویں صدی ہجری میں اس خاندان کا پہلا فرد جس کا نام سید جلال الدین تھا۔ ہندوستان آیا اور اس کے افراد اجودھیا کے محلہ سید واڑہ میں مقیم رہے۔ تاریخ اجودھیا میں اس خاندان کا ذکر ملتا ہے۔

۲۔ غالباً گیارھویں صدی ہجری میں اس کی ایک شاخ مجھوا میں مقیم ہوئی جو پہلے گورکھپور میں شامل تھا آج کل بستی میں ہے"۔[۱]

مولوی عبدالکریم اودھی مرحوم مولف "گم گشتہ حالات اجودھیا" اس خاندان کے بارے میں لکھتے ہیں "اس مسجد کے جنوب میں بہت سی قبریں املی کے درخت کے نیچے ہیں منجملہ اس کے ایک پختہ احاطہ میں میر فتح علی صاحب کی قبرگاہ ہے جو دلیغ کلاں کے نام سے مشہور تھے۔ میر حیدر علی کے فرزندوں میں میر فتح علی صاحب و میر دوست علی صاحب تھے۔

میر صاحب موصوف کی اولاد نہایت ذی علم اور لائق تھی علاوہ اس کے میر فتح علی کی اولاد سے میر غضنفر علی صاحب تھے۔ میر محمد علی صاحب و میر بزرگ علی صاحب بھی نہایت عالم و فاضل تھے۔ اکثر قصائد ان صاحبوں کے مشہور ہیں۔ میر دوست علی صاحب کی اولاد سے احمد علی صاحب و میر قطب علی صاحب تھے۔ قطعہ تاریخ میر حیدر علی صاحب۔

---

[۱] جماعت مجاہدین ص ۳۱۰

چہ خوش بود سید عالی تبار - چو نام علی حیدر نامدار
ہفتاد و ہفت سال عمر گذشت - بعصمت بماندہ بعزت برفت
۱۲۷۷ھ

تھوڑے عرصے سے اس خاندان کی اولاد بوجہ زمینداری کے موضع میر پور مجھوا پرگنہ ضلع بستی میں آباد ہو گئی ہے مولوی جعفر علی صاحب مرحوم کے فرزند اور میر فتح علی صاحب کے نواسے اور میر ودست علی صاحب کے پوتے تھے۔ مولوی جعفر علی صاحب حضرت سید احمد صاحب بریلوی کے خلیفہ تھے۔ اور ان کے اور مولانا اسمٰعیل صاحب کے سفر میں ہمرکاب اور منشی قافلہ تھے۔ نثر کی تحریر میں مہارت اور دستگاہ اچھی رکھتے تھے۔ [۱]

مولانا سید جعفر علی صاحب مرحوم سادات کے ایک ممتاز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ان کا خاندان ابتداء ہی سے علم و عمل، تقویٰ و طہارت میں ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ ان کے والد بزرگوار میر قطب علی صاحب اپنے دور کے جید عالم اور صاحب نسبت بزرگ تھے چنانچہ شیخ محمد اسحاق گورکھپوری (جو شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے معتقد تھے اور انھیں کے فرمانے پر سید احمد شہید سے بیعت ہوئے تھے) کو جب سید احمد شہید نے خلافت دینی چاہی تو انھوں نے عرض کیا "میں قرآن مجید اور چند ضروری مسائل دین کے سوا کچھ نہیں جانتا منصب خلافت اسے ملنا چاہیئے جسے دین کا وسیع علم حاصل ہو۔ سید صاحب نے بے تکلف فرمایا کہ میرا علم بھی اسی قدر ہے۔ شیخ اسحاق نے عرض کیا کہ ہمارے وطن میں ایک بزرگ عالم دین ہیں جو ہر وقت یادِ خدا میں مصروف رہتے ہیں۔ انھیں خلافت عطا فرمانا مناسب ہو گا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ میں آپ کو بھی خلیفہ بناتا ہوں اور اس بزرگ کو ساتھ لائیں گے تو انھیں بھی خلافت دے دوں گا۔ شیخ کا اشارہ قطب علی کی طرف تھا۔ [۲]

"قطب علی سترہ آدمیوں کو لے کر سید صاحب کے پاس اس زمانہ میں تکیہ تشریف پہونچے جب آپ حج سے واپس آئے تھے۔ اس قافلے میں ان کے چھوٹے بیٹے سید حسن علی بھی شامل تھے۔ بڑے بیٹے سید جعفر علی صاحب منظورۃ السعداء" "اس وقت لکھنؤ میں تعلیم

---

[۱] گمگشتہ حالات اجودھیا ص ۵۳-۵۴ [۲] جماعت مجاہدین صد ۱۱

پا رہے تھے وہ علالت کے باعث ساتھ نہ جا سکے۔

سید قطب علی بن کبیر الحسن تھے۔ رائے بریلی سے ایک کوس کے فاصلہ پر زحمتِ سفر کے باعث بیمار پڑ گئے؛ تکیہ شریف پہونچے تو ان کی مہمانداری سید صاحب کے بھتیجے سید محمد یعقوب کے سپرد ہوئی۔ ایک مہینہ ٹھہرے رہے پھر سید صاحب نے مولانا عبدالحی صاحب سے خلافت کی سند لکھوا دی۔

سید صاحب کے قصد ہجرت کی شہرت ہوئی تو سید قطب علی بھی معیت کے لئے تیار ہو گئے۔ سید صاحب نے ضعیفی کے پیش نظر انھیں روک دیا اور فرمایا کہ دعا کرتے رہیئے۔ اور ہمارے بلاوے کا انتظار کیجئے امتثال امر میں رک گئے سید صاحب کی شہادت کی خبر سُن کر بہت روئے۔ مولوی سید جعفر علی نقوی کا بیان ہے کہ باربار فرماتے تھے: کاش میرا بیٹا (سید جعفر علی) مرجاتا اور سید صاحب زندہ رہتے۔ نیز فرماتے تھے کہ سید صاحب کے ہاتھوں غلبۂ اسلام دیکھنے کی آرزو تھی۔ اب میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ غالباً ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۳ء) میں وفات پائی۔[۱]

ان کی والدہ محترمہ ایک دین دار اور پارسا خاتون تھیں۔ ان کی دینداری کا اندازہ لگانے کے لئے صرف یہ واقعہ نقل کرنا کافی ہے کہ جب سرحد کے جہاد میں شریک ہونے کے بارے میں دونوں بھائیوں (سید حسین علی، سید جعفر علی) میں اختلاف ہوا تو آخر کار معاملہ بوڑھی ماں کے پاس لے گئے تاکہ وہ فیصلہ کردیں۔ اس خدا دوست خاتون نے کہا کہ جو جانا چاہے اسے روکا نہیں جا سکتا جو نہ جائے وہ گنہگار ہوگا۔ تم دونوں بھائی آپس میں فیصلہ کرو ہم اپنی عاقبت کیوں خراب کریں۔[۲]

ولادت اور تعلیم و تربیت

بھوا میر (ضلع بستی) میں مورخہ ۲۰ رمضان ۱۲۱۸ھ کو آپ کی ولادت ہوئی[۳]

۱۔ جماعت مجاہدین ص ۱۹۴، ۱۹۳ - ۲۔ ایضاً ص ۱۹۲ - ۱۹۵ - ۳۔ ص ۲۱۳، وصایا ص ۲

جماعت مجاہدین میں ایک جگہ [۱] ان کا سن ولادت ۱۲۱۲ھ لکھا گیا ہے، غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے کیونکہ پھر اسی کتاب میں دوسری جگہ تحریر ہے "سید جعفر علی نے رمضان المبارک ۱۲۸۸ھ (نومبر ۱۸۷۱ء) میں وفات پائی۔ تاریخ پیدائش ۱۲۱۸ھ تھی اس لئے ستر برس کی عمر ہوئی۔ مولانا نے وفات سے چند روز پہلے جو وصایا تحریر کیے تھے اس میں ہے "عمر فقیر اب ستر کو پہونچی، موت یقینی چیز ہے۔ اسی کا انتظار ہے جو دن پاتا ہوں غنیمت ہے [۲]۔ اس عبارت سے بھی ۱۲۱۸ھ کے سن ولادت ہونے کی تائید ہوتی ہے۔

مولانا کی تعلیم و تربیت کے تفصیلی حالات دستیاب نہیں ہوئے۔ مولانا غلام رسول مہر نے صرف اتنا لکھا ہے کہ "ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں پائی پھر لکھنؤ جاکر علوم کی تکمیل کی [۳]"

قرین قیاس یہی ہے کہ مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی ہو گی خود مولانا کے والد ماجد میر قطب علی مرحوم اس دور کے جید عالم اور صاحبِ نسبت بزرگ تھے۔ علم و فضل میں پشتہا پشت سے آپ کا خانوادہ ممتاز مقام کا مالک تھا ہاں تکمیل علوم آپ نے کہاں کس سے کی؟ اس بارے میں مختلف روایتیں معلوم ہوئی ہیں۔

مولانا محمد مرتضیٰ صاحب نقوی نے (جو مولانا جعفر علی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں) وصایا کے شروع میں خاندانی روایات کی روشنی میں مولانا جعفر علی مرحوم کا جو تذکرہ کیا ہے اس میں لکھتے ہیں "آپ بغرض حصول علوم مکان سے چل نکلے۔ اور براہ راست دہلی پہونچے اور زیر نگرانی حضرت مولانا الشاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی حضرت مولانا الشاہ محمد اسمٰعیل صاحب شہید رح کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے چند سال رہ کر درسیات سے فراغت حاصل کی اور حضرت مولانا سید احمد بریلوی سے بیعت ہو کر خلافت سے سرفراز ہوئے" [۴]

---

[۱] جماعت مجاہدین صد ۱۹۴۔ سید احمد شہید جلد اول صد ۱۴۱ [۲] وصایا صد ۴
[۳] جماعت مجاہدین صد ۱۹۴ [۴] وصایا صد ۲

جماعت مجاہدین کے ضمیمہ ۳ میں مولانا جعفر علی رح صاحب کے متعلق ان کے خاندان کے ایک فرد سید عبدالسلام (محلہ شبیر گنج کانپور) کے حوالہ سے مولانا غلام رسول مہر نے جو چند باتیں درج کی ہیں ان میں سے ایک بات یہ بھی ہے "شیخ عبدالسلام فرماتے ہیں کہ خاندانی روایتوں میں شاہ عبدالعزیز رح سے تعلیم پانے کا بھی ذکر ہے، بتایا جاتا ہے کہ اجازت لیے بغیر چپ چاپ گھر سے نکل کر دہلی پہونچ گئے تھے۔ گھر سے جتنے خط ان کے پاس گئے وہ سب بند کے بند پڑے رہے تعلیم مکمل کر چکنے کے بعد انھیں کھول کر پڑھا۔" ؎۱

مولانا عبدالحی الحسنی رح نے نزہتہ الخواطر میں لکھا ہے

اخذ عن الشیخ اسماعیل بن عبد الغنی ؎۲ (شاہ اسماعیل رح سے علم حاصل کیا)

مہر صاحب ان روایتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق یہ روایت صحیح نہیں ہے سید جعفر علی نے تعلیم کی تکمیل لکھنؤ میں کی وہ بہ سلسلہ جہاد امب؟ پہونچے (رمضان ۱۲۴۵ھ) تو پہلی مرتبہ سید صاحب کو دیکھا۔ البتہ ان کے والد سید قطب علی اور بھائی سید حسن علی تکیہ پہونچ کر سید صاحب سے بیعت کر چکے تھے ؎۳

(منظورۃ السعداء) کا مطالعہ کرنے سے مہر صاحب کی رائے کی تائید ہوتی ہے مولانا شہید رح سے ملاقات کی جو کیفیت خود مولانا جعفر علی نے "منظورہ" میں تحریر کی ہے اس سے بھی یہی بات مترشح ہوتی ہے کہ مولانا جعفر علی صاحب غائبانہ مولانا اسماعیل صاحب شہید سے اچھی طرح واقف تھے اور ان کی زیارت و ملاقات کے لئے بیچین تھے۔ غرضیکہ مولانا جعفر علی صاحب نے باضابطہ تعلیم کی تکمیل لکھنؤ میں کی۔ ہاں سرحد پہنچنے کے بعد شاہ اسماعیل شہید رح سے استفادہ اور ان کی شاگردی کا موقعہ ملا۔ شاہ صاحب کی مولانا جعفر علی پر خاص توجہ تھی انشاء اللہ اپنے موقعہ پر اس کا تفصیلی تذکرہ آئے گا۔

آپ کے اساتذہ | لکھنؤ میں آپ نے جن اساتذہ سے علوم کی تکمیل کی، ان میں سے صرف ایک

؎۱ جماعت مجاہدین ص ۳۱۱ ؎۲ نزہتہ الخواطر ص ۱۱۹/۷ ؎۳ جماعت مجاہدین ص ۳۱۱

کا نام ہم کو معلوم ہو سکا وہ ہیں مولانا حیدر علی۔ لیکن یہ مولانا حیدر علی کون سے ہیں؟ اس کے بارے میں کوئی قطعی بات کہنا دشوار ہے۔ اولاً ہم مولانا حیدر علی (استاذ مولانا جعفر علی) کے بارے میں متفرق معلومات درج کرتے ہیں۔ پھر ان کو متعین کرنے کی کوشش کریں گے۔

(۱) مولانا حیدر علی استاذ مولانا جعفر علی لکھنؤ میں کافی عرصہ قیام پذیر رہے۔ کیوں کہ مولانا جعفر علی جب جہاد سے واپسی میں لکھنؤ تشریف لائے، اس وقت بھی مولانا حیدر علی لکھنؤ میں مقیم تھے" لکھنؤ میں سید جعفر علی نقوی اپنے استاذ مولوی حیدر علی سے بھی ملے وہ رسالدار فقیر محمد خاں کی سرکار میں ملازم تھے۔ سید صاحب کو یاد کر کے بہت روئے۔ سید جعفر علی لکھتے ہیں کہ انھیں نے شہادت کی تفصیلات مجھ سے سن کر رسالدار کو سنائیں"[۱]

(۲) مولانا جعفر علی کے استاد مولانا حیدر علی کو ردِ روافض کے موضوع سے خاص شغف تھا۔" اسی اثناء میں سید جعفر علی کو ایک مقدمے کے سلسلے میں گورکھپور جانا پڑا۔ وہاں سے لوٹے تو ان کے استاذ مولوی حیدر علی کا خط آیا پڑا تھا کہ فقیر محمد خاں رسالدار کو ردِ روافض میں بعض رسائل و کتب کی تصحیح کے لئے ایک آدمی کی ضرورت ہے۔ یہ خدمت قبول کر لو۔ لیکن سید جعفر علی سید صاحب کی خدمت میں پہنچنے کا عزم صمیم کر چکے تھے اس لئے مولوی حیدر علی کو معذرت لکھ بھیجی"[۲]

چند واقعات کے سنین درج کیے جاتے ہیں تاکہ مولانا حیدر علی کی تعیین میں آسانی ہو۔

(۱) سید احمد شہید رح کی سفر حج سے واپسی ـــــــــ ۱۲۳۹ھ
(۲) رائے بریلی میں قیام ـــــــــ سنہ ۱۲۳۹ھ
(۳) جہاد کے لئے روانگی ـــــــــ سنہ ۱۲۴۱ھ
(۴) مولانا جعفر علی کی جہاد سے واپسی ـــــــــ سنہ ۱۲۴۶ھ

تیرھویں صدی ہجری میں حیدر علی نام کے چند علماء کا سراغ لگتا ہے۔

---

[۱] سید احمد شہید جلد ۲ ص ۴۵۲ [۲] جماعت مجاہدین ص ۱۹۵

حیدر بن مبین لکھنوی - موصوف لکھنؤ کے باشندے تھے، ۱۲۵۶ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ ابتداءً لکھنؤ میں قیام تھا - نواب سعادت علی خاں ان کو وظیفہ دیا کرتے تھے۔ نواب صاحب کی وفات کے بعد بعض دوسرے امراء ان کی طرف متوجہ ہوئے، انھیں ہدایا پیش کرتے رہے - لیکن وزیر سے مذہب کے بارے میں ان کا مناقشہ ہوگیا اور وزیران کے درپے آزار ہوگیا - آخر کار انھوں نے ۱۲۴۰ھ میں لکھنؤ چھوڑ دیا - کچھ دنوں بعد حیدر آباد میں ان کی باریابی ہوئی - اور وہیں ۱۲۵۶ھ میں وفات پائی[1]

یہ مولانا حیدر علی سید جعفر علی کے استاذ نہیں ہوسکتے - کیونکہ پہلے معلوم ہوچکا ہے کہ سید جعفر علی جب جہاد سے ۱۲۴۶ھ ۱۲۴۷ھ میں لکھنؤ واپس ہوئے ہیں اس وقت بھی ان کے استاذ لکھنؤ میں موجود تھے، جب کہ مولانا حیدر علی بن مبین لکھنوی ۱۲۴۰ھ میں لکھنؤ ترک کر چکے تھے

(۲) مولانا حیدر علی کاکوروی - پیدائش ۱۲۰۵ھ - وفات ۱۲۸۴ء - یہ کاکوری کے باشندہ تھے، وہیں تعلیم حاصل کی اور اپنے خاندان کی مسندِ خلافت پر فائز ہوئے[2] ان کا لکھنؤ میں طویل قیام اور سلسلۂ تعلیم و تعلم ثابت نہیں، اس لئے یہ بھی مولانا سید جعفر علی کے استاذ نہیں ہوسکتے -

(۳) مولانا حیدر علی سندیلوی — مشہور منطقی مصنف حمد اللہ سندیلوی کے صاحبزادے تھے - زیادہ تر سندیلہ میں ان کی نشو ونما ہوئی، قصبہ سندیلہ میں ۱۲۲۵ھ میں ان کا[3] انتقال ہوا - مولانا جعفر علی صاحب کی پیدائش ۱۲۱۸ھ کی ہے - گویا ان کی وفات کے وقت مولانا جعفر علی کی عمر صرف سات سال کی تھی لہذا شاگرد ہونے کا سوال نہیں پیدا ہوتا -

(۴) مولانا حیدر علی رامپوری ثم ٹونکی — آپ کی پیدائش دہلی میں ہوئی - بچپن میں

---

[1] نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۱۵۱ - ۱۵۲ [2] نزہتہ الخواطر ص ۱۵۲

[3] - نزہتہ الخواطر ص ۱۵۲ - ۱۵۳ - تذکرہ علماء ہند ص ۱۷۳ ۱۷۴

رامپور چلے گئے، اور ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی، اس کے بعد لکھنؤ جاکر کچھ عرصہ ملا مبین کی شاگردی اختیار کی، پھر دہلی گئے اور شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین رحمہم اللہ کے حلقۂ درس میں شامل ہوگئے۔ ان کا قیام رامپور، کلکتہ، اور ٹونک میں رہا۔ لکھنؤ میں قیام کا ذکر نہیں ملتا۔ ستر سال کی عمر پاکر ۱۲۷۳ھ میں ٹونک کے اندر آپ کا انتقال ہوا[1] سید احمد شہید سے گہرا تعلق تھا۔ سید صاحب کے مرید و خلیفہ تھے۔ ان کے نام سید صاحب کے بہت سے مکاتیب ہیں۔ یہ بھی مولانا جعفر علی کے استاذ نہیں معلوم ہوتے، کیونکہ تاریخوں میں ان کا لکھنؤ میں تدریس کے لئے قیام مذکور نہیں ہے۔

(۵) مولانا حیدر علی فیض آبادی ــــ آپ کی ولادت اور نشو و نما فیض آباد میں ہوئی فیض آباد کے شیعہ علماء مرزا فتح علی، سید نجف علی وغیرہ سے تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد دہلی کا سفر کیا اور شیخ رشید الدین، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالعزیز وغیرہ سے استفادہ کیا۔ ان اکابر علماء کے پاس رہ کر بہت سے علوم و فنون میں مہارت پیدا کی۔ پھر لکھنؤ تشریف لائے اور عرصہ دراز تک وہاں قیام کیا۔ مناظرہ و کلام میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ ۱۲۹۹ھ میں آپ کی وفات ہوئی[2]۔ سن ولادت معلوم نہ ہوسکا۔ ہاں "تذکرہ علمائے ہند" میں درج ہے کہ "ان کی عمر پچھتر سال سے زیادہ ہوئی" اگر ان کی عمر ۷۵ سال تسلیم کی جائے تو سن ولادت ۱۲۲۴ھ ہوگا۔ مصنف "تذکرہ علمائے ہند" نے یہ عمر محض اپنے اندازے سے لکھی ہے۔ اس لئے انھوں نے عمر کی پوری تعیین نہیں کی ــــ لیکن صاحب تذکرہ علماء ہند کا یہ اندازہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ اتنی بات یقینی ہے کہ مولانا حیدر علی فیض آبادی نے شاہ رفیع الدین صاحب سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ان کے درس میں باقاعدہ شریک ہوئے[3]۔ اور شاہ رفیع الدین کا ۱۲۳۳ھ میں انتقال ہوا[4]۔ اب اگر مولانا حیدر علی فیض آبادی کی عمر ۷۵ سال

---

[1] نزہۃ الخواطر ص ۱۵۳-۱۵۴۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷۴-۱۷۵۔ [2] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۵۲/ ۔ تذکرہ علماء ہند ص ۱۷۵ [3] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۵۲ تذکرہ علماء ہند ص ۱۷۵
[4] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۸۶

مان کر سن ولادت ۱۲۲۴ھ کو مانا جائے یا بہت سے بہت اسّی سال عمر مان کر سن ولادت ۱۲۱۹ھ کو تسلیم کیا جائے، تو اس سے یہ بات لازم آئیگی کہ شاہ رفیع الدین کے انتقال کے وقت ان کی عمر ۹ یا ۱۴ سال تھی۔ اور ۹ یا ۱۴ سال عمر ہونے سے پہلے ہی انھوں نے فیض آباد سے دہلی آکر ان حضرات علماء سے استفادہ کیا، اور ان کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے۔ حالانکہ یہ بات کسی طرح عقل میں آنے والی نہیں۔ مولوی رحمان علی کی بات تسلیم کرنے کی صورت میں مولانا حیدر علی فیض آبادی کو سید جعفر علی کا استاذ ماننا غلط ہوگا۔ کیونکہ سید احمد شہید کی سفر حج سے واپسی کے بعد سید قطب علی (سید جعفر علی کے والد) غالباً ۱۲۳۹ھ۔ ۱۲۴۰ھ میں رائے بریلی گئے تھے، اس وقت مولانا جعفر علی لکھنؤ میں زیر تعلیم تھے۔ ۱۲۲۴ھ کو سن ولادت ماننے کی صورت میں ۱۲۳۹ھ میں مولانا حیدر علی کی عمر صرف ۱۵ پندرہ سال ہوگی۔ اور پندرہ سال کی عمر میں مسند درس پر متمکن ہونا قرین قیاس نہیں ۔۔ خلاصہ یہ کہ مولوی رحمان علی مرحوم سے مولانا حیدر علی فیض آبادی کی عمر کا اندازہ لگانے میں غلطی ہوئی ہمارے خیال میں مولانا حیدر علی فیض آبادی کو طویل عمر ملی۔ انھوں نے لگ بھگ ۹۰ سال عمر پائی۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی مولانا حیدر علی مولانا سید جعفر علی کے استاذ ہوئے۔ کیونکہ لکھنؤ میں ان کا طویل عرصہ قیام رہا۔ اور کلام و مناظرہ سے ان کو خاص شغف تھا۔ چنانچہ انھوں نے رد شیعہ میں متعدد کتابیں لکھی ہیں جو چھپ چکی ہیں۔ (باقی)

حالات شیخ نجم الدین کبریٰ ؒ

(۲)

از مولوی سید محمد فاروق بخاری لیکچرر شعبۂ عربی گورنمنٹ ڈگری کالج سوپور (کشمیر)

اولاد حضرت شیخ کے اولاد کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہوا کہ اُن کی شادی شیخ روز بہان بقلی کی دختر سے ہوئی تھی جن کے بطن سے دو فرزند تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے مُرشد کی نگاہ میں حضرت شیخ بڑی قدر و منزلت رکھتے تھے۔ اسی طرح شیخ عمار یاسر کے بارے میں لکھا جاتا ہے کہ جب انہوں نے وفات پائی تو اُن کی جگہ شیخ نجم الدین کبریٰ ؒ ہی کو سونپی گئی۔ شیخ درویش شیرازی کے اس شعر میں بھی اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے [1]

شیخ نجم الدین کُبریٰ بعد ازاں
رہنمائے و پیشوائے سالکاں

آرائے اکابرین حضرت شیخ نظام الدین اولیا، شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ فرید الدین عطار، سید محمد نور بخش، حضرت امام فخر الدین رازی، مولانا جلال الدین رومی وغیرہ سب اکابرین حضرت شیخ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ شیخ نظام الدین، جو حضرت شیخ کی شہادت (۶۱۸ھ) کے صرف اٹھارہ سال بعد (۶۳۶ھ) میں تولد ہوئے جب حضرت شیخ کا ذکر کرتے ہیں تو شیخ حسن علا سجزی کہنے کے مطابق "چشم پُر آب" ہوتے ہیں۔ حضرت سلطان الاولیا فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ کبریٰ نے شیخ سیف الدین باخرزی اور شیخ شہاب الدین کے بارے میں پیشینگوئی کی تھی کہ اول الذکر کو از دنیا نصیب تمام خواہد بود و در عقبیٰ بیش ازاں" اور موخر الذکر کو "ترا ہم در دنیا و عقبیٰ راحت خواہد بود اما شیخ سیف الدین را بیشتر خواہد بود [2] غرض سلطان المشائخ

---

[1] نظام الملک طوسی "تمہید" ص ۱ [2] فوائد الفواد (مرتبہ محمد لطیف ملک، لاہور) ص ۳۴۴م ۳۴۵م

شیخ نظام الدین حضرتِ شیخ کے فضل و کمال کے معترف ہیں اور جب اُن کا نام لیتے ہیں تو قدس اللہ سرّہٗ فرماتے ہیں - اسی طرح شیخ فرید الدین عطار "مظہر العجائب" میں فرماتے ہیں:-

این چنیں گفتہ است نجم الدین ما　　آنکہ بود اندر جہاں ازاد لیا
آں ولیِ عصر سلطانِ جہاں　　منبعِ احسان و میرِ عارفاں
شیخ نجم الدین کبریٰ نامِ او　　در جہاں جان و دل پیغامِ او

سید محمد نوربخش اِن الفاظ میں حضرت شیخ کا ذکر کرتے ہیں

کان اکمل العلماءِ المرشدین فی زمانہٖ وَاَعْلَمَ العلماء بین اقرانہٖ وھو صاحب الاحوال الرفیعہ والمقامات والمکاشف والمشاھدات وتجلیّات الذاتِ والصفات والسیرِ فی الملکوت والطیرِ فی الجبروت ومشربِ التوحید والحقائق والتصرّف فی الاطوارِ القلبیّۃِ و ایصال الافیاض الغیبیّہ الی المسترشدین۔ شعب من ذیل ولایتہٖ کثیرٌ من الاولیاء واھل الارشاد۔ وھو مجتھدٌ فی علوم الظاھرۃ والباطنۃ۔ ولہٗ فی الارشاد وتربیّۃ السّالکین شانٌ مختص[1]

امام فخرالدین رازی کے فضل و کمال سے کون ناواقف ہے حضرت شیخ کی جلالت و عظمت کے وہ بھی دل سے قائل تھے۔ بلکہ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ حضرت امام، حضرت شیخ کے اجل خلفا میں سے تھے۔ ان دو مقدّس شخصیتوں کی ملاقات کی طرف چند علماء نے مختصر الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔ مثلاً ابن العماد الحنبلی لکھتے ہیں۔

اجتمع بہ الامام فخرالدین الرازی فاعترف بفضلہٖ[2]　　حضرت شیخ اور امام رازی اکٹھے ہوئے تو امام صاحب نے ان کی فضیلت کا اعتراف کیا

---

[1] بحوالہ اصول تصوف، ڈاکٹر احسان اللہ استخری ص - [2] شذرات الذہب ج ۵ ص ۸۰

مگر صاحبِ مفتاح السعادۃ نے اِن دو بزرگوں کی ملاقات کے سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ ذکر کیا ہے جو ہم ذکر کرتے ہیں فرماتے ہیں ایک بار امام رازی ہرات تشریف لے گئے تو تمام علماء اور صلحاء ان کی ملاقات کی غرض سے آئے۔ ایک دن امام صاحب نے دریافت کیا کہ کیا کوئی ایسا شخص بھی رہ گیا ہے جو ہماری ملاقات کو نہیں آیا۔ لوگوں نے کہا: صرف ایک صالح شخص جو گوشہ نشین ہے باقی رہ گیا ہے۔ امام صاحب نے کہا: میں ایک واجب التعظیم شخص اور مسلمانوں کا امام ہوں پھر اُس نے میری ملاقات کیوں نہیں کی۔ لوگوں نے اِس مردِ صالح سے یہ بات کہی لیکن اُس نے کچھ جواب نہ دیا اور دونوں میں مخالفت ہو گئی۔ اس کے بعد شہر کے لوگوں نے ایک دعوت منعقد کی۔ دونوں بزرگوں نے دعوت قبول کی۔ اور ایک باغ میں جمع ہوئے۔ اب امام صاحب نے ملاقات نہ کرنے کی وجہ دریافت کی تو اِس مردِ صالح نے کہا: میں ایک فقیر آدمی ہوں نہ میری ملاقات سے کوئی شرف حاصل ہو سکتا ہے اور نہ میری ملاقات نہ کرنے سے کوئی نقص پیدا ہو سکتا ہے۔ امام صاحب نے کہا: یہ جواب اہل ادب یعنی صوفیہ کا ہے۔ اب مجھ سے حقیقت بیان کرو۔ اِس مردِ صالح نے کہا: کس بنا پر آپ کی ملاقات واجب ہے؟ تو امام صاحب نے کہا کہ میں مسلمانوں کا واجب التعظیم شخص ہوں۔ اِس مردِ صالح نے کہا "آپ کا سرمایۂ فخر علم ہے، لیکن خدا کی معرفت رأس العلم ہے۔ پھر آپ نے خدا کو کیوں کر پہچانا۔ امام صاحب نے کہا سو دلیلوں سے"۔ اس مردِ صالح نے کہا "دلیل کی ضرورت تو شک کے زائل کرنے کے لئے ہوتی ہے لیکن خدا نے میرے دل میں ایک ایسی روشنی ڈالی ہے کہ اس کی وجہ سے میرے دل میں شک کا گزر ہی نہیں ہو سکتا ہے کہ وہاں دلیل کی ضرورت ہو"۔ امام صاحب کے دل میں اس کلام نے اثر کیا اور اسی مجلس میں اس مردِ صالح کے ہاتھ پر توبہ کی اور خلوت نشین ہو گئے اور برکاتِ تصوف حاصل کیں۔ راوی کا بیان ہے کہ یہ مردِ صالح حضرت شیخ نجم الدین کبری قدس اللہ سرہ تھے [۱]

---

[۱] امام رازی: مولانا عبدالسلام ندوی ص ۲۱

مسلک حضرت شیخ نجم الدین کُبریٰ اگرچہ فقہی زنجیروں سے آزاد معرفت کے مقامِ رفیع پر فائز تھے تاہم ایک مسلک کے وہ بھی مقلّد تھے۔ تذکرہ نگاروں نے کہا ہے کہ آپ مسلکاً شافعی تھے "خیوق" کا ذکر کرتے ہوئے جو حضرت شیخ کی جائے پیدائش ہے، یاقوت حموی المتوفی ۶۲۶ھ نے لکھا ہے۔

اھلھا شافعیۃٌ دون جمیع بلاد خوارزم فانھم حنفیۃٌ [1] — "خیوق" کے رہنے والے شافعی ہیں جب کہ سارے علاقہ خوارزم کے لوگ حنفی ہیں۔

حضرت شیخ کے بہت سے مُرید حنفی تھے جن میں مولانا بہاؤ الدین وَلَد (والدِ ماجد مولانا جلال الدین رومی) بھی ایک ہیں۔ حضرت شیخ کے بہت سے عقیدتمندوں نے اپنا آبائی مسلک ترک کر کے حضرت شیخ کا مسلک اختیار کیا۔ جن میں حضرت امیر علی بن شہاب الہمدانی رح بھی ایک ہیں۔ مگر وسعتِ قلبی کا یہ حال تھا کہ جب تبلیغِ اسلام کی غرض سے کشمیر تشریف لائے تو یہاں ایک اور بزرگ شیخ سید عبد الرحمان (بابا بلال رح) نے حنفی ہونے کی وجہ سے اِسی مسلک کے مطابق اِسلامی حدود اور شرعی قواعد کی اِشاعت کی تھی۔ اگر میر سید علی چاہتے تو شافعی مسلک کے مطابق تبلیغ کرتے اور سو فیصد کامیاب ہوتے مگر ایسا نہیں کیا بلکہ تبلیغ کے وقت وہی مسلک زیر نظر رکھا جو اُن کے پیش رَو مبلّغ کا تھا ۔ اسی وجہ سے کشمیر کے مسلمان نوے فیصد حنفی مسلک کے مقلّد ہیں۔

تصنیفات اور چند ارشادات حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ بڑے عالم دین تھے جس کا کچھ تذکرہ گذشتہ صفحات میں ہوا۔ تصوّف کی طرف بعد میں مائل ہوئے ورنہ وہ پہلے عظیم القدر عالم کی حیثیت ہی سے مشہور تھے۔ اِس پر اُن کے القاب جیسے "الطّامۃُ الکبریٰ" اور "نجم الدین" کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ آپ بلند پایہ مصنف تھے۔ مگر اکثر تصنیفی ذخیرہ گردشِ روزگار کی نذر ہوا ہے۔ ورنہ انہوں نے عربی اور فارسی میں بہت کچھ لکھا تھا۔ بعد کے بزرگوں

---

[1] معجم البلدان ج ۳ ص ۵۰۴

نے اپنی کتابوں میں کہیں کہیں اُن کے ارشادات ذکر کیئے ہیں جو اُن کی علمی فضیلت پر دلالت کرتے ہیں۔ ایک بزرگ نے ماکان محمد ...... خاتم النبیین آیتِ متبرکہ کے بارے میں لکھا ہے حضرت شیخ نجم الدین نے لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ محمدؐ اس دنیاء ظاہری سے تعلق ہی نہیں رکھتے تھے [1] کہا جاتا ہے کہ حضرت شیخ نے ایک ضخیم تفسیر بھی لکھی تھی۔ ولہٗ تفسیر فی اثنتیٰ عشرۃ مجلدۃ [2] بارہ جلدوں پر مشتمل انہوں نے ایک تفسیر بھی لکھی ہے صاحبِ مناقب الاصفیا نے لکھا ہے کہ حضرتِ شیخ کی ایک کتاب کا نام "تبصرۃ" ہے۔ یہ کتاب اِس کے علاوہ محق کا ایک اور رسالہ ہندوستان میں مشہور و معروف ہے پروفیسر براؤن لکھتے ہیں کہ حضرتِ شیخ کے دو رسالے برٹش میوزیم میں موجود ہیں۔ ایک عربی میں ہے اور دو تین صفحات پر مشتمل ہے۔ اِس کا نفس مضمون تصوّف ہے۔ دوسرا رسالہ جس کا نام صفات الادب ہے، فارسی میں ہے اور اُن شرائط و قواعد پر بحث کرتا ہے جو مبتدی متصوّف کو میدانِ سلوک میں ملحوظ رکھنے پڑتے ہیں [3] حضرت شیخ کے عربی میں لکھے ہوئے دو مزید رسالے کتب خانہ مجلسِ شوریٰ ایران میں مجموعہ مخطوطات میں زیر شمارہ ٥٩٨٥ موجود ہیں۔ ایک رسالے کا نام فواتح الجمال وفواتح الجلال" تھا۔ اِس رسالے کی کتابت کی تاریخ ٧٠٩ھ ہے اور دوسرے رسالے کا نام الھائم (یا الی الھائم) ہے یہ ناقص ہے [4] ان تصانیف کے علاوہ بعض محققین نے حسب ذیل رسالے بھی حضرت شیخ کی تصنیفات میں شمار کیئے ہیں (١) الاصول العشرۃ۔ (٢) رسالۃ السفینۃ (٣) آداب المریدین (٤) منہاج السالکین (٥) اقرب الطریق الی اللہ

ان تصانیف میں منہاج السالکین، خواجہ نصیر الدین طوسی کی "قواعد العقائد" کے حاشیہ

---

[1] بحوالہ Sufism Its Saints and Shrines By John A. Subhan
[2] شذرات الذہب ج ٥ ص ٨٠ [3] A Literary History of Persia Vol 2
[4] تاریخ تصوّف در اسلام (طہران) ج ٢ ص ٤٦٥

پرطہران سے چھپ گئی ہے۔ کتاب ایک مقدمہ اور آٹھ ابواب پر مشتمل ہے جو حسب ذیل ہیں۔

منہج اوّل:۔ در صفتِ فقیر سالک در راہِ تصوّف

منہج دوّم۔ در نشانی محبت خدائے مر بندہ را و وصول بندہ بمولائے خود و شناسائی حضرت دوست بصفات و تقدّس ذاتش

منہج سوّم:۔ در حقیقت دخول فقیر راہ رَو در خلوت و آداب آں

منہج چہارم:۔ در معرفت نفس و اتباع آں۔

منہج پنجم:۔ در انداز فقیر و ارشادِ وے

منہج ششم:۔ در تفصیل فقر بر ماسِوَا اللہ

منہج ہفتم:۔ در صفتِ دنیا

منہج ہشتم:۔ در صفتِ راہِ الٰہی

فوائح الجمال وفواتح الجلال: اُن کی سب سے عظیم الشان کتاب ہے اور میر سید علی ھمدانی کے رسائل میں اس کتاب کا حوالہ متعدد جگہوں پر ملتا ہے۔ یہ کتاب عربی میں ہے اور تصوّف و سلوک سے بحث کرتی ہے۔ کتاب کی ابتداء میں لکھتے ہیں:۔

سمیّت الکتاب فوائح الجمال وفواتح الجلال۔ تذکرۃً للمنقطعین الی اللہ تعالٰی وتبصرۃً للمخلصین واسأل اللہ تعالٰی العفو والعافیۃ فی الدنیا والآخرۃ والمغفرۃ الرحمۃ لجمیع اُمّۃ محمد علیہ السلام ولمن قال لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ والھدایۃ لجمیع خلقہٖ انہٗ الکریم المنّان المجید الحنّان والحمد للہ وسلامٌ علٰی عبادہِ الذین اصطفٰی۔

یہ کتاب عشق و عرفان سے لبریز ہے اور حقائقِ اشیا اور معارف الٰہیہ بیان کرتی ہے فرماتے ہیں عرفان سے انعامات و احسانات ظاہر ہوتے ہیں اس سے محبت پیدا ہوتی ہے محبت

کا وارث فنا بن جاتا ہے۔ فنا ہی محبت کی حقیقت اور حصول ہے۔ جب عاشق، عشق میں فنا ہوتا ہے تو وہ خود عشق بن جاتا ہے پھر عشق، معشوق میں مٹ جاتا ہے۔" اس میں بظاہر ایسی باتیں بھی مل جاتی ہیں جو قابلِ اعتراض نظر آتی ہیں مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں۔

اعلم ان النفس والشیطان الملک لیست اشیاء خارجۃ عنک بل انت ھم۔ وکذالک السماء والارض والکرسی لیست خارجۃ عنک ولا الجنۃ ولا النار ولا الموت ولا الحیاۃ۔ انما ھی اشیا فیک فاذا سوت وصفوت تبینت ذالک ان شاء اللہ

جاننا چاہیئے نفس، شیطان اور ملک ایسی چیزیں نہیں ہیں جو تم سے خارج ہیں بلکہ یہ تجھ ہی میں ہیں اسی طرح زمین، آسمان، کرسی بھی تجھ سے باہر نہیں ہیں، نہ جنت، جہنم اور موت و حیات تجھ سے الگ ہیں۔ یہ تیرے اندر ہیں جب تم ترقی کروگے تو یہ تم پر کھل جائے گا۔ انشاءاللہ

مگر حضرات صوفیہ کرام کے اس طرح کے اقوال شریعت میں کسی طرح حجت نہیں بن سکتے۔ حضرت مولانا انور شاہ محدث شیخ اکبر کے زبردست مداح، اور اُن کے فضل و کمال کے معترف تھے۔ مگر جب اُن کا کوئی قول شریعت کے تابع دکھائی نہیں دیتا ہے تو صاف صاف اسے صوفیہ کرام کے شطحیات پر محمول کرتے ہیں جو از روئے شریعت دلیل نہیں بن سکتے۔ پھر حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ رح نے حفظ ماتقدم کے طور پر اپنے عقائد بھی واضح کئے ہیں تاکہ کسی ملحد اور محرف کو تحریف و تنسیخ کا موقعہ نہ ملے منہاج السلوک میں فرماتے ہیں۔

آمنا بہ و بجمیع ملائکتہ وکتبہ ورسلہ والبعث بعد الموت والشفاعۃ والجنۃ والنار والقبر والسوال والحوض والمیزان والصراط والخلود (خلود النار) للکافرین ورد المظالم والامن والنعیم

ہم نے اللہ پر، اس کے فرشتوں، کتابوں، پیغمبروں حیات بعد الموت، شفاعت، جنت، جہنم، قبر، سوال حوض، میزان، صراط، کفار کے لئے دائمی جہنم پر ایمان لایا۔ اور مظالم کو دور امن کے قیام، اور جنت بن نعمات پر لایا۔ اور جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ اپنی کتاب محکم میں از قبیل

في الجنة وكل ما قال الله في محكم
كتابه من الاخبار والقصص والامثال
والحكم والحرام والمتشابه وما بيّن
وفسّر لنا رسول الله صلى الله عليه
وآله حق۔ وهو سبحانه وتعالى
قائم بذاته وقيام جميع الخلائق
به، وكلّهم محجوبون عن سرّ قضائه
وقدره ولا يملكون لانفسهم ضرًا
ولا نفعًا ولا موتًا ولا حيوة ولا نشورًا
ومن دخل الجنة بفضله ومن
دخل النار فبعدله۔

اخبار، تاریخی واقعات، امثال و حِکَم، حلال و حرام
اور متشابہ بیان فرمایا اس کو برحق مانتے ہیں، اور
وہ سب حق ہے جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم نے توضیح و تفصیل فرمائی۔ خود اللہ
سبحانہ و تعالیٰ قائم بذاتہ ہیں، تمام مخلوقات اس
کی وجہ سے قائم ہیں۔ اللہ کے قضاء و قدر کے
راز سب پر مخفی اور پوشیدہ ہیں۔ مخلوقات
بذاتِ خود کسی نفع و ضرر، موت و حیات اور
بعث بعد الموت پر طاقت نہیں رکھتے۔ جو
کوئی جنت میں داخل ہوگا وہ اللہ کے فضل و
کرم کے طفیل جائے گا اور جو جہنم میں داخل ہوگا وہ
اللہ کے عدل و انصاف کے عین مطابق ہوگا۔

"فواتح الجمال" میں "هل يسقط
التكليف عن عباده الخواص" ——
نعم بمعنى انّ التكليف مأخوذ من
الكلفة وهي المشقة فيعبدون الله
تعالى بلا مشقة وكلفة بل يتلذّذون
بها ويطربون۔ فانّ الصلوة مناجاة
ولكن مهما كان العابد موافقًا للشيطان
مخالفًا للرحمٰن لم يجد لذّة المناجاة
بل يشقّ عليه ذلك فانّ مناجاة

میں تکلیف کو ایک عجیب چکر دے کر فرماتے ہیں۔
ہاں اس حیثیت سے اللہ کے خاص بندوں سے
"تکلیف" ساقط ہوتی ہے جبکہ اسے "کلفت" سے
ماخوذ مانا جائے جس کا معنیٰ مشقت ہے۔ یہ حضرات
چونکہ بغیر کسی محنت و مشقت کو محسوس کئے اللہ کی
عبادت کرتے ہیں بلکہ اس سے لذت اور دل کی
خوشی پاتے ہیں — لیکن کبھی عابد شیطان کے موافق
اور رحمٰن کے مخالف عمل کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ مناجات

المخالف صعبة شاقة على البدن اما اذا وافق الرحمن وعادى الشيطٰن كان الصلوٰة فى حقه مناجاة الحبيب وهو الذ الاشياء

جیسے کہ نماز میں — سے کوئی لذت محسوس نہیں کرتا بلکہ اس پر بار گزرتی ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ شیطان کے موافق اس کی مناجات بدن پر سخت مشکل ہو جاتی ہے۔ اور جب عابد وہ صورت اختیار کرتا ہے جو اللہ کے مطابق ہوتی ہے اور وہ شیطان کا دشمن بن جاتا ہے تو نماز اس کے حق میں دوست کے ساتھ ہمکلامی[۱] کی صورت اختیار کرتی ہے جو سب سے زیادہ لذیذ چیز ہے۔

حضرت شیخ رح کے طریقِ سلوک میں دس اصول کار فرما نظر آتے ہیں۔ اور وہ انہی پر زور دیتے ہیں کشمیر میں اِن دس[۲] اصولوں کے شارح اور مبلغ حضرت میر سید علی ہمدانی تھے جنہوں نے حضرت شیخ کی تصنیفات عربی سے فارسی میں منتقل کر کے شائع دذائع کئے۔ اور بعض محققین[۱] نے غلطی سے اِن تراجم کو حضرت امیر سید علی کی حقیقی تصنیفات میں شمار کیا ہے۔ ان میں ایک "اقرب الطرق الی اللہ" ہے یہ حضرت شیخ کی کتاب ہے اور نہایت مختصر ہونے کے باوجود تصوف پر عمدہ کتاب مانی جاتی ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر احسان اللہ لکھتے ہیں۔

در آداب و دقائقِ سلوک کہ باہمہ اختصار بر معارفِ بسیار شامل است[۲]

سلوک و آداب کے دقیق مسائل میں مختصر ہونے کے باوجود بہت سے معارف و حقائق پر مشتمل ہے۔

اسی رسالے میں ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں:-

"اللہ تعالیٰ کی طرف پہنچنے کے لئے اتنی راہیں ہیں جتنے مخلوقات کے سانس۔ لیکن ان میں نزدیک ترین راہیں صرف تین ہیں۔ اول:- اربابِ معاملات کا راستہ" اس راہ میں مختلف قسم کی عبادات

۱؎ A History of Kashmir By Dr. Sufi vol I P 223

۲؎ اصول تصوف ص ۲۱۲

جیسے نماز، روزہ، تلاوتِ قرآن پر مدار ہے مگر وہ لوگ بہت ہی کم ہیں جو اس راستے پر چل کر منزلِ مقصود کو پہنچتے ہیں - **دوم** - اربابِ مجاہدات وریاضات کا راستہ، جو اخلاق کی تبدیلی نفس کی پاکیزگی، دل کی صفائی اور روح کو روشن کر کے منزل پر پہنچتے ہیں - راہِ اوّل کے مسافروں میں سے جو کامیاب ہوتے ہیں اُن سے اس نہج پر چلنے والے زیادہ ہیں - **سوم**:- یہ راستہ سائرانِ الی اللہ و طائرانِ حضرت الٰہ کا ہے - یہ عشق و محبت میں ڈوبے ہوئے سالکوں کا راستہ ہے - دوسری راہوں کے جو آخری حدود ہیں وہ اس راہ کی ابتدائی منزل ہے - اس راہ کا حصول موتِ ارادی پر منحصر ہے - جیسا کہ ارشاد ہوا **موتوا قبل ان تموتوا**، مگر اس کا تحقق دس اصولوں پر عمل کئے بغیر ممکن نہیں ہے -

(۱) توبہ (۲) زہد (۳) توکل بر خدا (۴) قناعت (۵) عزلت (۶) ملازمۂ ذکر (۷) توجہ الی اللہ (۸) صبر (۹) مراقبہ (۱۰) رضا [۱]

جب ظاہر و باطن کی طہارت و پاکیزگی کا ذکر کرتے ہیں تو وہاں بھی دس شرائط پیش کرتے ہیں اس پر ان کی مستقل کتاب الی الھائم الخائف من لومۃ اللائم عربی زبان میں ہے -

حضرت شیخ بھی اُن ہی چند بزرگوں میں ہیں جو عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی تک پہنچنے کے لئے ضروری سمجھتے ہیں - یہ اُن کے شیخ اور مربی شیخ روزبہان بقلی کا مسلک بھی تھا - وہ بھی خوبصورت صورتوں کے ساتھ محبت رکھتے تھے چاہے وہ عورت ہی کیوں نہ ہو - حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ رح صاف صاف فرماتے ہیں -

عشقتُ جاریۃً بقریۃٍ علی ساحل نیل بمصر، فبقیتُ ایاماً لا آکل ولا اشرب الا ما شاء اللہ حتی کثرت نار العشق فکنتُ اتنفسُ

ملک مصر میں دریائے نیل کے کنارے ایک گاؤں ہے وہاں میں ایک عورت پر عاشق ہو گیا - بہت دنوں تک یہی حالت رہی کھانا پینا چھوٹ گیا آتش عشق نے یہاں تک غلبہ کیا کہ میری سانس

---

[۱] اصولِ تصوف - ڈاکٹر احسان اللہ

نیرانًا فکلّما تنفستُ ثمہٗ نارٌ ایلتشی
من السماءِ بحذاءِ نفسی نارٌ فیلتقی
ناران ما بینی وبین السّماءِ فما
کنتُ ادری من این یلتقیان
فعلمتُ انّ ذٰلکَ شاھدی فی السّماء[1]

سے آگ نکلتی - جب میری سانس سے آگ نکلتی تو آسمان سے بھی ایک آگ میری سانس کے بالمقابل نکلتی اور یہ دونوں میرے اور آسمان کے درمیان مِل جاتیں میں یہ نہیں سمجھتا کہ یہ دونوں کہاں سے مِل جاتی ہیں - بس میں نے جان لیا کہ یہ میرا معشوق ہے آسمان میں -

ایسا ہی ایک دوسرا واقعہ حضرت شیخ نے اپنے بارے میں لکھا ہے -

" ایک بار عرب کے کسی شہر میں مَیں کسی پر عاشق ہو گیا میں نے اس پر اپنی ہمّت مسلّط کر دی اس کو میں نے پکڑا اور اپنی ذات سے باندھ دیا اور اپنے سوا ہر کسی سے منع کر دیا لیکن اس کے چند نگہبان تھے - اس لئے وہ صاف صاف گفتگو نہ کر سکتا تھا - زبانِ حال سے اس نے گفتگو کی - میں اس کو سمجھتا تھا اور اس سے اسی طرح گفتگو کرتا تھا اور وہ اس کو سمجھتا ' کام انتہا کو پہنچا یہاں تک کہ میں وہ ہو گیا اور وہ میں ہو گیا - اور عشق محض صفائی روح تک پہنچ گیا - ایک رات اس کی روح پراگندہ حال میرے پاس آئی اور کہنے لگی : اے شیخ میں تجھ سے پناہ مانگتی ہوں - تو نے مجھے قتل ہی کر ڈالا - پس میری فریاد کو پہنچ - میں نے پوچھا : تو کیا چاہتی ہے ؟ کہا : مجھے اجازت دے کہ میں قدم چوموں " میں نے اجازت دی - اس نے میرے قدم چومے اور اپنا منہ اُٹھایا - میں نے اس کو بوسہ دیا یہاں تک کہ اس کو راحت و اطمینان ہوا - اور اس نے میرے قلب سے معانقہ کیا "[2]

مشہور صوفی صافی اور حضور اکرمؐ کا قصیدہ گو محمد بن سعید بن حمّاد البوصیری (متوفی ۶۹۵ھ) صاحب قصیدہ بردہ بھی عشق مجازی کو عشق حقیقی کے حصول کے لئے ایک ذریعہ سمجھتے تھے - وہ بڑھاپے اور ضعف کی حالت میں ایک لونڈی پر فریفتہ ہوتے ہیں - لیکن لونڈی کسی صورت

۱؎ رموزِ عشق : ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ص ۱۰۵ ۲؎ رموزِ عشق ص ۱۰۴

میں تسلیم نہیں کرتی۔ ہرچند شیخ بوصیری کہتے ہیں

قلتُ لابُدّ انْ تسیری الی الدار　　فقالت عسی! انا مجنونة!
قُلتُ سیری فانّنی للشیخِ خیرٌ　　مِن ابٍ راحمٍ وامٍ حَنُونة
انا نعم القرین ان کُنتِ تبغین　　حلالاً وانتِ نعم القرینة

لیکن اس نے اِس عاجزی کے باوجود انکار کیا۔

قالتُ اَضْرِبُ عن وصلِ مثلی صفحاً　　واُضْرِبُ الخلَّ او یصیر طحینة
لا اری ان تمسّنی یدُ شیخٍ　　کیف ارضی بہ لطشتنی مشینةٌ[۱]

اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ یہ حضرات صوفیہ کرام کس عالم میں اِس طرح کی گفتگو کرتے ہیں۔ ان کے سامنے کیا ہوتا ہے، کس چیز سے کیا مدّعا لیتے ہیں؟ ہم ظاہر بینوں کے لئے یہ باتیں قطعاً حجت نہیں بن سکتے۔ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی نے کتنی اچھی بات فرمائی ہے۔

"اول تو یہ حضراتِ صوفیہ واللہ اعلم کن کن احوال ومقامات سے گذرتے رہتے ہیں۔ ان کے سیر وسلوک کی بہت سی منزلیں ہی ہم عوام واہل ظاہر کے لئے ناقابلِ فہم، اُس پر طرہ ان کی خاص خاص اصطلاحات اور رمز وکنایے، لفظ پڑا کچھ گیا اور مراد اس سے کچھ لی گئی"[۲]

غرض حضرت شیخ کی روح عشق ومستی میں ڈوبی ہوئی تھی شیخ فخرالدین عراقی رح نے "قبلۂ عاشقاں" کہا ہے۔ فرماتے ہیں

قبلہ عاشقاں وجداللہ　　نجم دین آں زسرِّ عشق آگاہ

حضرت شیخ کا منظوم کلام

حضرت شیخ بلند پایہ شاعر بھی تھے اور یہ وقت فارسی شاعری کے عروج کا وقت بھی تھا۔ انوری، خاقانی اور نظامی گنجوی حضرت شیخ کے ہم عصر تھے افسوس ہے کہ حضرت شیخ کا سارا منظوم کلام تلف ہوا ہے۔ بس اتنا ہی موجود ہے۔ جو دیگر تذکرہ نگاروں نے نمونۂ کلام کے طور پر اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ ان اشعار میں بعض

---

[۱] الموازنة بین الشعراء: ڈاکٹر زکی مبارک، مکتبۂ مصطفیٰ مصر ۱۹۳۶ء
[۲] بزم صوفیہ: تقریب از مولانا دریابادی ص ۲

اس قدر گہرے ہیں کہ دردِ دل کا مریض ہی اس کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ حسب ذیل اشعار کے بارے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی فرماتے ہیں۔

"ان اشعار میں عشق و سرشاری کی عجیب کیفیت، سوز و گداز اور محویت و استغراق کا عجب عالم نظر آتا ہے"۔ [1]

در چنیں حیرت کہ من دارم چہ گویم وصفِ خویش	آتشم خاکم نسیمم آب دریا چیستم
عاقلم دیوانہ ام اندر فراقم یا وصال	نیستم ہستم نہ برجایم نہ بے جا چیستم

فرماتے ہیں

نہ از علوی خبر دارم نہ از سفلی خبر دارم	نہ در کنجِ مناجاتم نہ در کوئے خراباتم
وطن جائے دگر دارم کہ ایں جا نیست و آنجا نہ	خلافِ عقل طاعاتم، کشیدہ رطلِ مستانہ

چند رباعیات "اصولِ تصوّف" کے مصنف نے بھی ذکر کی ہیں۔ چند حسب ذیل ہیں۔

عمری همگی قرب و لقا کردہ طلب	پیدا و نہاں از من و ما کردہ طلب
کار از دل کشادہ ہم آخر کار	رو بیں کہ کجا و ما کجا کردہ طلب

چہ نیست زہر چہ نیست جز باد بدست	چوں ہست بہر چہ ہست نقصان و شکست
پندار کہ ہست ہر چہ در عالم نیست	انگار کہ نیست ہر چہ در عالم ہست

عقل از رہ تو حدیث و افسانہ برد	در کوئے تو رہ مردم دیوانہ برد
ہر لحظہ چو من ہزار دل سوختہ را	سودائے تو از کعبہ بہ بتخانہ برد

حاشا کہ دلم از تو جدا خواہد شد	یا با کس دیگر آشنا خواہد شد

---

[1] تاریخ دعوت و عزیمت ج ۳ ص ۱۵۶

از مہر تو بگزرد کرا دارد دوست   در کوئے تو بگزرد کجا خواہد شد

چوں عشق بدل رسید دل درد کند   دردِ دلِ مُرد، مُرد را مُرد کند
در آتشِ عشق خود بسوزد وآں نگاہ   دوزخ زبرائے دیگراں سرد کند

زاں بادہ نخوردہ ام کہ ہشیار شوم   آں مست نبودہ ام کہ بیدار شوم
یکجام تجلّیٔ جمال تو بس است   تا از عدم و وجود بیزار شوم

کچھ نصیحت آمیز قطعات بھی اُن کے منظوم کلام میں موجود ہیں۔ ایک ملاحظہ

خواجگاں در زمانِ معزولی
ہمہ شبلی و بایزید شوند
باز چوں بر سرِ عمل آیند
ہمہ چوں شمر و چوں یزید شوند

انتخاب الترغیب والترہیب

مصنفہ: الامام الحافظ زکی الدین المنذری   انتخاب و ترجمہ و تشریح: مولانا عبداللہ طارق
نیک اعمال کے اجر و ثواب اور بدعملی پر زجر و عتاب کے موضوع پر ایک نہایت جامع و مستند اور مقبول عام کتاب جس میں نیک اعمال اور اچھے اخلاق کے فضائل اور انعامات صحیح حدیثوں سے لکھے گئے ہیں۔ حدیثوں کے عربی متن کے ساتھ آسان زبان میں ترجمہ اور مختصر تشریح خود پڑھیے گھروں میں پڑھوائیے اور مسجدوں کے مجمعوں میں سنوائیے۔ جلد اول بلاجلد قیمت دو روپے ۵۰ پیسے

جنرل منیجر: ندوۃ المصنفین، اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

"یادگارِ اہلِ چشت"

شیخ عبدالعزیز جون پوریؒ

(م ۹۷۵ھ)

از:- محمد ارشد اعظمی (مقیم بنارس)
(فاضل مدرسہ وصیۃ العلوم الہ آباد)

(ایک عظیم شخصیت وباکمال ہستی "شیخ عبدالعزیز چشتیؒ" جسے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے "شیخ کامل عارف دوراں" کہا ہے اور مولوی رحمان علی نے "قطبِ وقت" کہا ہے۔ ایسی بابرکت ذاتِ اقدس کی زندگی کے حالات وکمالات تاریخ کے صاف وشفاف آئینے میں جسے پڑھنے کے بعد قلب میں سوز وروح میں احساس پیدا ہوگا۔ انشاءاللہ تعالیٰ)

(محمد ارشد عفااللہ عنہ)

(۱) خاندانی حالات | شیخ عبدالعزیز جون پوریؒ کے جد مکرم حضرت شیخ طاہرؒ تحصیل علم کی غرض سے سرزمینِ ملتان سے بہار تشریف لائے اور شیخ بدھ بہاریؒ کی خدمت میں رہ کر علومِ دینیہ کی تکمیل فرمائی اور بعد فراغت بہار ہی میں سکونت پذیر ہو گئے۔ جہاں شیخ عبدالعزیز قدس سرہ العزیز کے والد گرامی شیخ حسن طاہرؒ کی ولادت ہوئی [۱] عنفوانِ شباب میں شیخ حسن طاہرؒ پر طلبِ حق کا جذبہ غالب ہوا اور آپ راجے حامد شاہ مانکپوریؒ (م ۹۱۱ھ) سے مرید ہو گئے [۲] چنانچہ شیخ حسن طاہر جون پوریؒ اپنے صدق طلب وسوز عشق اور ریاضت کی وجہ

---

[۱] [۲] اخبار الاخیار ص ۱۹۵ و تذکرہ علمائے ہند ص ۴۷،

سے سلوک و عرفان کی وادی طے کر کے مقامِ احسان تک پہنچ گئے اور نعمتِ خلافت سے شرفیاب ہو گئے۔

دیارِ پورب کے علم دوست و علماء نواز شرقی تاجدار ابراہیم شاہ (م ۸۴۴ھ) کے دورِ ہمایوں میں علمائے حقانی و مشائخ ربانی کے جو نورانی قافلے مختلف دیار و امصار سے دارالسرور جون پور آئے اُسی میں عظمت کے مینار شیخ حسن طاہر رح بھی بہار شریف سے دیارِ پورب چلے آئے۔

تاریخ نگاروں نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ شیخ حسن طاہر رح رشتہ کے اعتبار سے جون پور کے مشائخ کبار حضرت شیخ عیسیٰ تاج جون پوری رح (م ۸۶۰ھ) کے خویش (اور داماد) ہیں[۱] شیخ حسن طاہر رح کے علم سلوک میں متعدد رسالے ہیں جس میں ایک کتاب "مفتاح الفیض" معروف ہے[۲]

(۲) ولادت وطفولیت | شیخ حسن طاہر رح کے دو صاحبزادے اولیاء کاملین میں مشہور و معروف ہیں ایک تو بڑے لڑکے "شیخ محمد حسن" دوسرے چھوٹے بیٹے حضرت شیخ "عبدالعزیز رح" اور دونوں ہی حضرت شیخ محمد عیسیٰ تاج رح کے نواسے ہیں، اس وقت ثانی الذکر ہی مضمون نگار کا عنوان ہیں اور انھیں کے حالات و کمالات کو صفحاتِ قرطاس پر اجاگر کرنا ہے

شیخ عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ ۸۹۸ھ میں بمقام دارالسرور جون پور پیدا ہوئے اور ڈیڑھ سال کی عمر میں اپنے والد گرامی شیخ حسن طاہر رح کے ہمراہ دہلی چلے آئے کیوں کہ دیارِ پورب سے حسین شاہ کی عشوہ طراز حسینہ "فوزیہ بیگم" کی دلربا اور سحر انگیز اداؤں کی بدولت حکومت شرقیہ کا آفتاب غروب ہو چکا تھا اور شرقی حکومت کا آخری تاجدار شکست کی تاب نہ لاکر بنگال فرار ہو چکا تھا ادھر سلطنت لودھی کا خورشید تاباں افقِ دہلی سے نمودار ہو کر دیارِ پورب کے

[۱] تاریخ شیراز ہند ص ۱۷۵ و ۲۶۰، [۲] تذکرہ علمائے ہند ص ۵۰ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح نے اخبارالاخیار میں ایک سوال و جواب مفتاح الفیض سے نقل فرمایا ہے جو قابل دید اور موثر و روح پرور ہے

یام وہ رپہ جلوہ فگن ہو چکا تھا جس کی بنا پر سکندر خاں لودھی جون پور پر قابض ہو چکا تھا اور اس بادشاہ لودھی خان نے شیخ حسن طاہر رح کی شخصیت و عظمت سے متاثر ہو کر سفر دہلی کی دعوت دی تھی جسے شیخ رح نے قبول فرمایا اور مع اہل و عیال روانہ ہوئے دہلی پہنچ کر شاہ تغلق کے محل "کوشک نجے منڈل" میں قیام پذیر ہوئے [1] چنانچہ

(۳) تعلیم و تربیت شیخ عبدالعزیز رح نے ایسے آفتاب و ماہتاب گھرانے میں آنکھ کھولی تھی جس کا پورا ماحول علم و عمل اور روحانیت کا گہوارہ تھا کیوں کہ والد مکرم شیخ حسن رح نے خود براہِ راست نگرانی فرمائی تھی، اس کا اثر یہ تھا کہ شیخ عبدالعزیز رح فطرتاً سنجیدہ اور خموشی پسند ہونے کے ساتھ با اخلاق اور علوم دینیہ میں کامل و مکمل ہوئے۔

اگرچہ تاریخ کے صفحات پر تصریح تو کیا اشارہ بھی نہیں ملتا ہے کہ شیخ عبدالعزیز رح نے کن اساتذہ سے علمی فیض پایا مگر تذکرہ نگار (محمد ارشد اعظمی) کا ذوق یہ کہتا ہے کہ شیخ رح نے علم کی تحصیل اپنے والد مکرم رح ہی سے فرمائی ہے کیوں کہ بظاہر تاریخی اعتبار سے حضرت شیخ رح کا طلب علم کے لئے کہیں سفر کرنا یا یا عرصہ کسی درسگاہ میں آمد و رفت پیش کرنے سے اوراقِ تاریخ خاموش ہیں۔ دوسرے یہ کہ والد رح خود جامع العلوم تھے اور تعلیم و تربیت کا پورا خیال رکھتے تھے۔

مولوی رحمان علی صاحب نے لکھا ہے کہ:۔

در علوم ظاہریہ ہم کامل مکمل بود و تفسیر عرائس و عوارف المعارف و فصوص الحکم و شروحش بتلامذہ درس گفتے [2]	شیخ عبدالعزیز دہلوی رح علوم ظاہری میں کامل و مکمل تھے، تفسیر عرائس۔ عوارف المعارف، فصوص الحکم اور ان کی شروحات کا اپنے شاگردوں کو درس دیتے تھے"

اور حقیقت تو یہ ہے کہ مذکورہ بالا کتابیں عوارف المعارف، فصوص الحکم پھر ان کی شروحات وغیرہ یہ سب خالص تصوف اور طریقت کی کتابیں ہیں جو اس فن میں بہترین شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں ان کا درس دینا ہر عالم کا کام نہیں ہے بلکہ معلومات کے ساتھ بصیرت تامہ، کامل استعداد تحقیق و

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۹۵ : تذکرہ علمائے ہند ص ۱۴۷ [2] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۱

تدقیق کی صلاحیت اور بڑی زبردست ژرف نگاہی کی حاجت ہے اور مولوی رحمان علی صاحب کا مذکورہ بالا بیان بلاشک و شبہ شیخ عبدالعزیز رح کے کمالات علمی کا آئینہ دار ہے جس سے آپ کا عالمانہ مقام واضح ہو کر رہتا ہے۔

(۴) سلوک و تصوف | شیخ عبدالعزیز رح ظاہر ہے کہ شیخ حسن طاہر رح جیسے پیر طریقت اور رہبر حقیقت کے صاحبزادے اور حضرت عیسیٰ تاج جونپوری رح جیسے باکرامت ولی اللہ اور عارف باللہ کے نواسے ہیں اور ایمان و احسان کے بہار آفریں ماحول میں پروان چڑھے ہیں۔ لہٰذا طلب حق کا غلبہ ہوا اور ظاہر سے باطن کی طرف متوجہ ہوئے کر اپنے والد مکرم رح سے بیعت ہو گئے جیسا ایک تذکرہ نگار نے لکھا ہے کہ "مرید پدر خود شیخ حسن بود" [1]

لیکن شیخ عبدالعزیز رح نے علوم باطنی کی تکمیل شیخ جلال الحق قاضی خاں ظفر آبادی رح سے فرمائی [2] جناب اقبال احمد جونپوری لکھتے ہیں کہ:-

جب آپ کے والد بزرگوار حضرت شیخ حسن طاہر جونپوری رح کا وقت وفات قریب آیا تو آپ نے شیخ عبدالعزیز رح کو بغرض تکمیل علوم باطنی حضرت بندگی قاضی خاں ناصحی رح کے سپرد فرمایا اُس وقت سے آپ ظفر آباد آکر رہنے لگے جب علومِ باطنی سے فراغت حاصل کرلی تو دہلی

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۱۔ [2] قاضی خاں ظفر آبادی رح (م ۹۴۲ھ) بلخ کے باشندے اور حضرت ابراہیم بن ادہم رح کی نسل سے تھے والد گرامی محمد یوسف رح ظفر آباد کے جسٹس تھے اور نانا جان "عماد الملک" شرقی حکومت کے وزیر تھے ازیں علاوہ پورا گھرانہ "ایں خانہ ہمہ آفتاب است" کا مصداق تھا۔ قاضی خاں ظفر آبادی رح حضرت شیخ حسن طاہر رح کے خلیفۂ صادق اور ظفر آباد کے مشائخ کبار و علمائے نامدار میں سے تھے۔ طریقت اور تصوف میں قاضی خاں رح کا مقام بہت ہی بلند ہے۔ خود ہی ارشاد فرماتے ہیں کہ

سی سال جانہا کندیم و ریاضتہا
کشیدیم تا قدرے علم بمکائد نفس
حاصل کردیم و دانستیم کہ نفس

تیس سال تک میں نے جان کھپائی اور ریاضت و مجاہدے کئے تب جاکر فریب نفس کی کسی قدر شناخت ہوئی اور یہ سمجھ میں آیا کہ نفس کس طرح

تشریف لے گئے [1] قاضی خاں رح نے بھی آپ کے ساتھ شفقت وعنایت کا معاملہ فرمایا اور شیخ عبدالعزیز رح

بقیہ صفحہ ۳۵۳ ۔ بجہ طریق راہ مبزعد وچہ کمینگاہ ہا دارد | راہ مارتا ہے اور کن گھاتوں سے حملہ آور ہوتا ہے

(اخبار الاخیار ص ۳۴۴)

اسی طرح مایۂ ناز مورخ جناب نورالدین صاحب زیدی جون پوری رقمطراز ہیں کہ:۔

حضرت بندگی جلال الحق در بزرگان متاخرین	قاضی خاں رح اہل چشت کے متاخرین بزرگان دین میں
اہل چشت ازبس نام آور وصاحب زہد وتوکل	بہت مشہور ہیں، متقی و پرہیزگار عبادت وریاضت
عبادت وریاضت واہل استقامت وکرامت	والے اور اہل استقامت وصاحب کرامت تھے
بود حتیٰ کہ پیرش ہنگام فرد شدن پسر خود عبدالعزیز	یہاں تک کہ قاضی خاں رح کے شیخ محترم حضرت حسن
راجہت تعلیم باطنی تفویض نمود (تجلی نور ص ۱۶	طاہر رح نے اپنے وصال فرمانے کے وقت صاحبزادۂ
بحوالہ الفرقان جنوری ۱۹۷۶ء)	گرامی شیخ عبدالعزیز رح کو تعلیم باطنی کیلئے انھیں کے سپرد
	فرمایا تاکہ تکمیل کرا کے جانشین بنادیں)

حاشیہ صفحہ ہٰذا

[1] اس مقام پر یہ تاریخی حقیقت واضح کردینی ضروری ہے کہ شیخ حسن طاہر رح نے جب شیخ عبدالعزیز رح کو قاضی خاں رح کے سپرد فرمایا تو آپ رح شیخ عبدالعزیز رح کو دہلی سے ظفر آباد اپنے ہمراہ لے آئے جہاں مدتوں شیخ رح قیام پذیر رہے جب قاضی خاں رح نے پوری طرح باطنی تربیت فرمادی اور تکمیل ہو چکی تو نعمتِ خلافت سے نواز کر دہلی روانہ فرمایا۔ اس طرف توجہ اس لئے دلائی ہے کہ ہمارے محترم مولانا حبیب الرحمٰن جگدیشپوری نے اپنے مقالہ "قاضی خاں ظفرآبادی" میں تذکرۂ خلفاء کے ذیل میں لکھا ہے کہ "ڈیڑھ برس کی عمر میں باپ کے ساتھ دہلی آگئے پھر وفات تک یہیں رہے" (ماہنامہ الفرقان لکھنؤ جنوری ۱۹۷۶ء) یہ تو صحیح ہے کہ "ڈیڑھ برس کی عمر میں باپ کے ساتھ دہلی آگئے" مگر بعد کا بیان کہ "پھر وفات تک یہیں رہے" مجمل ہے۔ جب تک تاریخ کی روشنی میں اس کی تفصیل نہیں کی جائیگی شیخ عبدالعزیز رح کی زندگی کی ایک تابناک جھلک صفحاتِ قرطاس پر عیاں نہ ہوسکے گی حالانکہ مولانا حبیب الرحمٰن نے بھی اُسی مقالے میں آگے چل کر یہ لکھا ہے کہ "والد کی وفات کے بعد ظفرآباد آئے اور طویل مدت تک یہاں مقیم رہ کر عبادت وریاضت اور کسب سعادت میں مشغول رہے" (الفرقان) تو گویا مولانا کو تسلیم ہے کہ دہلی کی سکونت

(باقی صفحہ ۳۵۵)

کے اندر ذوقِ تصوف پیدا کرنے اور منزلِ سلوک طے کرانے میں خصوصی توجہ فرمائی جس کی بنا پر آپ تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کی دشوار گذار گھاٹی سے بہت جلد آگے نکل گئے۔ اور اس تیز گامی کے ساتھ عشقِ الٰہی میں ایسے دیوانے ہوئے بادۂ خداوندی میں ایسے مستانے ہوئے شرابِ محبت میں ایسا مخمور ہوئے کہ مشاہدۂ حق میں مستغرق ہونے لگے اور خلوت نشینی کا مزاج بن گیا۔

(۵) کمالات | یہ اپنی جگہ ایک مسلمہ مسئلہ ہے کہ کسی شخصیت کی عظمت و صداقت اور اُس کی شرافت و کرامت اُس کے کمالات کے آئینے میں ہی نظر آتی ہے چنانچہ حضرت شیخ عبدالعزیز رح بھی اپنی سعیٔ بے پایاں اور والدِ گرامی شیخ حسن طاہر رح کے حقیقی وارث اور قاضی خاں ظفرآبادی رح کی خاص توجہ باطنی کا مظہر ہونے کی وجہ سے بلند پرواز بھی تھے اور عالی مقام بھی شریعت کے رہبر بھی ہیں اور طریقت کے ہادی بھی حقیقت کے عالم بھی ہیں اور ریاضت کے عادی بھی، اور میر کارواں ہے نگاہ بلند و سخن دلنواز و جانِ پُر سوز جیسا رختِ سفر بھی ساتھ ہے جیسا کہ محدث دہلوی شیخ عبدالحق رح خامہ ریز ہیں کہ:-

شیخ عبدالعزیز بن حسن طاہر رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ میاں قاضی خان ست از مشاہیر مشائخ چشتیہ بود بسیار بزرگ بود بعلوم شریعت و طریقت و حقیقت ابتدائے

شیخ عبدالعزیز بن حسن طاہر رحمۃ اللہ علیہ میاں قاضی خان رح کے خلیفہ اور مشائخ چشتیہ کے مشہور بزرگان دین میں ہیں علوم شریعت و طریقت اور حقیقت کے بہت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۴) مسلسل نہیں ہے بلکہ عمر گرانمایہ کا ایک حصہ ظفرآباد میں گذرا ہے۔ لہٰذا اُن کو اتنی اختصار پسندی سے نہیں کام لینا چاہیے کہ اصل حقیقت بھی نہاں ہو کر رہ جائے۔ تذکرہ نگار تو یہ کہتا ہے کہ شیخ عبدالعزیز رح کا قیام ظفرآباد میں اتنی طویل مدت رہا کہ "تاریخ ظفرآباد" کے مورخین نے ظفرآباد کے مشاہیر میں آپ کو شمار کیا اور اس کی پیروی جناب اقبال احمد جون پوری نے بھی اپنی کتاب "تاریخ جون پور" میں کی ہے، چونکہ مولانا حبیب الرحمٰن جگر بسشوری نے تدبر سے کام نہیں لیا ہے اور تاریخ کا مطالعہ بھی سرسری کیا ہے اسلئے ان سے چوک ہو گئی ہے اس طرح سے اپنے مقالہ "شجرۂ طیبہ" میں (جواب کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے) بہت سی عبارتوں کو بلا ترجمہ چھوڑ دیا ہے اگر وہ فکر و توجہ سے کام لیتے تو بہتر ہوتا۔

صغر سن در عبادت و ریاضت ناشی شدہ تا حدے
کہ بمرتبۂ مشیخت رسیدہ بود۔ ہیچ چیز از اوراد و
اوقات کہ در ابتدائے حال التزام نمودہ بود تا آخر
عمر فوت نشدہ بودے۔ اودر اتباع مشائخ و حفظ
و قواعد و آداب ایشاں یگانہ عصر بود۔ اودر
تواضع و حلم و صبر و رضا و تسلیم و شفقت بر خلق و
رعایت فقراء نظیر نبود و در زمان خود یادگار مشائخ
چشت بود، در دہلی بوجود او سلسلۂ ارشاد و
مشیخت برپا بود ۱؎

بڑے عالم تھے بچپن کے ابتدائی زمانہ ہی سے عبادت
و ریاضت میں اس درجہ محو ہوگئے کہ مقام مشیخت
پہ فائز ہو گئے، وظائف و اوراد جیسے وقت کی پابندی
کے ساتھ ابتدائی حالات سے لازم قرار دے لیا تھا۔
آخر عمر تک اُس کا اہتمام فرماتے رہے کہ کوئی وظیفہ
بھی فوت نہیں ہوا۔
شیخ عبدالعزیز رح مشائخ عظام کی پیروی کرنے اور
ان حضرات کے آداب و قواعد یعنی اصول کی رعایت
و نگہداشت میں امتیازی شان کے حامل تھے کہ اُس
دور میں اس طرح کی کوئی نظیر نہیں ملتی ہے۔

شیخ رحمۃ اللہ علیہ کو تواضع اور بردباری، صبر و رضا اور تسلیم، مخلوق پر شفقت کرنے اور فقراء کی رعایت کرنے میں ممتاز مقام حاصل تھا، اپنے دور میں مشائخ چشتیہ کی یادگار تھے، دہلی میں آپ کے بابرکت وجود سے رشد و ہدایت اور طریقت کا فیض جاری تھا"۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح نے جس جامعیت اور جمعیت کے ساتھ شیخ عبدالعزیز کا تذکرہ فرمایا ہے تذکرہ نگار کہتا ہے کہ حقیقتاً یہ اوصاف و کمالات کا آئینہ دار اور اثر انگیز و دلآویز ہے جن حضرات کو تذکرۂ اکابر کا ذوق ہوگا وہی اس کا لطف اُٹھا سکتے ہیں۔

مولانا رحمان علی نے بھی جو شاندار بیان دیا ہے وہ لائق مطالعہ ہے۔ لکھتے ہیں کہ :۔

از مشاہیر مشائخ چشتیہ و از اکابر علمائے صوفیہ
رضوان اللہ علیہم مظہر معرفت و محبت و بعلوم
شریعت و طریقت و حقیقت عالم بود ۲؎

شیخ رح مشائخ چشتیہ کے مشاہیر اور حضرات صوفیہ
صافیہ رضوان اللہ علیہم کے اکابر علمائے کرام میں سے
ہیں، معرفت و محبت کا مظہر اور شریعت و طریقت
اور حقیقت کے عالم تھے،

۱؎ اخبار الاخیار ص ۲۸۲
۲؎ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۱

لہٰذا ان حقائق کی روشنی میں یہ ثبوت فراہم ہو کر رہا کہ شیخ عبدالعزیز قدس سرہٗ العزیز نسبتِ چشتیہ کے حامل ایک عظیم صوفی اور شیخ المشائخ تھے، شریعت و طریقت، حقیقت و معرفت اور محبت، ریاضت و عبادت کے مظہرِ کامل تھے۔ عشقِ الٰہی میں سرمست، یادِ خداوندی میں مستغرق، اور بادۂ توحید سے سرشار تھے، اصول و ضوابط کے بڑے پابند اور مشائخ و صوفیاء کا حد درجہ اکرام و احترام کرتے تھے۔ عزلت نشیں و خموشی پسند تھے اخلاقِ حسنہ اور صفاتِ حمیدہ سے مالامال تھے جس کی بنا پر شیخ رح کی زندگی بڑی تابناک اور ضیا بار ہے [1]۔

---

[1] عصرِ حاضر کے مایۂ ناز اہلِ قلم اور مؤرخ جناب صباح الدین صاحب نے اپنے گرانقدر مقالہ "ہندوستان کے سلاطین و علماء و مشائخ کے تعلقات" میں ص ۱۵۳ پر شیخ عبدالعزیز چشتی رح کا نام نامی لے کر اور دیگر اکابر صوفیاء کے اسماءِ گرامی کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ ان حضرات "نے چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کی تعلیم تو جاری رکھی لیکن وہ اپنے پیش رو اور بزرگوں کی طرح ایک غیر معمولی روحانی طاقت بن کر لوگوں کے دل و دماغ پر نہ چھا سکے" تذکرہ نگار کو اس بیان پر افسوس بھی ہے اور حیرت بھی کیوں کہ نہ معلوم مقالہ نگار کی اس سے کیا مراد ہے؟ اور وہ اپنے ذہن میں شیخ عبدالعزیز رح کے بارے میں کیا تصورات قائم کئے ہوئے ہیں! اور آخر غیر معمولی طاقت روحانی بن کر چھا جانا کس کو کہتے ہیں! کیونکہ موصوف ہی نے اسی مقالہ میں بیان فرمایا ہے کہ ابوالفضل نے عہدِ اکبری میں "شیخ عبدالعزیز رح کو خداوندِ آتین (دونوں جہان کے بادشاہ) کہا ہے ص ۱۰۱۔ اس کے علاوہ "واقعاتِ بابری" کے مصنف عبدالرحیم خان خاناں دہلوی کے والدِ گرامی بیرم خاں خاناں خاص طور سے آپ کے معتقد تھے (الفرقان جنوری ۱۹۷۰ء) دوسرے شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح جیسی مایۂ ناز شخصیت و محقق تاریخ نگار شیخ عبدالعزیز رح کے بارے میں فرما رہے ہیں کہ "در زمانِ خود یادگارِ مشائخ چشت بود۔ در دہلی بوجود او سلسلۂ ارشاد و مشیخت برپا بود" اور دیگر اوصاف کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے، "نظیر نبود" (اخبار الاخیار ص ۲۸۲) مولوی رحمان علی صاحب نے بھی لکھا ہے کہ از اکابر علمائے صوفیہ صافیہ رضوان اللہ علیہم مظہر معرفت و محبت و بعلوم شریعت و طریقت و حقیقت عالم بود" (تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۱) اب ان تصدیقات کے بعد بھی یہ تصور قائم کر لیا جائے (بقیہ صفحہ ۳۵۸ پر)

(۶) مجدد الف ثانی رح سے مراسلت | ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ عبدالعزیز رح نے حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رح سے مراسلت بھی فرمائی ہے۔ چنانچہ مکتوبات مجدد رح کی جلد ثانی میں مکتوب اول شیخ عبدالعزیز جون پوری رح کے نام ہے۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ جون پوری رح نے وحدۃ الوجود سے متعلق کچھ باتیں لکھی تھیں جس کا مفصل جواب حضرت مجدد رح نے دیا ہے، شیخ جون پوری رح نے اپنا مراسلہ مولانا شیخ محمد طاہر بدخشی رح سلہ کی وساطت سے مجدد صاحب رح کی خدمت گرامی میں ارسال فرمایا تھا، مکتوبات مجدد میں اس کا اشارہ بایں الفاظ ملتا ہے کہ :۔

صحیفۂ شریفہ کہ نامزد ایں نقیر ساختہ بودند اخوی اعزی شیخ محمد طاہر رسانیدند خوش وقت ساختند الخ

مکتوب تین ورق میں ہے اور وحدۃ الوجود کے بارے میں بہت دقیق وغامض مضامین پر مشتمل ہے، تذکرہ نگار مناسب سمجھتا ہے کہ ذوق مطالعہ کی تسکین کے لیے پورے مکتوب کا حاصل

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۷ کہ شیخ عبدالعزیز چشتی رح غیر معمولی روحانی طاقت بن کر نہ چھا سکے اور اپنے خود ساختہ معیار پر پرکھا جائے تو یہ بات افسوسناک بھی ہے اور حیرتناک بھی

حاشیہ صفحہ ہذا

سلہ مولانا شیخ محمد طاہر بدخشی ثم جون پوری حضرت مجدد الف ثانی رح کے خلفاء میں سے ہیں کافی عرصہ خانقاہ سرہند میں قیام کر کے اپنے پیر و مرشد سے فیوض و برکات حاصل کیے حضرت مجدد رح جب اُن کے سامنے معارف بیان فرماتے تو آپ اُن کو سن کر آرے اور بیلے کہتے جاتے تھے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ خوش طبعی کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ اسرار و معارف مولانا طاہر پر وارد ہوئے ہیں اور میں ان کا ترجمان ہوں حضرت رح نے تعلیم طریقت کی اجازت دے کر جون پور روانہ کر دیا تھا۔ ۲۰ رجب المرجب ۱۰۴۰ھ کو جون پور میں وفات پائی اور وہیں آپ کا مزار ہے ۔

(حاشیہ مکتوبات خواجہ محمد معصوم سرہندی ص ۲۹)

مختصر لفظوں میں پیش کر دے چنانچہ حضرت مجددرح کے ارشاد گرامی کا مفہوم یہ ہے کہ :۔

"اللہ تعالیٰ ہی نور ہے، ہر خیر و کمال کا مصدر وہی ہے اور وہی واجب الوجود ہے اس کے سوا عدم ہے اور وہ عدم ظلمت ہی ظلمت اور ہر شر و فساد کی جگہ ہے۔ کائنات میں سے ہر کائن کی اصل عدمی جزو ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات نے اُن اجزائے عدمیہ پر عکس ڈالا حضرت وجود کے عکس سے عدم کو وجود عطا ہوا اور اس کے اسماء و صفات کے پرتو سے اجزائے عدمیہ میں کمالات کا ظہور رہوا۔ جتنا ہی مبارک اسماء و صفات کا پرتو پڑا ہے اُسی قدر اوصاف سے وہ عدمی جزو مجلّٰی ہوا ہے اور جن اسماء و صفات کی تجلیات و انوار سے وہ عدمی جزو محروم رہا وہ لازماً بے بہرہ بھی رہا۔"

حضرت مجددرح نے جب اپنے اس مکتوب گرامی کو شیخ عبدالعزیز رح کے پاس روانہ کیا تو حضرت مولانا شیخ محمد طاہر بدخشی ثم جون پوری رح نے بھی غالباً مطالعہ فرمایا چنانچہ اسی ذیل میں کچھ سوالات مجدد صاحب رح سے کئے جس کا جواب حضرت مجدد رح نے ارسال فرمایا یہ مکتوب بھی جلد ثانی نمبر ۲ میں ہے۔ اس کے علاوہ حضرت مجدد رح نے شیخ عبدالعزیز رح کو مکتوب اول میں "مخدوما" لکھ کر خطاب فرمایا ہے اور ستائیسویں مکتوب میں "مشیخت مآب شیخ عبدالعزیز رح" لکھ کر یاد فرمایا ہے۔ اس بیان سے جہاں یہ ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ شیخ عبدالعزیز جنیتی رح حضرت مجدد رح کی شخصیت و قیادت کے معترف تھے وہیں یہ حقیقت بھی عیاں ہو کر رہی کہ حضرت مجدد رح شیخ رح کا بڑا احترام و اکرام فرماتے تھے جو دلیل کمال اور تسلیم حقائق کا مظہر ہے۔

چوں کہ اوپر ابھی "وحدۃ الوجود" کا ذکر آیا ہے تو اختصار پسندی کے ساتھ اس ذیل میں کچھ روشنی ڈال دینا اضافۂ معلومات کا سبب ہوگا۔ چنانچہ وحدۃ الوجود کی تشریح عام اور سادہ الفاظ میں اس طرح کی جا سکتی ہے کہ :۔

"بندہ اپنے کو فنا کر کے خدا کی ذات میں متحد ہو سکتا ہے اس میں حلول کر سکتا ہے اس کے بعد وہ جو کچھ دیکھتا ہے تو خدا کو، کچھ سنتا ہے تو خدا سے، کچھ لیتا ہے تو خدا سے، کچھ کہتا ہے تو خدا سے

اُس کو ہر چیز میں خدا ہی خدا نظر آتا ہے، وہ گلوں کی رنگینی، سبزہ زاروں کی شادابی، حسن وجمال کی رعنائی نغموں کی دلآویزی، دریا کی روانی، سمندر کی طغیانی، سیلاب کی تباہ کاری - زلزلہ کی غارتگری انسانوں کی تباہی آبادی کی بربادی، وغیرہ سب چیزوں میں وہ خدا ہی خدا دیکھتا ہے اور اس کی نظر میں خالق خلق تخلیق اور مخلوق وغیرہ سب ایک ہیں، وجود یعنی حقیقی ہستی تو ایک ہی ہے مگر ایک وجود ظاہر ہے اور ایک باطن، باطن خود ایک نور ہے جو عالم کیلئے ایک جان کی طرح ہے اس نور باطن کا عکس ایک وجود ظاہر ہے ہر اسم وصفت وفعل جو اس عالم میں ظاہر ہے اُن سب کا اصل وہی وصفِ باطن ہے اس کثرت کی حقیقت دراصل وہی وحدت ہے۔

(۷) تصنیفات | یہ بھی حقیقت ہے کہ کارنامے کمالات ہی کا آئینہ ہوتے ہیں۔ جو ہستی دنیا تک یادگار ہوتے ہیں۔ حضرت شیخ عبدالعزیز چشتی رح بھی بفضلہٖ تعالیٰ اس زریں سلسلہ میں ممتاز ہیں۔ مولوی رحمان علی صاحب لکھتے ہیں کہ:-

صاحب تصانیف مشہورہ است	آپ مشہور تصانیف والے ہیں اُن کی تصنیفات
از انجملہ رسالہ عینیہ است کہ در	ہی میں سے ایک رسالہ عینیہ ہے جو کہ شیخ
مقابلہ رسالہ غیریہ شیخ امان پانی پتی	امان پانی پتی رح کے رسالہ غیریہ کے جواب میں ہے۔
نوشتہ وبسیاری از مسائل غامضہ	اُس میں آپ نے وحدت الوجود کے بہت سے
وحدت الوجود موافق کشف ارباب	باریک اور نازک مسائل اہل شہود کے کشف کے
شہود در آنجا ذکر کردہ [1]	موافق بیان کئے ہیں۔

شیخ امان اللہ پانی پتی رح (م ۹۵۷ھ) شیخ محمود دلارے رح (م ۹۰۱ھ) پانی پتی کے شاگرد رشید اور شیخ عبدالعزیز رح کے بڑے بھائی اور بزرگ شیخ محمد حسن جون پوری رح (م ۹۲۴ھ) کے خلیفۂ گرامی تھے "رسالہ غیریہ" جس کا اصل نام اثبات الاحدیہ ہے وہ آپ ہی کی تصنیف ہے۔ اور شیخ عبدالعزیز چشتی رح نے اُس کے مقابلہ میں "رسالۂ عینیہ" لکھا جس میں وحدت الوجود کے دقیق و غامض مسائل سے بحث کی ہے۔

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۱ و ۱۲۲

افسوس کہ دوسری کتب کے اسماء پیش کرنے سے تاریخ خاموش ہے تذکرہ نگار کا خیال یہ ہے کہ جس طرح والاگرامی شیخ حسن طاہر رح کی تصنیفات میں صرف "مفتاح الفیض" معروف ہے اسی طرح شیخ عبدالعزیز چشتی رح کی تصانیف میں صرف "رسالہ عینیہ" مشہور ہے اور تاریخ میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔

(۸) شجرۂ بیعت | حضرت شیخ عبدالعزیز چشتی جون پوری ثم دہلوی رح کا سلسلۂ بیعت اس طرح ہے شیخ عبدالعزیز چشتی رح وھو عن شیخہٖ جلال الحق قاضی خاں ظفرآبادی رح وھو عن شیخہٖ حسن بن طاہر رح جون پوری وھو عن شیخہٖ راجے حامد شاہ مانکپوری رح وھو عن شیخہٖ مولانا حسام الدین مانک پوری رح وھو عن شیخہٖ نور الحق پنڈوی رح (المشہور بہ شیخ نور قطب عالم) وھو عن شیخہٖ و والدہٖ علاؤ الدین رح ابن سعد لاہوری رح وھو عن شیخہٖ سراج الدین الملقب باخی سراج الدین رح وھو عن شیخہٖ سلطان الاولیاء نظام الدین محبوب الٰہی دہلوی رح قدس اللہ اسرارھم الی اٰخرھم۔ [1]

(۹) وصال الی الحق | آہ! دنیا میں جو آیا ہے وہ جانے ہی کیلئے آیا ہے اور ہر ایک کے لئے ایک وقت موعود ہے، مولوی رحمان علی صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

۲ رجمادی الاخریٰ ۹۷۵ھ کو آپ کی روح کا شہباز لقا کی بلندی کی طرف پرواز کر گیا [2]

یعنی یہ جگمگاتا ہوا ضیاء بار ماہتاب غروب ہو گیا یا بقول علامہ اقبال رح "عہد گل ختم ہوا ٹوٹ گیا سازِ چمن" انا للہ وانا الیہ راجعون نور اللہ مرقدہٗ و رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح لکھتے ہیں کہ:۔

رحلت کے وقت ایک عجیب ذوقی کیفیت اور حال شیخ رح پر طاری رہا اور حسنِ خاتمہ

---

[1] تذکرہ نگار محمد ارشد اعظمی نے یہ شجرۂ بیعت خود اپنے ذوق و شوق سے کتاب اخبار الاخیار کو سامنے رکھ کر مرتب کیا ہے، امید کرتا ہے کہ ارباب ذوق اس کو پسند کریں گے۔
[2] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۳۔

آپ کا آیۂ کریمہ فسبحان الذی بیدہٖ ملکوت کل شیئ والیہ ترجعون پڑھنا[1]
یعنی یہ آیت تلاوت فرماتے ہوئے محبوبِ حقیقی سے جا ملے، آیت مذکورہ سورۂ
یٰسین شریف کی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "تو پاک ہے وہ ذات اقدس جس کے ہاتھ میں
ہر چیز کا پورا اختیار ہے اور تم سب کو اُس کے پاس لوٹ کر جانا ہے"، سُبحان اللہ کیا ہی
عمدہ حال اور کیف ہے اسی کو حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب
غوری رح خلیفۂ گرامی حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی، نور اللہ
مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ:۔

دنیا سے اس طرح ہو رخصت غلام تیرا — ہو دل میں یاد تیری ہو لب پہ نام تیرا
ہر ماسوا سے غافل شوقِ لقا میں تیرے — ہو جان و دل سے حاضر سُن کر پیام تیرا
سینہ میں ہو منقش یارب کتاب تیری — جاری رہے زباں پر ہر دم کلام تیرا
باطن میں میرے یارب بس جائے یاد تیری — ہر دم رہے حضوری دل ہو مقام تیرا
دل کو لگی رہے دُھن لیل و نہار تیری — مذکور ہو زباں پر ہر صبح و شام تیرا
مورد رہے یہ ہر دم تیری تجلیوں کا — ہو جائے قلب میرا بیت الحرام تیرا
جنت میں چشمِ حیرت ہو شاد کام میری — جلوہ رہے میسر اس کو مدام تیرا

ہو جملہ انبیاءؑ پر اصحابؓ و اولیاءؒ پر
دائم صلوٰۃ تیری، پیہم سلام تیرا

ما شاء اللہ حضرت خواجہ صاحب رح نے بھی خوب کہا ہے اور بہت ہی دلنشیں
و اثر آفریں انداز میں کہا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ مقصد اور حقیقت کی
طرف اشارہ کیا ہے۔ تذکرہ نگار نے لطف و شوق کے لئے اکثر حصہ نقل کر دیا ہے۔

---

[1] اخبار الاخیار ص ۲۸۲

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح لکھتے ہیں کہ:۔

شیخ عبدالعزیز رح کا مزار مبارک آپ کی خانقاہ کے صحن میں ہے۔ فقیر نے آپ کی تاریخ وفات کہی ہے جو یہ ہے (قطعہ)

شیخ کامل عارف دوران خود عبدالعزیز　　آنکہ می داد اہل دل را مجلسش یاد از بہشت
ہر چہ از اوصاف اہل اللہ در عالم بود　　حق تعالیٰ از ازل فطرت بذات او سرشت
یادگار اہل چشت او بود در دوران خود　　گشت از آں تاریخ فوتش یادگار اہل چشت
۹۷۵ھ

لہ حقیقۃً شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح کا یہ قطعہ بڑی جمعیت اور جامعیت حامل ہے جو بصیرت افروز ہے، اور تاریخ فوت "یادگار اہل چشت" نکلی

مفتی غلام سرور لاہوری رح (م ـــ ھ) نے "ہادیٔ مخدوم دین عبدالعزیز" سے تاریخ وفات (۹۷۵ھ) نکالی ہے ۲؎ اور مولوی رحمان علی نے "قطب وقت نماند" تاریخ رحلت تحریر کیا ہے۔

اس کے علاوہ مولوی صاحب موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ:۔

شیخ عبدالعزیز رح اپنی تصانیف اور مکتوبات میں اپنے آپ کو "ذرۂ ناچیز عبدالعزیز" لکھا کرتے تھے۔ لفظ "ذرۂ ناچیز" سے بھی تاریخ رحلت نکلتی ہے ۳؎ رحمہ اللہ تعالیٰ

شیخ عبدالعزیز چشتی رح کے مشاہیر خلفاء کرام و تلامذہ۔

(۱) شیخ عبدالغنی بدایونی رح (م ـــ ھ)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح لکھتے ہیں کہ:۔

شیخ عبدالغنی بداؤنی ست کہ بصفت علم　　شیخ عبدالغنی بدایونی رح جو کہ علم و عمل اور حال

۱؎ اخبار الاخیار ص ۲۸۲، ۲؎ خزینۃ الاصفیاء بحوالہ شیراز ہند ص ۹۹۵
۳؎ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۲

وعمل وحال در ریاضت وفقر وعزلت وسائر آداب سلوک موصوف است و در فناء شہر مسجدی است از عمارات فیروزی بعبادت مولیٰ تعالیٰ مشغول ست در اوضاع واحوال او آثار قوت واستقامت لایح وباہر است[1]	ومجاہدہ اور فقر وخلوت نشینی اور سلوک وتصوف کے تمام ہی آداب کی صفت سے موصوف ہیں، شہر دہلی کے اطراف میں فیروز شاہ تغلق کی عمارتوں کے سلسلہ کی ایک مسجد ہے جس میں شیخ بدایونی رح اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہیں، اُن کے طور و

طریق اور احوال و آثار میں قوت واستقامت (مضبوطی اور جماؤ) ظاہر وباہر ہے۔

حضرت شیخ دہلوی رح نے شیخ عبدالعزیز چشتی رح کے خلفاء کے تذکرہ میں یہ بیان دیا ہے اور اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ شیخ بدایونی رح حضرت شیخ محدث رح کے ہم عصر ہیں اور بعید نہیں کہ دونوں میں ملاقات بھی ہو گی، اپنے کسی معاصر کے کمالات اور وہ بھی باطنی حالات وکیفیات کا اعتراف کرنا خود مستقل دلیل کمال ہے۔ لہٰذا اس زریں بیان سے دونوں شیخ کا کمال ظاہر ہو کر رہا۔

مولانا رحمان علی صاحب رقمطراز ہیں کہ :-

شیخ عبدالغنی بدایونی رح عالم وصوفی تھے ترک دنیا میں اپنے وقت کے ابن ادہم رح اور تجرید میں شبلیِ روزگار تھے، شروع ایام میں بدایوں شریف میں تحصیل علم میں مصروف تھے کہ اُسی میں کیفیت طاری ہو جاتی اور نغمہ وغیرہ سنتے ہی بیہوش ہو جاتے تھے (بعد میں) بعض تعلقات کی بنا پر شیخ رح طلب معاش کیلئے دہلی گئے اور حال یہ تھا کہ جذبۂ طلب خدا کے ساتھ اہل وعیال بھی آپ کے ہمراہ تھے (شعر)

در راہِ خدا کہ رہزنانند　　　این رہزناں ہمیں زنانند

دہلی آکر حاکم تاتار خاں کی ملازمت میں منسلک ہو گئے، یہ شخص بظاہر صاحب حکومت تھا مگر حقیقت میں اہل اللہ میں تھا، جس کا اثر یہ ہوا کہ آپ شیخ عبدالعزیز دہلوی رح کے مرید ہو گئے اور تمام کتب متعارفہ ومروجہ (جو باقی رہ گئی تھیں) اُن کی خدمت میں پڑھیں، (بعد فراغت) مدتوں

---

[1] اخبار الاخیار ص ٢٨٢۔

درس تدریس کی خدمت انجام دی۔ اُسی دوران اُن پر اچانک اُس جذبہ کا غلبہ ہوا جو قدرت نے انھیں ازل سے ودیعت کیا تھا چنانچہ تمام مشاغل چھوڑ کر اپنے شیخ کی خانقاہ میں صاحبِ ریاضت درویشوں میں شامل ہو گئے اور ریاضت و مجاہدہ شروع کر دیا، تحصیل کمالِ (باطنی) کے بعد آبادی سے باہر ایک مسجد میں جو خان جہاں کی مسجد کے نام سے مشہور ہے رہنا شروع کر دیا، ہمیشہ اعتکاف میں رہتے تھے اگرچہ کنبہ دار آدمی تھے لیکن راہِ سلوک کو توکل کے ساتھ طے کرتے تھے جب ۱۰۰۳ھ میں خان خاناں آپ کی خدمت میں گیا اور کسی نصیحت کی درخواست کی تو فرمایا کہ:۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع کرو [۱]

(۲) شیخ جاپن میواتی رح (م ۹۹۵ھ)

شیخ جاپن میواتی رح قصبہ شہتہ کے رہنے والے تھے جو اٹھارہ [۱۸] کوس کے فاصلے پر میوات میں ایک قصبہ ہے، فاضل صوفی اور شیخ عبد العزیز دہلوی رح کے مشہور خلیفہ تھے، طریقۂ فقراء پر پوری طرح استقامت اختیار کئے ہوئے تھے، کتب تصوف مثلاً فصوص الحکم اور نقد الفصوص وغیرہ کا طلبہ اور مستفیدین کو درس دیتے تھے، جلال الدین اکبر بادشاہ کو آخر عمر میں آپ سے بہت اعتقاد پیدا ہو گیا تھا، یہاں تک کہ بعض مہمات میں آپ سے مدد کا طالب ہوتا اور شاہی محل میں ایک جگہ عبادت کیلئے آپ کے واسطے مقرر کر دی تھی اور راتوں کی تنہائیوں میں اکبر بادشاہ خدمتِ گرامی میں اکثر حاضر ہوتا۔

ایک مرتبہ بادشاہ نے شیخ جاپن میواتی رح کو نمازِ معکوس [۲] پڑھتے ہوئے دیکھا تو اس کے

---

[۱] تذکرہ علمائے سندھ ص ۱۲۵، ۱۲۶ [۲] صلوٰۃ معکوس ایک عمل ہے جو حضرات صوفیاء کرام رح ریاضت و مجاہدہ کے طور پر اختیار کرتے ہیں، حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی نور اللہ مرقدہ صلوٰۃ معکوس کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔ اس کو صلوٰۃ مجازاً کہہ دیا جاتا ہے اصل میں یہ ایک مجاہدہ ہے اور مجاہدہ ایک معالجہ ہے اور معالجہ کیلئے منقول و ماثور ہونا ضروری نہیں ہاں منہی عنہ (ممنوع) نہ ہونا ضروری ہے سو یہ منہی عنہ نہیں لیکن اس وقت امزجہ (مزاج و طبیعت) اس کے متحمل نہیں ہو سکتے لہذا مشائخ رح

(باقی صفحہ ۳٦٦)

خیالات اور عقیدت میں تبدیلی آگئی ،

مولوی رحمان علی صاحب بھی خوب سیرت نگار ہیں ، کیا ٹھیک لکھتے ہیں

بادشاہ چوں نماز معکوس از و مشاہدہ نمود نسبت معکوس شد [۱]

شیخ میواتی رح کو جب نماز معکوس پڑھتے ہوئے دیکھا تو اس کی نسبت معکوس ہو گئی - یعنی جو عقیدت

ونسبت شیخ سے تھی وہ اس طرزِ عمل کے بعد بدل گئی ، مولوی صاحب موصوف کے فارسی ادب پر توجہ کیجئے کہ "نمازِ معکوس" اور "نسبت معکوس"

(۳) **شیخ مسعود بن حسن بنارسی رح (م ۹۰۶ھ)** سرزمین بنارس کے مشہور بزرگ اور باکرامت ولی اللہ حضرت شاہ طیب فاروقی بنارسی رح (م ـــ ھ) کے خاندان سے آپ تعلق رکھتے ہیں ، وہ اس طرح ہے کہ شیخ مسعود بنارسی رح شاہ طیب بنارسی رح کے حقیقی بڑے والد ہوتے ہیں ، حضرت شاہ حسن فاروقی بنارسی رح (۲) شیخ معین الدین فاروقی بنارسی رح (۳) شیخ نصر الدین فاروقی بنارسی رح جس میں شیخ مسعود رح سب سے بڑے ہیں اور حضرت شاہ طیب بنارسی رح شیخ معین الدین رح کے صاحبزادے ہیں اس اعتبار سے شیخ مسعود رح شاہ طیب بنارسی رح کے بڑے والد ہوئے -

ابھی شیخ مسعود رح سن رشد کو نہ پہنچے تھے کہ شاہ حسن بنارسی رح والد گرامی کی شہادت کا واقعہ پیش آگیا - وہ اس طرح ہے کہ شاہ حسن بن داؤد بنارسی رح حج بیت اللہ کے لئے بنارس

صفحہ ۳۶۵ حاشیہ کا بقایا - نے اس کو ترک فرما دیا (امداد الفتاویٰ ص ۲۶۹ ج ۱) اس طرح سے ایک دوسرے مقام پر حضرت حکیم الامت رح نے ارقام فرمایا ہے کہ :- اگر صلاۃ معکوس کو صرف تدبیر کے درجہ میں سمجھا جائے اور تجربہ سے مفید بھی ہو تو کیا حرج ہے جیسا اطباء نے بعض مصالح بدنیہ کیلئے بعض ریاضات تجویز کی ہیں اہل طریق نے مصالح نفسانیہ کیلئے ایسی ریاضات تجویز کی ہیں لیکن جس کو تحمل نہ ہو اس کیلئے یہ جائز نہیں (السنۃ الجلیہ فی الچشتیۃ العلیہ ص ۱۹ مطبوعہ الہ آباد تالیف حکیم الامت رح) لہٰذا اس روشنی میں جن صوفیاء عظام رح اور روحانی معالجین نے ایسا کیا ہے اُن کی تکذیب ہرگز نہیں کی جا سکتی اور ساتھ ہی تعمیل پر اصرار بھی نہیں کیا جا سکتا ، غالبًا اکبر بادشاہ کی رسائی اس حقیقت تک نہیں ہو سکی اس لئے وہ اُس معکوس سے خود معکوس ہو گیا ، [۱] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۸ ،

سے روانہ ہوئے تو چوں کہ اُس دور میں سواریوں کا کوئی خاص نظم نہیں تھا اس لئے خشکی کی مسافت کو پاپیادہ طے کرکے دریا کے سفر کے لئے کشتی پر سوار ہوئے چند یوم تو کشتی امن و سلامتی کے ساتھ چلتی رہی مگر ایک دن اچانک بحری ڈاکوؤں نے کشتی پر حملہ کردیا شیخ حسن بنارسی رح نے نہایت جرأت و ہمت سے کام لے کر اُن کا مقابلہ کیا اور کئی ڈاکوؤں کو فنا کے گھاٹ بھی اُتارا لیکن اُسی ہنگامۂ جنگ و پیکار میں کسی نے آپ کے سینۂ مبارک پر نیزہ مارا جو پار کرگیا اور یہ عاشقِ جانباز جامِ شہادت نوش کرتا ہوا بیت اللہ کے بجائے رب البیت کے دربار دُربار میں حاضر ہوگیا اور بل ھم احیاء عند ربھم یرزقون کے مصداق ہوگئے، حضرت شاہ محمد یٰسین بنارسی رح کے بیان کے مطابق یہ واقعہ سنہ ۹۶۰ھ ماہ رجادی الاول کو پیش آیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ○ رحمۃ اللہ علیہ۔

لہٰذا شیخ مسعود بنارسی رح کو اپنے والد بزرگوار سے استفادہ کا موقع نہیں مل سکا، اور آپ شیخ فرید بن شیخ بدھ حقانی جون پوری رح کے حلقۂ درس میں شامل ہوکر جملہ علوم و فنون کی تحصیل کی اور انھیں سے بیعت بھی ہوئے لیکن شیخ فرید بنارسی رح نے تعلیم و تربیت مکمل کرکے حضرت شیخ عبدالعزیز جون پوری رح کی خدمتِ اقدس میں دہلی روانہ کردیا جہاں دو سال مسلسل رہ کر سلوک کی تکمیل کی اور خرقۂ خلافت سے شرف فرماکر شیخ عبدالعزیز رح نے آپ کو بنارس واپس فرمایا۔

شیخ مسعود رح نے بنارس آکر اپنے آباء و اجداد کے طرز و انداز پر درس و تدریس اور ارشاد و تلقین کے لئے اپنی پوری زندگی وقف فرمادی، شیخ مسعود رح نے اپنی دینی و روحانی سرگرمیوں کے لئے منڈواڈیہہ بنارس کو منتخب فرمایا جو آگے چل کر آپ کے برادر زادہ شاہ طیب فاروقی بنارسی رح کے طفیل رشد و ہدایت دعوت و تبلیغ کا ایک عظیم مرکز بنا، شیخ مسعود رح کا قیام تاحیات منڈواڈیہہ ہی میں رہا جہاں وہ طالبین کی اصلاح و تربیت کے ساتھ ذکر و فکر اور عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے تھے۔

بوقت وفات شاہ طیب بنارسی رح کو طلب فرمایا مگر اتفاق وقت سے وہ موجود نہیں

تھے تو بڑی حسرت دیا س سے فرمایا کہ :-

"بندہ کی خواہش تھی کہ جو کچھ بزرگوں سے ملا ہے وہ اس فرزند کے حوالہ کردوں"

اس کے چند گھنٹوں کے بعد رشد و ہدایت سعادت و لایت کا یہ جگمگاتا ہوا ماہتاب غروب ہوگیا

انا للہ وانا الیہ راجعون رحمۃ اللہ علیہ۔

منڈواڈیہہ میں بڑے روضہ کے احاطہ میں دفن ہوئے۔ تاریخ وفات اور تفصیلی حالات کا علم نہیں ہوسکا ۱؎

(۴) ملا عبدالقادر بدایونی رح (م ۱۰۰۴ھ) ملا عبدالقادر ابن ملوک شاہ، شہر بدایوں کے اکابر حضرات میں آپ کا شمار ہوتا ہے شیخ مبارک ناگوری رح (م ۱۰۰۱ھ) کے شاگرد رشید اور صاحب فضل و کمال تھے، تصوف کی بعض کتابیں اور (سلوک کے) رسالے ملا عبدالقادر رح نے حضرت شیخ عبدالعزیز چشتی رح سے پڑھے تھے۔

اکبر بادشاہ کی ملازمت میں شامل ہوئے محفلِ خلوت میں باریابی حاصل تھی اکثر ہندی کتابوں کے انتخاب اور ترجمے پر مامور ہوئے رامائن کا فارسی میں ترجمہ کیا اور تاریخ کشمیر کا انتخاب کیا (ملا بدایونی رح کو تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا، کتاب منتخب التواریخ جس کو

۱؎ مناقب العارفین فارسی قلمی مرتبہ شاہ محمد یٰسین بنارسی رح (م ۱۰۷۶ھ) خلیفہ حضرت شاہ طیب بنارسی رح (م ۱۰۴۲ھ) ملکیت کتب خانہ مظہر العلوم پیلی کوٹھی بنارسی ص ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، حضرت شاہ طیب فاروقی بنارسی رح کے زندگی کے حالات محمد ارشد اعظمی نے مرتب کیا ہے جو پہلے مضمون کی شکل میں ماہنامہ برہان دہلی اگست ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا بعد میں کتابی شکل میں بھی اشاعت ہوئی مطالعہ کے شائقین حضرات اس پتے پر طلب کرلیں، محمد ارشد اعظمی ابن جناب ڈاکٹر محمد ظفر صاحب اردلی بازار بنارس کینٹ۔ ہدیہ صرف ۵۰/۱، مناقب العارفین نامی قلمی مخطوطہ مضمون نگار کو مولانا مجیب الغفار صاحب مدرس مظہر العلوم کے معرفت دستیاب ہوا جس کیلئے دل سے اُن کا شکر گذار ہے۔ (م، ا، اعظمی)

تاریخ بدایونی بھی لکھتے ہیں اُن کے فضل و کمال کی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ نامہ خرد افزا کے نام سے کیا ہے جو قابلیت اور لیاقت کی علامت ہے [۱]

حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ نے اخبار الاخبار میں شیخ عبد العزیز چشتی رح کے ایک صاحبزادے کا تذکرہ کیا ہے جس میں لکھتے ہیں کہ :-

دا نجب اولا د شیخ قطب عالم ست عالم و فاضل و صاحب اخلاق حمیدہ و صفات پسندیدہ و قدم صدق و استقامت بر سجادۂ پدر نہادہ اوقات بطاعت و عبادت معمور دارد [۲]

یعنی شیخ قطب عالم رح شیخ عبد العزیز چشتی رح کی اولاد میں بہت شریف و سعادتمند ہیں۔ عالم و فاضل اور اخلاق حمیدہ و صفات پسندیدہ کے مالک ہیں۔ استقامت اور صدق کا قدم والد گرامی رح کے طرز و انداز (اور جانشینی) پر رکھے ہوئے ہیں اپنے اوقات کو عبادت خداوندی اور اطاعتِ الٰہی سے آباد کئے ہوئے ہیں۔

گویا شیخ قطب عالم رح اپنے والد مکرم حضرت شیخ عبد العزیز چشتی رح کے خلف و خلیفہ اور جانشین تھے اور بالکل شیخ چشتی رح کے نقشِ قدم پر تھے۔

---

[۱] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۳۰

عصر حاضر کے محقق تاریخ نگار و صاحبِ قلم جناب صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب نے "ملا عبد القادر بدایونی رح" پر بہت ہی مفصل اور پُر مغز مقالہ لکھا ہے جس میں ملا صاحب کی زندگی کے سارے گوشوں کو اجاگر کیا ہے اور یہ مقالہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ کے دو شمارہ اگست و ستمبر ۱۹۷۱ء میں شائع ہو چکا ہے لیکن تذکرہ نگار کو افسوس ہے کہ موصوف نے کہیں بھی شیخ عبد العزیز چشتی رح سے استفادہ کا تذکرہ ہی نہیں کیا ہے، ہو سکتا ہے کہ محترم مقالہ نگار کی توجہ اس طرف نہیں ہو سکی ہے۔ حالانکہ تذکرہ علمائے ہند میں ص ۱۲۲ پر صراحت کے ساتھ اس کا تذکرہ ہے۔

[۲] اخبار الاخبار ص

شاہ عبدالحی آخفر بنگلوری اور انکی علمی خدمات

از

(سید قدرت اللہ صدر شعبۂ اردو فاروق کالج کالیکٹ)

ریاست کرناٹک کے حدود اربعہ میں آندھرا پردیش ۔ تامل ناڈو ۔ مہاراشٹر اور کیرلہ کے بعض علاقے بھی شامل تھے حکومتوں کی تبدیلی کے ساتھ ریاست کرناٹک کے حدود میں بھی تبدیلی واقع ہوتی رہی ۔ ٹیپو سلطان شہیدؒ کے عہد میں ریاست کرناٹک سلطنت خداداد کے نام سے بہت ہی وسیع ہوگئی تھی ۔ سلطنت خداداد کی چہل سالہ حیات میں سیاسی، سماجی علمی اور مذہبی کارناموں کا جو ریکارڈ قائم ہوا ہے وہ تاریخ ہند کبھی فراموش نہیں کرسکتی سلطنت خداداد اور موجودہ ریاست کرناٹک کے بعض شہروں میں اسلامی تعلیمات پر جو کام ہوا ہے وہ بجائے خود ایک تحقیق طلب موضوع ہے ۔

سلطنت خداداد پر زوال آئے ایک سو اسی برس ہو گئے اس طویل مدت میں ریاست کرناٹک نے جو چند سال قبل ریاست میسور سے مشہور تھی ۔ متعدد علمائے کرام اور صوفیائے عظام کے علاوہ کئی علمی و ادبی شخصیتوں کو بھی جنم دیا ہے جنھوں نے تصنیف و تالیف میں نمایاں حصہ لیا ہے ۔ اور اسلامی علوم و فنون کا بازار گرم رہا ہے ۔ ایک طرف علمائے دین نے زبان و قلم کے ذریعہ زوال یافتہ قوم میں دین و مذہب کا احیاء کیا تو دوسری طرف اہل باطن صوفیوں نے عوام و خواص کے دلوں کو روحانی انوار سے روشن کیا ۔ بیسیوں مدرسے اور خانقاہیں قائم ہوئیں ۔ عرصۂ دراز سے میسور، بنگلور، سرا، ہاسن، گلبرگہ، بدر اور بیجاپور وغیرہ اسلامی علوم و فنون کے اہم مراکز رہے ہیں ۔

شہر بنگلور میں علامہ عبدالحی فرنگی محلی کے ہم نام اور ہم عصر ایک عظیم تر شخصیت گزری

ہے جس نے زبان وقلم کے ذریعہ دین کی عظیم الشان خدمت کی ہے۔

شاہ عبدالحی احقرؔ بنگلوری ایک ایسے گھرانے کے چشم وچراغ تھے جس میں حکومت اور منصب داری نسلاً بعد نسلٍ چلی آئی تھی۔ اس خاندان کے افراد انتظامی اور فوجی مناصب کے اعلیٰ عہدوں پر مامور تھے ان کے جدِ اعلیٰ مرزا رسول بیگ شاہجہاں آباد کے منصب دار تھے اور ان کے فرزند مرزا قاسم بیگ کو سلطنتِ مغلیہ کی جانب سے ریاست کرناٹک میں نلمنگل اور سنٹی کپہ کا ایک وسیع علاقہ بطور جاگیر عطا کیا گیا تھا۔ یہ جاگیر ان کے فرزند مرزا حیدر بیگ کے بھی قبضہ میں رہی۔

مرزا قادر علی بیگ بن حیدر بیگ اعظم پور کے عملدار تھے اور یہ شہر ابھی تک اجم پور کے نام سے بنگلور پونا ریلوے لائن پر واقع ہے۔ مرزا قادر علی بیگ کے فرزند مرزا حیدر علی بیگ نواب حیدر علی خاں کے عہد میں گلدڑن ڈرگ اور بدنور کے آصف تھے۔ آئینۂ حیدری والنساء صفدری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا حیدر علی بیگ بڑی شان وشوکت کے ساتھ اس منصب کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ان کے ہمشیرزاد بھائی مرزا ابراہیم بیگ صغرسنی میں یتیم ہو گئے تھے۔ مرزا حیدر علی بیگ جو لاولد تھے انھیں متبنّیٰ بنا لیا۔ اور بڑی شفقت سے ان کی تعلیم وتربیت کا انتظام کیا۔ مرزا ابراہیم بیگ طبعزاد ذہانت کے مالک تھے علم وادب سے فراغت کے ساتھ گھڑ سواری نیزہ بازی تیر اندازی اور شمشیر زنی میں بھی بڑا کمال حاصل کیا۔

مرزا حیدر علی بیگ نے اپنے دورِ آصفی میں اپنے ہنرمند متبنّیٰ مرزا ابراہیم بیگ کو تنزدبکرہ کا عملدار اور فوج کا رسالدار بنا دیا۔ اور ان کا نکاح شاہ یوسف کی دختر کے ساتھ کر دیا۔ جو سات گڈھ کے مشہور صوفی شاہ آدم کی اولاد سے تھے جن کا مزار آج بھی زیارت گاہ خاص وعام ہے۔

۱۲۱۳ھ میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد سلطنتِ خداداد کا تختہ اُلٹ گیا

سلطنت میں جو منصب دار بچ گئے تھے گوناگوں مصائب کا شکار ہو گئے۔ مرزا ابراہیم بیگ بھی اس ظلم وستم کی زد میں آ گئے۔ انگریزوں نے انہیں عملداری سے برطرف کر دیا۔ اور گھر کا کل سازو سامان ضبط کر لیا گیا۔ اور یہ لٹا ہوا خاندان بڑی بیکسی اور بے بسی کے عالم میں بنگلور ہجرت کر گیا اور اس واقعہ کے تقریباً بلیس سال بعد ۱۲۳۴ھ میں مرزا ابراہیم بیگ کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام بڈھن بیگ تھا جو بعد میں عبدالحی احقر بنگلوری کے نام سے مشہور ہوا۔

عبدالحی احقر کو بنگلور میں ہی متعدد علماء سے استفادہ کا موقعہ ملا۔ لڑکپن سے ہی آپ کا رجحان اسلامی تعلیمات کی طرف رہا۔ بڑے ذوق وشوق سے حصول علم میں مشغول رہے۔ اس دور کے بنگلوری علماء میں شاہ سید سجاد جلیل القدر مانے جاتے تھے۔ مولانا عبدالحی ان کے دامنِ تربیت سے وابستہ ہو گئے۔ شاہ سجاد اس ہونہار طالب علم کی فطری و اخلاقی خوبیوں سے بے حد متاثر تھے اور نہایت شفقت وہمدردی سے انہیں علم وعمل صالح سے آراستہ کیا۔ اور ان میں علم وادب کی صحیح چاشنی پیدا کی۔ اس دور کے عظیم ترین شخصیتوں کی علمی دینی اور فکری کاوشوں سے انہیں آگاہ کیا۔ شاہ عبدالحی کو وعظ وتبلیغ سے بے حد شوق تھا۔ ماہِ رمضان میں ہر روز بعد نماز عصر پانچ پانچ احادیث حفظ کر کے تشریحات مطالعہ فرماتے تھے اور بعد نماز تراویح مصلیان مسجد کو درسِ حدیث دیتے تھے۔ احادیثِ شریفہ کے اسرار و رموز کی گرہ کشائی کا طریقہ خداداد تھا۔ اندازِ تخاطب بھی اس قدر دلکش تھا کہ درس حدیث کے لئے جا بجا مدعو ہونے لگے۔ اور یہی سلسلۂ درس حدیث وعظ ونصیحت کا ڈیپ لیکر ان کی زندگی کا مقصد بن گیا صغر سنی سے ہی متدین ومتشرع رہا کرتے تھے۔ عوام و خواص دونوں ان کی وعظ وارشاد کی محفلوں میں جوق در جوق شریک ہوا کرتے تھے شہرت ان کے قدم چومنے لگی۔ مولوی عبدالحی کے بجائے مولانا واعظ بنگلوری کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ شاہ عبدالحی میں متانت وبردباری اور عجز وانکساری بلا کی تھی تدین وتقویٰ انکا شعار تھا۔ علمِ دین کے شیدا تھے ہر وقت انہیں اپنی تہی دامنی کا احساس ستاتا رہا۔ ان کے جذبۂ افادیت

پر استفادی جذبہ غالب آگیا۔

ویلور جو اس وقت علم و عرفان کا مرکز تھا جہاں شاہ عبد اللطیف بیجاپوری رح نے ۱۱۳۳ھ سے ہی دینی درس و تدریس کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا۔ علم دین اور معرفت الٰہی کا فیضان تقریباً ایک صدی سے جاری تھا اقطاب ویلور کی علمی و فکری کاوشوں سے پورا جنوبی ہند فیضیاب ہو رہا تھا اور وہ درس گاہ آج بھی قائم ہے جو دار العلوم لطیفیہ کہلاتا ہے جس کی بنیاد رکھے ڈھائی سو سال سے زیادہ مدت بیت گئی اور خاموش دینی خدمت کرتے آ رہا ہے۔

اس دار العلوم کی شہرت و عظمت سے شاہ عبد الحی بے حد متاثر تھے۔ لہٰذا اس دانشکدہ سے آپ نے خود کو وابستہ کر لیا۔ اور اس دار العلوم کے مختلف شیوخ سے استفادہ کرتے رہے اور خصوصاً سید شاہ محی الدین عبد اللطیف قادری الملقب بہ قطب ویلور سے خوب استفادہ کیا دینی علوم سے فارغ ہو کر تصوف و سلوک کے مراحل بھی قطب ویلور رح کی نگرانی میں طے کئے۔ وعظ و ارشاد اور فتوی کی اجازت حاصل کی۔ تصوف و سلوک کا خرقۂ خلافت پایا۔

چونکہ شاہ عبد الحی رشد و ہدایت کے طالب اور جویا تھے استفادہ کا جہاں موقع ملا غنیمت جانا۔ چنانچہ سید احمد شہید رح کے خلیفہ سید محمد علی رامپوری مدراس وارد ہوئے ان کی بیعت کا سلسلہ جاری تھا تو ان کے خلیفہ میر احمد علی دہلوی سے بھی آپ نے ۱۲۶۶ھ میں بیعت حاصل کی اور شاہ عبد العزیز کی تحریک کو ریاست کرناٹک میں عام کرنے کا سہرا آپ کے ہی سر تھا۔ مخالفین کی مخالفت کے پرخچے اڑا دیئے۔ مناظرہ اور مباحثہ میں کامیابی آپ کے قدم چومتی رہی۔ بعض متبدعین نے آپ کو اس سلسلہ میں وہابیت کا لقب بھی دیدیا تھا مگر آپ نے اس کی مطلق پروا نہ کی۔ دینی خدمت میں ۵۰ سال تک برابر لگے رہے ان کی عمر کا یہی وہ زریں دور ہے کہ جس میں ان کی بیسیوں تصنیفات و تالیفات وجود میں آئیں نعت گوئی کا بھی بے حد ذوق رکھتے تھے چنانچہ آپ کا ایک نعتیہ دیوان بھی موجود ہے اور اکثر تصانیف کے مقدمہ اور اختتام پر ایک ایک نعت بھی پائی جاتی ہے۔ شاہ صاحب کی شاید ہی کوئی نعت ہو جس میں آپ نے جوارِ رسول مقبول صلعم میں مدفون ہونے کی خواہش ظاہر

نہ کی ہو۔ خدائے قدوس اپنے برگزیدہ بندوں کی آرزو کو پوری کرہی دیتا ہے آخر ۱۳۱۰ھ میں حج بیت اللہ کے لئے نکلے حج سے فارغ ہوکر مدینہ منورہ تشریف لائے کسی بیماری کے بہانے داعی اجل کو لبیک کہا اور ۴ محرم ۱۳۱۱ھ کو جوار رسول میں مدفون و مغفور ہو گئے۔

شاہ عبدالحی خدا ترس آدمی تھے قرآن و حدیث کے شیدا تھے اصلاح معاشرت کا جذبہ فطری طور پر آپ میں موجود تھا زندگی بھر وعظ وارشاد کی محفلیں گرماتے رہے کفایت شعاری اور استغناء ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی خدا کے بھٹکے ہوئے بندوں کو راہ راست پر لگانے میں نہایت بے باک تھے۔ انداز تخاطب دلکش تھا محفل وعظ پر ساحرانہ کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وعظ وارشاد کا سلسلہ عشا کی نماز سے شروع ہوکر بعض اوقات صبح کی نماز پر ختم ہوا کرتا تھا سامعین تہجد کے بعد گناہوں پر استغفار کیا کرتے تھے اور اپنے گناہوں کے داغ صبح کی نماز تک آنسوؤں سے دھویا کرتے تھے۔ چوں کہ آپ صاحب قال و صاحب حال تھے سامعین پر بعض اوقات رقت طاری ہو جاتی تھی۔ اکثر اوقات غیر مسلم بھی آپ کی مجالس وعظ و نصیحت میں شریک ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوا کرتے تھے۔

شاہ عبدالحی اخگر بنگلوری نے دین کے اہم موضوعات پر سو سے زیادہ تصانیف چھوڑی ہیں دین کا شاید ہی کوئی اہم موضوع ہو جس پر آپ نے ایک مستند مدلل اور جامع کتاب پیش نہ کی ہو۔ یہ ان خوش نصیب مصنفین میں سے ہیں جن کی زندگی میں ہی اکثر کتابیں طبع ہوکر مقبول خاص و عام ہو گئی ہیں۔ ہیں راقم کے پاس شاہ عبدالحی بنگلوری کی چند کتابیں موجود ہیں جو میسور بنگلور مدراس بمبئی اور لاہور سے شائع ہو چکی ہیں۔ آپ نے تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد، سیرت و تاریخ، تصوف اور اسلامی معاشرت پر نہایت گیرائی و گہرائی کے ساتھ دینی لٹریچر ہمارے لئے چھوڑا ہے۔ چنانچہ آپ کی چند اہم تصنیفات یہ ہیں۔

جواہر التفسیر فی السیر والتذکیر۔ عجیب مگر دلکش تفسیر ہے جس میں قرآنی الفاظ کی ساحرانہ دلکشی کو کھول کر رکھ دیا ہے۔

فیض الباری ترجمہ تیسیر القاری شرح صحیح بخاری - یہ کتاب آٹھ ضخیم جلدوں میں ۱۲۹۶ھ سے پہلے شائع ہوچکی ہے راقم کا علم اگر صحیح ہے تو اردو میں فن حدیث اور خصوصاً بخاری اور اسکی شروحات میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے جو شاہ عبدالحی احقر بنگلوری کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے اس کتاب کے شروع میں فن حدیث کی اہمیت اور اس کے اصول پر نہایت واضح مقدمہ ہے جو شاہ عبدالحی بنگلوری کی دقت نظر اور وسعت مطالعہ پر دلالت کرتا ہے اس کتاب کے علاوہ حدیث میں ثلاثیات بخاری اور اربعینات بھی نظمائے گئے ہیں۔

جنات الشبیر فی احوال سید البشر۔ یہ کتاب تقریباً چوبیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے جو تقریباً سوا سو سال سے جنوبی ہند کے عوام و خواص میں رائج ہے ہر دوسرے یا تیسرے سال کرناٹک اور آندھرا سے شائع ہوکر ہزاروں کی تعداد میں فروخت ہورہی ہے اس کی شہرت کا یہ عالم ہے کہ یہ کتاب مصنف سے بھی زیادہ شہرت رکھتی ہے اور طباعت کا یہ عالم ہے کہ یہ بتانا مشکل ہے کہ آج بازار میں اس کا کونسا ایڈیشن چل رہا ہے۔ جن علماء نے اس کتاب کی بعض روایات پر شبہ کا اظہار کیا تھا مولانا بدر عالم کی کتاب ترجمان السنۃ دیکھنے کے بعد مولانا عبدالحی بنگلوری کے وسعت علم و فن پر حیرت کا اظہار کیا اور نہایت احترام کے ساتھ سراہا ہے۔

حدیقۃ الاحباب فی احوال الاصحاب: تقریباً ۵۰۰ طویل صفحات پر مشتمل ہے نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ خلفائے اربعہ کی حیات و خلافت پر ایک جامع کتاب ہے جس میں شاہ صاحب نے خلفائے ثلاثہ پر طعن و تشنیع کی روایتوں کو بے وقعت ثابت کیا ہے اور بے حد سنجیدگی سے تاریخی اختلافات کو رفع کیا ہے اس کتاب کے مقدمہ میں خلافت کی دینی اہمیت اور اور صداقت پر قرآن و حدیث کی روشنی میں ایک طویل بحث کی گئی ہے اور ساتھ ہی خلفائے اربعہ سے متعلق وارد شدہ آیات اور احادیث کو ایک جگہ جمع کیا گیا ہے۔

علامہ عبدالحی بنگلوری کو اسلامی تاریخ پر کافی مہارت تھی سیرت و سوانح پر جس قدر کتابیں آپ نے لکھی ہیں ان میں نہایت ژرف نگاہی سے کام لیا ہے۔ تاریخ و سیرت پر سلسلہ وار

کتابیں لکھی ہیں سیرۃ النبی پر جنان السیر اور گلزار اطہر سیرتِ صحابہ پر حدیقۃ الاحباب، حدیقۃ الابرار در فضائل آلِ اطہار۔ فلاحِ کونین در ذکر حسنین۔ تحفۂ مقبول در احوال بتول۔ سیرتِ محدثین و ائمہ کے سلسلہ میں چہار گلشن، روضۃ الابرار در احوال آئمۂ کبار۔ قلوب اصفیا ترجمہ تذکرۃ الاولیاء کے علاوہ تاریخ الخلفا للسیوطی کا بھی آپ نے ترجمہ کیا ہے۔

مناظرہ کے سلسلہ میں دلائل منیفہ در اثبات مذہب ابوحنیفہ۔ تحقیق الشفاعت رسالۂ مباحثہ۔ ید بیضا وغیرہ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اصلاحِ معاشرت و عقائد کے سلسلہ میں چھوٹی بڑی پچیس سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں جن میں چند کتابوں کے نام یہ ہیں حقوق المومنین حقوق الزوجین۔ تحفۂ بنات در رد بدعات۔ رد الملحدین۔ سعادتِ ابدیہ اور تنبیہ الغافلین وغیرہ کافی مشہور رہیں۔

جمعہ کے اردو خطبات کے جواز میں فتویٰ دیکر ایک کتاب خطبات حرمین شریفین کے نام سے پیش کیا ہے اس کتاب میں چند عربی خطبات کے منظوم ترجمہ کے علاوہ بارہ مہینوں سے متعلق عوام میں جاری شدہ رسوم کی تردید قرآن و حدیث کی روشنی میں صحیح راہ پر گامزن ہونے کے لئے بہت سے ترغیبی خطبات بھی موجود ہیں اور یہ کتاب جنوبی ہند کی اکثر مساجد میں تقریباً سو سال سے پڑھی جا رہی ہے۔

علامہ عبدالحی بنگلوری کی تصنیفات ایک سو سے زیادہ موجود ہیں جیساکہ ان کے فرزند مولانا عبدالقادر صوفی نے اپنی مختلف کتابوں میں ذکر کیا ہے۔ اور خود مولانا عبدالحی نے بھی جا بجا اپنی تصنیفات کے نام گنائے ہیں۔

تقریباً آٹھ سال سے راقم علامہ عبدالحی احقر بنگلوری کی حیات اور کارناموں پر تحقیق کر رہا ہے۔ اب تک تقریباً نوے کتب کے نام مل چکے ہیں۔ جن کا ذکر شاہ صاحب نے خود اپنی تصنیفات میں جا بجا کیا ہے۔ اس ناچیز کو موصوف کی تقریباً پچاس کتابیں دیکھنے کا موقعہ ملا ہے جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا

ہے کہ ریاست کرناٹک کا یہ ایک بے نظیر عالم اور مصنف گزرا ہے جس پر زمانے کی ستم ظریفی یہ ہے کہ اس جلیل القدر کثیر التصانیف بزرگ کو نہ تاریخ و ادب اردو میں جگہ ملی اور نہ تاریخ ثقافت اسلامی میں اس کا ذکر آیا ہے

بہر کیف علامہ عبد الحی بنگلوری عربی فارسی اور اردو میں کافی مہارت رکھتے تھے اسلامی لٹریچر میں بہت بلند مقام کے حامل تھے اکثر بلکہ کل کتابیں اردو میں لکھی گئی ہیں زبان صاف اور شیریں ہے نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتے تھے اپنی منظوم اور منثور تصانیف میں عربی و فارسی عبارتیں اور اشعار نہایت خوبی سے سجا دیتے ہیں فصاحت و بلاغت کے گل کھلانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا مگر وہ ابلاغ کو خاص اہمیت دیتے تھے ما فی الضمیر کو قاری کے ذہن پر نقش کرنا ان کا اولین مقصد تھا چنانچہ فرماتے ہیں ۔

در عربی و فارسی اے باصواب
لیک ہے ہندی میں بہت کم تو جان
اب جو ہے اس ملک میں ہندی زباں
ہے مجھے مقصود کہ سمجھے عوام ۔

شرع کی سیر میں ہیں بہت سی کتاب
اس لئے کم جانے سے جب ہندیاں
کرتا ہوں میں اسی زبان پر بیاں
شعر کی ہرگز نہ نزاکت سے کام

مولانا احقر بنگلوری کی تصانیف کے تمام نام ۔ عربی و فارسی مسجع عبارت میں ہیں اور ان کتابوں کی سرخیاں بھی مسجع واقع ہوئی ہیں ۔ قرآن و حدیث کی عبارتیں برجستہ استعمال کرنے کی عادت تھی ۔ تقریر و تحریر میں ان کی یہ عادت نمایاں ہے ۔ اظہار خیال میں استنباطی نقطۂ نظر ملحوظ رہتا ہے ۔ باقی آئندہ

دو مہینے امریکہ میں - ازمولانا محمد رابع حسنی ندوی، تقطیع متوسط ضخامت ۳۵۴ صفحات، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد -/15 پتہ : مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ، ندوۃ العلماء ، لکھنؤ -

امریکہ اور کناڈا کے مسلمان طلبا کی تنظیم ایم - ایس - اے کی دعوت پر مولانا سید ابوالحسن علی نے ۱۹۷۷ء میں امریکہ اور کناڈا کا سفر کیا تھا - اس سفر میں جو اواخر مئی سے اوائل اگست تک دو مہینے آٹھ روز کی مدت پر مشتمل ہے مولانا نے پہلے چار دن ایم - ایس - اے کی سالانہ کانفرنس میں شرکت کی جو نیویارک سے سات سو میل بجانب مغرب کے فاصلہ پر بلومنگٹن نامی ایک ٹاؤن کی انڈیانا اسٹیٹ یونیورسٹی میں ۲۷ سے ۳۰ مئی تک منعقد ہوئی اس سے فراغت کے بعد ایم - ایس اے کے دعوتی پروگرام کے مطابق بشمول کناڈا ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مشرقی ساحل سے لیکر مغربی ساحل تک چھ ہزار میل کا بست روزہ سفر کرکے کم وبیش دو درجن مقامات دیکھے اور تقریریں کیں اس سے فراغت ہوگئی تو مولانا نے فلاڈلفیا میں آنکھ کا آپریشن کرایا اور تقریباً ایک مہینہ اس کے دردبست میں لگا - اس سفر میں مولانا کے رفیق مولانا کے بھانجہ مولانا محمد رابع حسنی ندوی تھے - موصوف کو جغرافیہ اور تاریخ کا اعلیٰ ذوق ہے - پختہ قلم ادیب ہیں اس لئے انھوں نے سفر امریکہ کی یہ روئداد قلمبند کی تو اپنے ذاتی مشاہدات و محسوسات کے ساتھ امریکہ کی تاریخ اور اس کی تہذیب و تمدن پر متعدد کتابوں کا مطالعہ بھی کیا ' اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ

اس کتاب میں جہاں امریکہ وکناڈا میں مولانا سید ابوالحسن علی کی مصروفیتوں، ملاقاتوں اور تقریروں کا مفصل تذکرہ ہے ساتھ ہی امریکہ کے جغرافیائی تاریخی، سیاسی اقتصادی اور تہذیبی وتمدنی حالات کا معلومات افزا اور دیدہ درانہ بیان ہے، امریکہ میں ہندو پاکستان اور عرب ملکوں کے جو مسلمان آباد ہیں ان سے ربط وضبط اور ملاقات وگفتگو تو اس سفر کا خاص مقصد ہی تھا اس لئے ان کا اور ان کے دعوتی کاموں کا تذکرہ نمایاں طور پر کیا گیا ہے، بڑی بات یہ ہے کہ لائق مصنف نے جو کچھ لکھا ہے کمالِ بصیرت وبصارت کے ساتھ لکھا ہے۔ انہوں نے امریکن لائف کے چہرہ کی ایسی مکمل عکاسی کی ہے کہ اس کا حسن وقبح اور زیبا وزشت دونوں رُخ واضح طور پر سامنے آگئے ہیں، زبان وبیان شگفتہ اور رواں دواں ہے، اس میں شک نہیں کہ کتاب بیحد دلچسپ، معلومات افزا اور ساتھ ہی نہ صرف امریکہ بلکہ اسلامی اور عرب ممالک جن کے تفریح اور امریکن طریق زندگی کی پیروی کا ماتم مصنف موقع موقع سے کرتے گئے ہیں اور جو امریکہ میں مولانا علی میاں کی تقریروں کا خاص موضوع رہا ہے ان کے لئے بھی عبرت آفریں وسبق آموز ہے

الاسلام از مولانا وحید الدین خاں، تقطیع متوسط، ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ۱۵/ پتہ:۔ رسالہ بکڈپو، ۳۶۔ اکشن گنج دہلی۔

اس کتاب کے لکھنے کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ چونکہ عصرِ جدید سائنس کا دور ہے اس لئے ضروری ہے کہ اسلام کے عقائد واحکام کو جدید استدلالی انداز میں مرتب کیا جائے تاکہ وہ لوگوں کو آج کی چیزیں معلوم ہونے لگیں (ص ۱۳) اس مقصد کے پیشِ نظر پانچ مختلف ابواب میں دین کی حقیقت ارکانِ اربعہ، یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج، صراطِ مستقیم، اسوۂ نبوت، اور اسلامی تحریک۔ سیرت کی روشنی میں، کے زیرِ عنوان فاضل مصنف نے اپنے مخصوص کلامی انداز میں جو گفتگو کی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس میں اسلام کی نظری اور عملی بنیادی تعلیمات پر ایک جامع واضح اور یقین افروز کلام ہو گیا ہے، اس سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ دین کی اصل حقیقت اب کائنات کی کمال اخلاص وبے نفسی سے عبادت ہے اور عبادت کے معنی ہیں حقیقی عشق ومحبت کے ساتھ اطاعت

و فرمان برداری ارکانِ اربعہ کے ذریعہ یہ مقصد حاصل ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ ایک انسان کی جسمانی اور روحانی اعتبار سے تکمیل ہوتی ہے، قرآن و حدیث کی تعلیمات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی، یہ سب اس مقصد کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ اس طرح جب صالح افراد پیدا ہوتے ہیں تو ان سے ایک اجتماعیت پیدا ہوتی ہے جس میں فکر و عمل کے اعتبار سے یکسانیت اور باہمی تنظیم ہوتی ہے، اور یہی تنظیم قیادتِ اقوام و ملل کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ اس تنظیم کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ ان کا تجزیہ قرونِ اولیٰ کی اسلامی تاریخ کی روشنی میں کر کے بتایا گیا ہے کہ اسلامی تحریک کس طرح دنیا کی عظیم الشان انقلابی تحریک بنی اور وہ کس طرح عالم کے لئے سراپا خیر و برکت ثابت ہوئی، کتاب کا یہ حصہ واقعی بڑا بصیرت افروز بھی ہے اور فکر انگیز بھی، لیکن باقی ابواب میں تعارفِ مسئلہ، اور موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکیں" کے زیر عنوان جو کچھ لکھا گیا ہے، اگرچہ اس میں بھی بہت سی باتیں بڑے کام کی اور مسلمانوں کے لئے لائق غور و تفکر ہیں، لیکن افسوس یہ ہے کہ مصنف کی طبعی کمزوری یعنی اجلۂ علماء مصلحینِ امت کے کارناموں کی تحقیر و تنقیص، سے خالی نہیں ہے، چنانچہ کتاب کے شروع میں ہی خانقاہ مدرسہ اور جماعت کو ناوکِ تنقید کا ہدف بنایا گیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ مصنف کا فلسفیانہ طریقِ فکر ان کے تاریخی شعور پر غالب آ گیا ہے۔ صفحہ ۱۵ پر انہوں نے رسد گاہوں کی بنیاد پر تمام دنیا کے لئے ایک اسلامی کلنڈر کی تجویز پیش کی ہے، لیکن وہ یہ بھول گئے کہ خود سائنس کی رو سے عملاً یہ ناممکن ہے، کیونکہ اسلام میں اعتبار قمر جدید (New moon) کا نہیں، بلکہ اس کے قابل رویت (Visible) ہونے کا ہے، اور چونکہ قمر جدید بیس گھنٹوں کے بعد قابل رویت ہوتا ہے اس بنا پر ظاہر ہے مشرق و مغرب میں بعض ملک ایسے ہوں گے جن میں چاند کے قابل رویت ہونے میں ایک دن یا ایک رات کا فرق ہو جائے گا۔ اسی بنا پر قاضی شوکانی کی طرف جو یہ قول منسوب ہے کہ دنیا میں کہیں بھی اگر رویت ہو جائے تو وہ عالم کے سب مسلمانوں کے لئے معتبر ہوگی، ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے ـــــ علاوہ ازیں

کتاب میں غلطیاں بھی ہیں، مثلاً صفحہ ۱۵۳ پر لکھتے ہیں :- "آپ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) نے مدینہ کے قبائل (بنی نضیر، بنی قینقاع اور بنو قریظہ) کو خندق سے لوٹتے ہی گھیر لیا۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنو نضیر، بنی قینقاع اور بنو قریظہ کو غزوۂ خندق سے پہلے ہی جلاوطن کر چکے تھے۔ صفحہ ۱۶۵ پر لکھتے ہیں کہ اسلام برصغیر میں سیاست کی راہ سے پھیلا، حالانکہ کیرالا اور اس کے نواح میں اسلام کی تلوار سرے سے پہونچی ہی نہیں اور شمالی ہند میں جو اسلام پھیلا ہے وہ سیاست سے نہیں بلکہ صوفیائے کرام کی کوششوں سے پھر قلم کی بے اعتدالی سے بعض جگہ ایسے الفاظ یا جملے نکل گئے ہیں جو سخت قابل اعتراض ہیں۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں "قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے پیغمبر بھیجے سب ان قوموں کی "لسان" میں بھیجے گئے جن کے درمیان وہ آئے تھے، لسان قوم سے محدود طور پر صرف زبان مراد نہیں ہے، بلکہ اس میں اسلوب بیان بھی شامل ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس زمانہ میں اور جس قوم میں اسلام کی دعوت پیش کی جا رہی ہے، وہ اس کے علمی ذوق، اس کے طرز استدلال، اس کے طریق اظہار اور اس کے معیارِ فکر کے پوری طرح مطابق ہو (ص ۲۰۸) اس کے بعد مصنف کی یہ دوسری عبارت پڑھئے۔ لکھتے ہیں "انیسویں صدی میں یہ بات پوری طرح نمایاں ہو چکی تھی کہ مذہب کا روایتی ڈھانچہ اس جدید ڈھانچہ میں اپنی جگہ نہیں پا رہا ہے جو سائنس کے زیر اثر بنا ہے، اس وقت ضرورت تھی کہ گہرائی کے ساتھ صورتِ حال کا جائزہ لیکر نیا فکری ڈھانچا تیار کیا جائے جس میں اسلام دوبارہ اپنی جگہ پا سکے۔ (ص) اب یہ دونوں عبارتیں ایک ساتھ ملا کر پڑھئے تو کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ چونکہ قرآن ایک غیر سائنسی دور میں ایک امی قوم پر اس کی زبان میں نازل ہوا تھا جو قبائلی نظام میں جکڑی ہوئی تھی، اس بنا پر قرآن کا اسلوب اور طرزِ استدلال اس قوم کے معیارِ فکر کے مطابق تھا، لیکن چونکہ آج سائنس کا دور ہے اور انسان کا معیارِ فکر بدل گیا ہے، اس لئے آج نہ قرآن کا اسلوب کارآمد ہو سکتا ہے اور نہ اس کا طرزِ استدلال" والعیاذ باللہ۔

ان فروگذاشتوں سے قطع نظر کتاب قابلِ مطالعہ ہے۔

مکتوباتِ رئیس الاحرار (سیاسی)

مرتبہ جناب ابوسلمان صاحب شاہجہانپوری
تقطیع کلاں، ضخامت ۴۲۰ صفحات

کتابت وطباعت اور کاغذ اعلیٰ، قیمت مجلد -/۳۸ روپے۔ پتہ ماڈرن پبلشرز، ۸۶، گول امپریس مارکیٹ کراچی۔

یہ کتاب مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ کے ان انتالیس ۳۹ سیاسی خطوط کا مجموعہ ہے جو مولانا نے وقتاً فوقتاً اعلیٰ حکام برطانیہ، اپنے ساتھیوں اور رفقائے کار دوستوں عزیزوں اور بعض دوسرے لوگوں کو لکھے تھے۔ مولانا طولانی تحریر وتقریر کے لئے مشہور تھے، پھر اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ مولانا اپنے قلب ودماغ کے اوصاف وکمالات کے باعث ایک منفرد شخصیت کے حامل تھے، لیکن ان کی دو ۲ طبعی کمزوریوں سے انکار ممکن نہیں ہے۔ ایک ان کی شدید جذباتیت اور دوسرے تحریر وتقریر میں لب ولہجہ کا غیر محتاط ہونا، وہ جب کسی شخص یا جماعت کی مخالفت پر آمادہ ہوتے تو ان کی تنقید تضحیک واستہزا سے ہم آہنگ ہو جاتی تھی، اس مجموعہ میں پہلا خط وہ ہے جو ۱۹۰۹ء میں محمڈن کالج، علی گڈھ کے بعض معاملات کے متعلق نواب وقارالملک کو لکھا گیا تھا اور آخری خط وہ ہے جو مولانا نے ۱۹۳۰ء میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے موقع پر تحریر کیا تھا۔ اس بنا پر اکیس برس کی مدت میں مسلمانوں کے جو نہایت اہم تعلیمی، سیاسی، مذہبی اور تہذیبی وسماجی معاملات ومسائل پیش آئے ان خطوط میں ان سب پر مولانا کی رائے اور ان کے احساسات وجذبات کا عکس نظر آتا ہے۔ ساتھ ہی ان خطوط سے مولانا کی بعض مزاجی اور اخلاقی خصوصیات پر روشنی پڑتی ہے جو ایک شخصیت کا مطالعہ کرنے کے لئے بہت ضروری ہے، اس بنا پر تاریخی حیثیت سے یہ خطوط نہایت اہم ہیں۔ یہ خطوط ادھر اُدھر منتشر پڑے ہوئے تھے، فاضلِ مرتب جو علم وادب کی دنیا میں کوہ کنی کے لئے

۱۹۵۴ء — حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ العلم والعلماء۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت۔ تاریخ صقلیہ، تاریخ ملت جلد نہم

۱۹۵۵ء — اسلام کا زرعی نظام، تاریخ ادبیات ایران، تاریخ علم فقہ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند اول، تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

۱۹۵۶ء — ترجمان السنہ جلد ثالث۔ اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید اضافہ و ترتیب) جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد دوم، خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

۱۹۵۷ء — لغات القرآن جلد پنجم، صدیق اکبرؓ، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم، انقلاب روس، ابراہم لنکن کے بعد

۱۹۵۸ء — لغات القرآن جلد ششم، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، تاریخ گجرات، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

۱۹۵۹ء — حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، مصائب و رکوئین۔

۱۹۶۰ء — تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹-۳۰۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط، امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام۔

۱۹۶۱ء — تفسیر مظہری اردو جلد اول، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط، اسلامی کتب خانے عرب دنیا، تاریخ ہند پر نئی روشنی

۱۹۶۲ء — تفسیر مظہری اردو جلد دوم۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں، بصائر الآثار۔ نیل سے فرات تک۔

۱۹۶۳ء — تفسیر مظہری اردو جلد سوم، تاریخ ردہ، پیر کشی ضلع بجنور، علماء ہند کا شاندار ماضی اول

۱۹۶۴ء — تفسیر مظہری اردو جلد چہارم، حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط، عرب و ہند عہد رسالت میں، ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں۔

۱۹۶۵ء — ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول۔ تاریخی مقالات، لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر، ایشیا میں آخری نوآبادیات

۱۹۶۶ء — تفسیر مظہری اردو جلد پنجم۔ مور عشق۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں۔

۱۹۶۷ء — ترجمان السنہ جلد چہارم، تفسیر مظہری اردو جلد ششم، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی فقہ

۱۹۶۸ء — تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم، تین تذکرے۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، اسلامی ہند کی عظمت رفتہ۔

۱۹۶۹ء — تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم، تاریخ الفخری، حیات ذاکر حسین، دین الٰہی اور اس کا پس منظر

۱۹۷۰ء — حیات عبدالحئی، تفسیر مظہری اردو جلد نہم، تاثر و معارف، احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت

۱۹۷۱ء — تفسیر مظہری اردو جلد دہم، [illegible] اور اس کا روحانی علاج، خلافت راشدہ اور ہندوستان

۱۹۷۲ء — فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، انتخاب الترغیب والترہیب، اخبار التنزیل، عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

Regd. No. D. (D) 231 Phone 26 28 15 MAY 1979
R. N. 965—57
Subs. Rs. 15-00 Per Copy Rs. 2-00

حکیم مولوی محمد ظفر احمد خاں پرنٹر پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ سے شائع کیا۔